اہل قلم کی شوخیوں سے بھرپور طعن وطنز کی باتیں
جو آپ کے ہونٹوں پر فرحت بخش مسکراہٹ بکھیر دیں گی

شاعروں، ادیبوں کے لطیفے

شاہد حمید

BC

Shayron Adeebon Kay Lateefay
by Shahid Hameed
Jhelum: Book Corner. 2016
592p.
1. Urdu Literature - Tanz-o-Mazah
ISBN: 978-969-662-041-9

اشاعت: اپریل 2016ء

شاعروں، ادیبوں کے لطیفے

مرتبہ: شاہد حمید   سرورق: ابو امامہ

مطبع: زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور

Publisher:

Gagan Shahid & Amar Shahid

Book Corner

Printers, Publishers & Booksellers
Jhelum. Pakistan.
Phone # 0544-614977 / 0544-621953
Cell # 0323-5777931 / 0321-5440882
Email: bookcornershowroom@gmail.com

ناشر:

گگن شاہد، امر شاہد

بک کارنر

پرنٹرز، پبلشرز اینڈ بک سیلرز،
جہلم، پاکستان

www.bookcorner.com.pk

facebook

www.facebook.com/bookcornershowroom

مشتاق احمد یوسفی

کے نام

ہمیں فخر ہے کہ
"ہم مزاح کے عہدِ یوسفی میں جی رہے ہیں"

''اس نے علی بابا کو بتایا کہ اس کے دو بھائی ہیں ایک ادیب ہے
-----دوسرا بھی بے کار ہے۔''

(شفیق الرحمٰن)

فہرست

متفرق شاعروں اور ادیبوں کے لطائف

متفرقات

امیر خسرو

ولادت: ۹-۸-۱۲۰۸ء (۶۰۵ھ) (ایٹہ، یوپی)

وفات: ۹/ستمبر ۱۳۲۵ء (دہلی)

امیر خسرو اردو فارسی کے ایک باکمال شاعر گزرے ہیں۔ انہوں نے فارسی کے دامن پر اردو کے ایسے پھول بوٹے بنائے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ اس رباعی کو دیکھیے خوش مزاجی بھی ہے اور حسن ادائیگی بھی ہے۔

رفتم بہ تماشا بکنارے جوئے
دیدم بلب آب زن ہندوئے
گفتم صنما چیست بہائے موئے تو
فریاد بر آورد کہ در در موئے

''ایک دن میں سیر کے لیے دریا کے کنارے گیا۔ وہاں پر میں نے ایک ہندو عورت کو دیکھا، میں نے اس سے کہا! اے محبوبہ تیرے بالوں کی قیمت کیا ہے۔ اس نے چیخ کر کہا کہ ایک ایک بال کی قیمت ایک ایک موتی۔ لیکن اردو میں در در موئے گالی بھی ہے۔)

اسی طرح یہ غزل بھی ظرافت اور فصاحت کا مجموعہ ہے۔

خوار شدم زار شدم لٹ گیا
در غم ہجراں تو کمر ٹوٹے ہے
یار نہیں دیکھتا ہے سوئے من
بے گناہم ساتھ عجب روٹھے ہے

روئے تو رونق شکن آفتاب
سرو بہ پیش قدم تو بوٹے ہے
گاہ زخسرو تو نہ گفتہ کہ بیٹھ
وہ چہ کند بھاگ میرا پھوٹے ہے

حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ایک سیاح فقیر مہمان ہوئے۔ رات کو دسترخوان پر بیٹھے۔ کھانے کے بعد باتیں شروع ہوگئیں۔ سیاح نے ایسے دفتر کھولے کہ رات گئے تک ختم نہ ہوئے۔ حضرت جی نے کچھ انگڑائیاں کچھ جمائیاں لیں۔ وہ سادہ لوح کسی طرح بھی نہ سمجھا۔ حضرت جی مہمان کی دل شکنی کے خیال سے کچھ کہہ نہ سکے۔ مجبوراً بیٹھے رہے۔ امیر خسرو بھی موجود تھے۔ مگر حضرت کے احترام میں وہ بھی چپکے بیٹھے رہے۔ اتنے میں آدھی رات کی نوبت بجی۔ حضرت جی نے پوچھا! کیا بجا ہے؟ امیر خسرو بولے! آدھی رات کی نوبت بجی ہے۔ حضرت نے پھر پوچھا! اس میں سے کیا آواز آتی ہے۔ امیر خسرو ان کا مشورہ سمجھ کر بولے! سمجھ میں تو کچھ ایسا ہی آتا ہے کہ۔

نان بخوردی خانہ برد ۔ خانہ برد ۔ خانہ برد
نہ کہ بدست تو کردم خانہ گرد ۔ خانہ گرد ۔ خانہ گرد

''کھانا کھا لیا ہے اب گھر جایئے، گھر جایئے، گھر جایئے۔ میں نے آپ کے پاس اپنا گھر گروی نہیں رکھ دیا، گھر جایئے گھر جایئے اور حرف حرف کی چوٹ کو نوبت کے طریقہ پر ادا کیا۔''

امیر خسرو ایک دفعہ گھرات کے سفر پر گئے۔ وہاں ایک قشقہ لگائے ہندو لڑکے سے ملاقات ہوئی۔ ذیل کا قطعہ اسی ملاقات کی یادگار ہے۔

ایک ہندو بچہ ہیں کہ عجب حسن درھم ہے
بروقت سخن گفتن مکھ پھول جھڑے ہے
گفتم ز لب لعل تو یک بوسہ بگیرم
گفتا کہ ہرے رام ترا کاہے کرے ہے

''ایک ہندو لڑکا دیکھو کتنا حسین ہے۔ جب بولتا ہے منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ میں نے کہا میں تجھے پیار کروں۔ وہ کہنے لگا ہرے رام کیا کرنے لگے ہو۔''

مولانا عبدالرحمٰن جامی رحمہ اللہ

ولادت: ۷ رنومبر ۱۴۱۴ء (۸۱۷ھ) (جام، خراسان)

وفات: ۹ رنومبر ۱۴۹۲ء (۸۹۸ھ) (ہرات، افغانستان)

مولانا عبدالرحمٰن جامی رحمۃ اللہ مشہور فارسی شاعر اور صوفی بزرگ تھے اور عوام الناس کے ساتھ ساتھ صوفی منش لوگ بھی ان کی خدمت میں حاضری دیا کرتے تھے۔ایک دفعہ ایک مہمل گو شاعر جس کا حلیہ صوفیوں جیسا تھا، ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے سفرِ حجاز کی طویل داستان کے ساتھ ساتھ ان کو اپنے دیوان سے مہمل شعر بھی سنانے لگا اور پھر بولا:''میں نے خانہ کعبہ پہنچ کر برکت کے خیال سے اپنے دیوان کو حجرِ اسود پر ملا تھا۔'' یہ سن کر مولانا جامی رحمۃ اللہ مسکرائے اور فرمایا:'' حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ تم اپنے دیوان کو آبِ زم زم میں دھوتے۔''

ایک بار مولانا جامی کو کسی شاعر نے اپنی ایک غزل سنائی جو مہمل تھی۔لیکن اس میں یہ خصوصیت تھی کہ حرف الف کہیں نہیں تھا۔شاعر نے اس طرف مولانا کو متوجہ کیا تو انہوں نے اس طرح داد دی۔

شاعر خواند پر خلل غزلے کہیں بہ حذف الف بودہ موصوف
گفتمش نیست صفتے بہ ازاں کہ کئی خذف ازاں تمام حروف

''شاعر نے ایک ناقص غزل مجھے سنائی۔جس میں الف کہیں موجود نہیں تھا۔میں نے اس سے کہا اس کی سب سے بہتر اچھائی یہ ہوگی کہ اس میں سے تمام حروف حذف کر دو۔''

ایک شاعر نے مولانا جامی کو اپنی ایک غزل سنائی اور کہا، میں چاہتا ہوں اسے شہر کے دروازے پر لکھ کر لٹکا دوں تا کہ لوگ پڑھیں اور اس کی شہرت ہو۔مولانا نے فرمایا کہ ان لوگوں کو یہ کیسے معلوم ہوگا کہ یہ تمہاری غزل ہے۔اس لیے مناسب یہی ہے کہ تم بھی اس کے ساتھ لٹک جاؤ تا کہ لوگ غزل پڑھیں اور تمہیں داد دیتے ہوئے جائیں۔

مرزا محمد رفیع سودا

ولادت: ۱۷۱۳ء (دہلی)

وفات: ۲۶/جون ۱۷۸۱ء (لکھنؤ)

جب مرزا رفیع سودا کے کلام کا شہرہ عالم گیر ہوا تو شاہ عالم اپنا کلام اصلاح کے لیے دینے لگے اور فرمائش کرنے لگے۔ ایک دن کسی غزل کے لیے تقاضا کیا۔ انہوں نے عذر بیان کیا۔ حضور نے فرمایا، ''بھئی مرزا کی غزلیں روز کہہ لیتے ہو؟''

مرزا نے کہا: ''پیرو مرشد! جب طبیعت لگ جاتی ہے، دو چار شعر کہہ لیتا ہوں۔''

حضور نے فرمایا: ''ہم تو پاخانے میں بیٹھے بیٹھے چار غزلیں کہہ لیتے ہیں۔''

مرزا نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا: ''حضور! ویسی ہی بُو بھی آتی ہے۔'' یہ کہہ کر چلے آئے۔ بادشاہ نے پھر کئی دفعہ بلا بھیجا اور کہا: ''ہماری غزلیں بناؤ، ہم تمہیں ملک الشعرا کر دیں گے۔'' یہ نہ گئے اور کہا: ''حضور کی ملک الشعرائی سے کیا ہوتا ہے، کرے گا تو میرا کلام ملک الشعرائی کرے گا۔''

ایک دفعہ مرزا سودا نے ایک انگریز شاہی ملازم کو ہجو لکھی اور ایک محفل میں اس کے سامنے پڑھ دی۔ انگریز خاموش بیٹھا سنتا رہا۔ جب ہجو ختم ہوئی تو اٹھ کر سامنے آ بیٹھا اور ان کی کمر پکڑ کر گالیوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ مرزا کو ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا تھا۔ حیران ہو کر کہا! خیر باشد جناب آغا اس طرح کا عمل آپ کے شایان شان نہیں۔ انگریز نے اپنی کمر سے خنجر نکالا اور ان کے پیٹ پر رکھ کر کہا! تم نے نظم کہی ہے۔ نظم کہنی مجھے نہیں آتی۔ مجھے صرف نثر آتی ہے وہ بھی عملی نثر اب حوصلے سے اسے سنو۔

ایک دن لکھنؤ میں میر اور مرزا کے کلام پر دو شخصوں میں تکرار نے طول کھینچا۔ دونوں خواجہ باسط کے مرید تھے۔ انہی کے پاس گئے اور عرض کیا، ''آپ فرمائیں۔''
انہوں نے کہا: ''دونوں صاحب کمال ہیں، مگر فرق اتنا ہے کہ میر صاحب کا کلام 'آہ' ہے اور مرزا صاحب کا کلام 'واہ' ہے۔ مثال میں میر صاحب کا شعر پڑھا:

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

پھر مرزا کا شعر پڑھا:

سودا کی جو بالیں پہ گیا شورِ قیامت
خدام ادب بولے، ابھی آنکھ لگی ہے

ان میں سے ایک شخص، جو سودا کے طرف دار تھے، وہ مرزا کے پاس آئے اور سارا ماجرا بیان کیا۔ مرزا میرؔ کا شعر سن کر مسکرائے اور کہا: ''شعر تو میر صاحب کا ہے، مگر داد خواہی ان کی دادا کی معلوم ہوتی ہے۔''

فخر شعرائے ایران شیخ علی حزیں ہندوستان آئے اور پوچھا! شعرائے ہند میں آج کل کوئی صاحب کمال ہے؟ لوگوں نے سودا کا نام لیا۔ سودا نے سنا تو خود ملاقات کو گئے۔ شیخ کی نازک مزاجی اور عالی دماغی مشہور تھی۔ کہا کچھ اپنا کلام سناؤ۔ مرزا نے اپنا یہ شعر سنایا۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

شیخ نے پوچھا تڑپے کا معنی کیا ہے۔ سودا نے کہا! اہل ہند 'طپیدن' کو تڑپنا کہتے ہیں۔ شیخ دوبارہ شعر سنا اور زانو پر ہاتھ مار کر کہا! مرزا رفیع سودا۔ تم نے قیامت کر دی۔ ایک مرغ قبلہ نما زباقی تھا تو نے اسے بھی نہ چھوڑا۔ یہ کہہ کر کھڑے ہو گئے اور بغل گیر ہو کر ساتھ بٹھایا۔

شیخ قائم علی ساکن اٹاوہ ایک طبّاع شاعر تھے۔ کمال اشتیاق سے مقبول نبی خاں کے ساتھ بارادہ شاگردی سودا کے پاس آئے اور اپنے اشعار سنائے۔

آپ نے پوچھا:

''تخلص کیا ہے؟''

کہا:

''اُمیدوار!''

مسکرائے اور فرمایا:

ہے فیض سے کِسی کے شجر اُن کا باروار
اِس واسطے کیا ہے تخلُّص اُمیدوار

بے چارے شرمندہ ہو کر چلے گئے۔ قائمؔ تخلص اختیار کیا اور کسی اور کے شاگرد ہو گئے۔

جب عورت حاملہ ہوتی ہے۔ تو عورتوں کے محاورہ میں کہتے ہیں کہ اُمیدواری ہے یا پھر یہ کہ اللہ کی درگاہ سے اُمید ہے۔

سیّد انشاء کا عالم نوجوانی تھا۔ مشاعرہ میں غزل پڑھی:

جھڑکی سہی ادا سہی چینِ جبیں سہی
سَب کچھ سہی پر ایک نہیں کی نہیں سہی

جب یہ شعر پڑھا کہ

گر نازنیں کہے سے بُرا مانتے ہو تُم
میری طرف تو دیکھیے میں نازنیں سہی

سودا کا عالمِ پیری تھا۔ مشاعرہ میں موجود تھے۔
مُسکرا کر بولے:
''دریں چہ شک۔''

ایک دن سودا مشاعرہ میں بیٹھے تھے۔ لوگ اپنی غزلیں پڑھ رہے تھے۔ ایک شریف زادے کی ۱۲۔ ۱۳ برس کی عمر تھی۔ اُس نے غزل پڑھی۔
مطلع پڑھا:

دِل کے پھپھولے جل اُٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

گرمئ کلام پر سودا بھی چونک پڑے۔
پوچھا:
''یہ مطلع کِس نے پڑھا؟''
لوگوں نے لڑکے کی طرف اشارہ کیا:
''حضرت! یہ صاحبزادہ ہے۔''
سودا نے بھی بہت تعریف کی۔ کئی مرتبہ پڑھوایا اور کہا کہ
''میاں لڑکے جوان تو ہوتے نظر نہیں آتے۔''
خدا کی قدرت انہی دنوں میں لڑکا جل کر مر گیا۔

خواجہ میر درد کے ہاں ایک صحبت خاص ہوتی تھی۔ اس میں خواجہ صاحب نالۂ عندلیب یعنی اپنے والد کی تصنیفات اور اپنے کلام کچھ کچھ بیان کرتے تھے۔ ایک دن مرزا رفیع سودا سے سرِراہ مُلاقات ہوئی۔ خواجہ صاحب نے تشریف لانے کے لیے فرمائش کی۔

مرزاؔ نے کہا:

''صاحب مجھے یہ نہیں بھاتا کہ سو کوّے کائیں کائیں کریں اور بیچ میں
ایک پدّا بیٹھ کر چوں چوں کرے۔''

اس زمانہ کے بزرگ ایسے صاحب کمال لوگوں کی بات کا تحمل اور برداشت کرنا لازمۂ زندگی سمجھتے تھے۔آپ مُسکرا کر چپ ہو گئے۔

محمد میر سوزؔ

ولادت: ۱۷۲۱ء (دہلی)

وفات: ۱۷۹۸ء (لکھنؤ)

سوزؔ مرحوم پہلے میرؔ تخلص کیا کرتے تھے۔ جب میر تقی مرحوم میرؔ کے تخلّص سے عالمگیر ہوئے تو انہوں نے سوزؔ اختیار کیا۔ کسی شخص نے سوز سے آ کر کہا کہ

''حضرت! ایک شخص آپ کے تخلّص پر آج ہنستے تھے اور کہتے تھے کہ سوز گوز کیا تخلّص رکھا ہے۔ ہمیں پسند نہیں۔''

اُنہوں نے کہنے والے کا نام پوچھا۔ اس نے بعد بہت سے انکار اور اصرار کے بتایا معلوم ہوا کہ

''شخص موصوف بھی مشاعرہ میں ہمیشہ آتے ہیں۔''

میر سوزؔ مرحوم نے کہا:

''خیر کچھ مضائقہ نہیں۔ اب کے صحبتِ مشاعرہ میں تم مجھ سے برسرِ جلسہ یہی سوال کرنا۔''

چناں چہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور بآواز بلند پوچھا:

''حضرت! آپ کا تخلّص کیا ہے؟''

انہوں نے فرمایا کہ

''صاحب قبلہ فقیر نے تخلص تو میرؔ کیا تھا مگر وہ میر تقی صاحب نے پسند

فرمایا۔ فقیر نے خیال کیا کہ ان کے کمال کے سامنے میرا نام نہ روشن ہو سکے گا۔ ناچار سوزؔ تخلص کیا (شخص مذکور کی طرف اشارہ کر کے کہا) سُنتا ہوں یہ صاحب گوزؔ کرتے ہیں۔''

مشاعرہ میں عجیب قہقہہ اُڑا۔ لکھنؤ میں ہزاروں آدمی مشاعرہ میں جمع ہوتے تھے۔ سب کے کان تک آواز نہ گئی تھی۔ کئی کئی دفعہ کہوا کر سُنا۔ ادھر شخص موصوف اُدھر میر تقی صاحب دونوں چپ بیٹھے سُنا کیے۔

میر سوزؔ نے علاوہ شاعری کے شعر خوانی کا ایسا طریقہ ایجاد کیا تھا کہ جس سے کلام کا لُطف دو چند ہو جاتا تھا۔ شعر کو اس طرح ادا کرتے تھے کہ خود مضمون کی صورت بن جاتے تھے اور لوگ بھی نقل اُتارتے تھے۔ مگر وہ بات کہاں! آواز دردناک تھی۔ شعر نہایت نرمی اور سوز و گداز سے پڑھتے تھے اور اس میں اعضا سے بھی مدد لیتے تھے۔ مثلاً شمع کا مضمون باندھتے تو پڑھتے وقت ایک ہاتھ سے شمع اور دوسرے کی اوٹ سے وہیں فانوس تیار کر کے بتاتے۔ بے دماغی یا ناراضی کا مضمون ہوتا تو خود بھی تیوری چڑھا کر وہیں بگڑ جاتے اور تم بھی خیال کر کے دیکھ لو ان کے اشعار اپنے پڑھنے کے لیے ضرور حرکات و انداز کے طالب ہیں۔ چنانچہ یہ قطعہ بھی ایک خاص موقع پر ہُوا تھا اور عجیب انداز سے پڑھا گیا:

گئے گھر سے جو ہم اپنے سویرے
سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے
وہاں دیکھے کئی طفلِ پری رو
ارے رے رے ارے رے رے ارے رے

چوتھا مصرع پڑھتے پڑھتے وہیں زمیں پر گر پڑے۔ گویا پریزادوں کو دیکھتے ہی دل بے قابو ہو گیا اور ایسے نڈھال ہوئے کہ ارے ارے ارے کہتے کہتے غش کھا کر بے ہوش ہو گئے۔

ایک غزل میں قطعہ اس انداز سے سنایا تھا کہ سارے مشاعرہ کے لوگ گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے تھے:

او مار سیاہ زلف سچ کہہ
بتلا دے دِل جہاں چُھپا ہو
کنڈلی تلے دیکھ تو نہ ہووے
کاٹا نہ ہفی؟ ترا بُرا ہو

پہلے مصرع پر ڈرتے ڈرتے۔ بچ کر جھکے۔ گویا کنڈلی تلے دیکھنے کو جھکے ہیں اور جس وقت کہا۔ ''کاٹا نہ ہفی'' بس دفعتاً ہاتھ کو چھاتی تلے مسوس کر ایسے بے اختیار لوٹ گئے کہ لوگ گھبرا کر سنبھالنے کو کھڑے ہو گئے۔ (صحیح افعی ہے محاورہ میں ہفی کہتے ہیں۔)

میر تقی میر

ولادت: ۱۷۲۲ء (آگرہ)

وفات: ۲۰ ستمبر ۱۸۱۰ء (لکھنؤ)

مرزا محمد رفیع سودا سے میر تقی میر کی معاصرانہ چشمک رہتی تھی۔ ایک مرتبہ سودا نے کہا:

سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ
ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف

اس کے جواب میں میر صاحب نے لکھا:

طرف ہونا مرا مشکل ہے میرا اس شعر کے فن میں
یوں ہی سودا کبھی ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے

میر تقی میر کی عادت تھی کہ جب گھر سے باہر جاتے تو تمام دروازے کھلے چھوڑ دیتے تھے اور جب گھر واپس آتے تو تمام دروازے بند کر لیتے تھے۔ ایک دن کسی نے وجہ دریافت کی تو انہوں نے جواب دیا: ''میں ہی تو اس گھر کی واحد دولت ہوں۔''

میر تقی میرؔ عموماً پھبتیاں کسا کرتے تھے، جب انھوں نے تذکرہ ''نکات الشعرا'' لکھا تو ایک شاعر محمد یار متخلص بہ خاکسارؔ نے بھی ان کے جواب میں ایک تذکرہ لکھا۔ جس کا نام اپنے دوست محمد معشوق کنبوہ کے نام پر ''تذکرۂ معشوق'' رکھا، محمد معشوق کی عمر اس وقت چالیس برس کی تھی، میرؔ صاحب نے ان پر پھبتی کستے ہوئے کہا: ''معشوقِ چہل سالہ۔''

میر تقی میر سے لکھنؤ میں کسی نے پوچھا: ''کیوں حضرت آج کل شاعر کون کون ہے؟''
میر صاحب نے کہا: ''ایک تو سودا ہے اور دوسرا یہ خاکسار، اور پھر کچھ تامل سے بولے، آدھے خواجہ میر درد۔''

اس شخص نے کہا: ''حضرت، اور میر سوز؟''

میر صاحب نے چیں بہ چیں ہو کر کہا: ''میر سوز بھی شاعر ہیں؟''

اس نے کہا: ''آخر بادشاہ آصف الدولہ کے استاد ہیں۔''

کہا: ''خیر اگر یہ بات ہے تو پونے تین سہی۔''

ایک روایت ہے کہ ایک صاحب بہادر اردو سیکھ رہے تھے۔ ایک موقعہ پر انہوں نے میر کا یہ شعر سنا۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے　　　اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

تو وہ کہنے لگے! ہم سمجھا گیا۔ ہم، ٹم، میر، سب کو جیل خانہ جانا مانگتا۔

ایک مشاعرے میں میر تقی میر بھی موجود تھے۔ شیخ مصحفی نے غزل پڑھی:

تنہا نہ وہ ہاتھوں کی حنا لے گئی دل کو　　　مکھڑے کے چھپانے کی ادا لے گئی دل کو

جب یہ شعر پڑھا:

یاں لعل فسوں ساز نے باتوں میں لگایا　　　دے پیچ ادھر زلف اڑا لے گئی دل کو

تو میر صاحب قبلہ نے بھی فرمایا: ''بھئی! ذرا اس شعر کو پھر پڑھنا۔'' ان کا اتنا کہنا ہزار تعریفوں کے برابر تھا۔ شیخ موصوف اس قدر الفاظ کو فرمان آل تمغہ اپنے کمال کا سمجھے، بل کہ کئی دفعہ اٹھ اٹھ کر سلام کیے اور کہا: ''میں اس شعر پر اپنے دیوان میں ضرور لکھوں گا کہ حضرت نے دوبارہ پڑھوایا تھا۔''

سعادت یار خاں رنگینؔ۔ نواب طہماسپ بیگ خاں قلعہ دار شاہی کے بیٹے تھے۔ ۱۴/ ۱۵ برس کی عمر تھی۔ بڑی شان وشوکت سے گئے اور غزل اصلاح کے لیے میرؔ کی خدمت میں پیش کی۔ سُن کر کہا کہ "صاحبزادے! آپ خود امیر ہیں اور امیر زادے ہیں۔ تیزہ بازی، تیراندازی کی کثرت کیجیے۔ شہسواری کی مشق فرمایئے۔ شاعری دِلخراشی وجگر سوزی کا کام ہے۔ آپ اس کے درپے نہ ہوں۔" جب اُنہوں نے بہت اصرار کیا تو فرمایا کہ "آپ کی طبیعت اس فن کے مناسب نہیں۔ یہ آپ کو نہیں آنے کا۔ خواہ مخواہ میری اور اپنی اوقات ضائع کرنے کیا ضرورت ہے۔" یہی معاملہ شیخ ناسخؔ کے ساتھ گزرا۔

مِرزا محمد تقی خاں ترقی کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا اور تمام امرائے نامی وشعرائے گرامی جمع ہوتے تھے۔ میر تقی میر بھی آتے تھے۔ ایک دفعہ جرأتؔ نے غزل پڑھی اور غزل بھی وہ ہوئی کہ تعریفوں کے غُل سے شعر تک سنائی نہ دیئے۔ میاں جرأتؔ یا تو جوش سرور میں جو کہ اس حالت میں انسان کو سرشار کر دیتا ہے۔ یا شوخیِ مزاج سے میرؔ صاحب کے چھیڑنے کے اِرادہ سے ایک شاگرد کا ہاتھ پکڑ کے اُن کے پاس آ کر بیٹھے اور کہا کہ "حضرت! اگرچہ آپ کے، سامنے غزل پڑھنی بے ادبی اور بے حیائی ہے مگر خیر اس بے ہودہ گو نے جو یاوہ گوئی کی آپ نے سماعت فرمائی؟"

میر صاحب تیوری چڑھا کر چپکے ہو رہے۔ جرأتؔ نے پھر کہا۔ میرؔ صاحب کچھ ہوں ہاں کر کے پھر ٹال گئے۔ جب اُنہوں نے بہ تکرار کہا تو میرؔ صاحب نے جو الفاظ فرمائے وہ یہ تھے:

"کیفیت اس کی یہ ہے کہ تم شعر تو کہہ نہیں جانتے ہو اپنی چوما چاٹی کہہ لیا کرو۔"

انشاء اللہ خان انشاء

ولادت: دسمبر ۱۷۵۲ء (مرشد آباد، مغربی بنگال)

وفات: ۱۹رمئی ۱۸۱۷ء (لکھنؤ)

نواب سعادت علی خاں روزے سے تھے۔ شدید گرمی کی وجہ سے روزے نے ستایا ہوا تھا۔ پہرے دار کو حکم دیا کہ "کوئی ملاقاتی آرام میں مخل نہ ہو۔"

انشاء اللہ خان انشاء کو ایک ضروری کام آ پڑا۔ پہرے دار نے نواب صاحب کی برہمی بتلا دی تو انشا نے عورتوں کی طرح ڈوپٹہ اوڑھا، اُن کے سامنے گئے اور ناک پر انگلی رکھ کر بولے:

میں ترے صدقے نہ رکھ، اے میری پیاری! روزہ
بندی رکھ لے گی تیرے بدلے ہزاری روزہ

نواب صاحب اُن کا یہ نسوانی انداز دیکھ کر بے اختیار ہنس پڑے اور برہمی جاتی رہی۔

ایک روز شیخ قلندر بخش جرأت بیٹھے فکرِ سخن کر رہے تھے کہ انشاء آ گئے، انشاء نے پوچھا کہ کیا ہو رہا ہے؟

جرأت نے کہا کہ ایک مصرع ہو گیا ہے، دوسرے کی فکر میں ہوں۔ انشاء نے کہا کہ مجھے مصرع سنایئے۔ جرأت نے یہ کہہ کر انکار کیا کہ تم گرہ لگا کر شعر اچک لو گے۔ خیر انشاء نے بہت اصرار کیا تو اسے مصرع سنایا:

اُس زُلف پہ پھبتی کہ شبِ دیجُور کی سُوجھی

انشا نے جھٹ سے گرہ لگایا:

اُس زُلف پہ پھبتی کہ شبِ دیجُور کی سُوجھی
اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی

مزے کی بات یہ ہے کہ شیخ قلندر بخش جرأت اندھے تھے۔ جرأت ہنس پڑے اور لاٹھی اُٹھا کر انشاء کی طرف لپکے، دیر تک انشاء آگے اور جرأت پیچھے پیچھے ٹٹولتے ہوئے بھاگتے رہے۔

شیخ قلندر بخش جرات چیچک یا کسی حادثے سے نابینا ہو گئے تھے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ نابینا نہیں تھے۔ صرف عورتوں کی محفلوں میں شرکت کرنے کے لیے خود کو نابینا بنا لیا تھا لیکن آخری عمر میں سچ مچ نابینا ہو گئے۔ لکھنو میں فوت ہوئے۔

سعادت علی خاں جھولنے میں لیٹے ہوئے، میر انشاء اللہ خاں کی گود میں سر دھرا ہوا سُرور کے عالم میں دریا کی سیر کرتے چلے جاتے تھے۔ لب دریا ایک حویلی پر لکھا دیکھا:

''حویلی علی نقی بہادر کی۔''

کہا کہ

''انشاء دیکھو! کسی نے تاریخ کہی مگر نظم نہ کر سکا۔ بھئی تم نے دیکھا بہت خوب مادہ ہے اسے رُباعی کر دو۔''

اُسی وقت عرض کی:

نہ عربی نہ فارسی نہ تُرکی
نہ سُم کی نہ تال کی نہ سُر کی
یہ تاریخ کہی ہے کِسی لُر کی
حویلی علی نقی خاں بہادر کی

میاں بیتابؔ کا قول لکھ رکھنے کے قابل ہے کہ سید انشاء کے فضل و کمال کو شاعری نے کھویا اور شاعری کو سعادت علی خاں کی مصاحبت نے ڈبویا۔

انشاء ایک دن نواب صاحب کے ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے اور گرمی سے گھبرا کر دستار سر سے اُتار کر رکھ دی تھی۔ مُنڈا ہوا سر دیکھ کر نواب کی طبیعت میں چہل آئی۔ ہاتھ بڑھا کر پیچھا سے ایک دھول ماری۔ آپ نے جلدی سے ٹوپی سر پر رکھ لی اور کہا:

''سُبحان اللہ! بچپن میں بزرگ سمجھایا کرتے تھے۔ وہ بات سچ ہے کہ ننگے سر کھانا کھاتے ہیں تو شیطان دھولیں مارا کرتا ہے۔''

رات بہت گئی تھی اور ان شاء کے لطائف وظرائف کی آتش بازی چُھٹ رہی تھی۔ یہ رخصت چاہتے تھے اور موقع نہ پاتے تھے۔ نواب کے ایک مصاحب باہرےؔ کے رہنے والے اکثر اہل شہر کی باتوں پر طعن کیا کرتے تھے اور نواب صاحب سے کہا کرتے تھے کہ آپ خواہ مخواہ سیّد انشاء کے کمال کو بڑھاتے چڑھاتے ہیں۔ حقیقت میں وہ اِتنے نہیں۔ اُس وقت اُنہوں نے بقاؔ کا یہ مطلع نہایت تعریف کے ساتھ پڑھا:

دیکھ آئینہ جو کہتا ہے کہ اللہ رے میں
اس کا میں دیکھنے والا ہُوں بقاؔ واہ رے

سب نے تعریف کی۔ نواب نے بھی پسند فرمایا۔ اُنہوں نے کہا کہ

''حضور سید انشاء سے اس مطلع کو کہلوائیں۔''

نواب نے ان کی طرف دیکھا۔ مطلع حقیقت میں لاجواب تھا۔ اُنہوں نے بھی ذہن لڑایا۔ فکر نے کام نہ کیا۔ اُنہوں نے پھر تقاضا کیا۔ سید موصوف نے فوراً عرض کی کہ

''جناب عالی مطلع تو نہیں ہوا مگر شعر حسبِ حال ہو گیا ہے۔ حکم ہو تو عرض کروں۔

ایک ملکی کھڑا دروازہ پہ کہتا تھا رات
آپ تو بہتیرے جا پاڑہ رہے باہرے میں

شیخ امام بخش ناسخ

ولادت: ۱۰/اپریل ۱۷۷۲ء (فیض آباد، یوپی)

وفات: ۱۶/اگست ۱۸۳۸ء (لکھنؤ)

ایک دن کوئی صاحب ناسخ سے ملاقات کو آئے، ان کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ اتفاقاً پاؤں کے آگے ایک مٹی کا ڈھیلا پڑا تھا، شغل بیکاری سے تنگ آ کر آہستہ آہستہ چھڑی کی نوک سے توڑنے لگے۔ ناسخ نے دیکھا تو انہیں بے حد ناگوار گزرا، نوکر کو آواز دی اور فرمایا: ''میاں ایک ٹوکری مٹی کے ڈھیلوں کی بھر کر ان کے سامنے رکھدو، دل لگا کر شوق پورا کریں۔'' وہ صاحب شرمندہ ہو کر رہ گئے۔

ایک بار ایک شخص نے شیشے کے تین چمچے ناسخ کی خدمت میں پیش کیے، اتنے میں ایک امیر صاحبزادے آئے، چمچوں کو اٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے، تعریف کے بعد ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے، ساتھ ہی آپ چمچے سے کھیلنے لگے، شیشے کی بساط ہی کیا تھی، ٹھیس زیادہ لگی اور ٹوٹ گیا، ناسخ نے جھٹ دوسرا چمچہ اٹھا کر سامنے رکھ دیا اور کہا: ''اب اس سے شغل فرمایئے۔''

ایک مشاعرے میں ناسخ اس وقت پہنچے جب جلسہ ختم ہو چکا تھا۔ لیکن آتش موجود تھے۔ انہوں نے آتش سے پوچھا ''کیا مشاعرہ ہو چکا؟'' جواب ملا: ''جی ہاں، سب کو آپ کا

اشتیاق رہا۔" ناسخ نے اپنے نام امام بخش کی رعایت سے بلا تامل یہ شعر پڑھا ؎

جو خاص ہیں وہ شریک گروہ عام نہیں
شمار دانہ تسبیح میں امام نہیں

بچپن سے مرزا دبیر کا دل چونچال تھا۔ ابتدائے مشق میں کسی لفظ پر اُستاد کی اصلاح پسند نہ آئی۔ شیخ ناسخ زندہ تھے۔ مگر بوڑھے ہو گئے تھے۔ اُن کے پاس چلے گئے۔ وہ اُس وقت گھر کے صحن میں مونڈھے بچھائے جلسہ جمائے بیٹھے تھے۔

اُنہوں نے عرض کی کہ

"حضرت! اِس شعر میں مَیں نے تو یہ کہا ہے اور اُستاد نے یہ اصلاح دی ہے۔"

انہوں نے پھر کہا کہ

"حضرت! کتابوں میں تو اِس طرح آیا ہے۔"

اُنہوں نے کہا کہ

"نہیں جو تمہارے اُستاد نے بتایا ہے۔ وہی درست ہے۔"

انہوں نے پھر وہی عرض کی کہ

"حضرت! آپ کتاب کو ملاحظہ تو فرمائیں۔"

شیخ صاحب نے جھنجلا کر کہا:

"ارے تُو کتاب کو کیا جانے، ہمارے سامنے کتاب کا نام لیتا ہے۔ ہم کتابیں دیکھتے دیکھتے خود کتاب بن گئے ہیں۔"

ایسے غصے ہوئے کہ لکڑی سامنے رکھی تھی وہ لے کر اُٹھے، یہ بھاگے۔ انہیں بھی ایسا جوش تھا کہ دروازے تک ان کا تعاقب کیا۔

اُن (شیخ امام بخش ناسخ) کے مزاج میں منصفی اور حق شناسی کا اثر ضرور تھا، چنانچہ الٰہ آباد میں ایک دن مشاعرہ تھا۔ سبھی طرحی غزلیں کہہ کر لائے۔ شیخ صاحب نے جو غزل پڑھی، مطلع تھا:

دل اب محو ترسا ہوا چاہتا ہے
یہ کعبہ کلیسا ہوا چاہتا ہے

ایک لڑکے نے صف کے پیچھے سے سر نکالا۔ بھولی بھالی صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ معرکے میں غزل پڑھتے ہوئے ڈرتا ہے۔ لوگوں کی دل دہی نے اس کی طبیعت باندھی۔ پہلا ہی مطلع تھا:

دل اس بُت پہ شیدا ہوا چاہتا ہے
خدا جانے، اب کیا ہوا چاہتا ہے

محفل میں دھوم مچ گئی۔ شیخ ناسخ نے بھی تعریف کر کے لڑکے کا دل بڑھایا اور کہا کہ بھائی! یہ فیضانِ الٰہی ہے۔ اس میں استادی کا زور نہیں چلتا۔ تمہارا مطلع..... مطلعِ آفتاب ہے۔ میں اپنا پہلا مطلع غزل سے نکال دوں گا۔"

مرزا اسد اللہ خاں غالب

ولادت: ۲۷/دسمبر ۱۷۹۷ء (آگرہ)

وفات: ۱۵/فروری ۱۸۶۹ء (دہلی)

غدر 1857ء کے پُر آشوب زمانہ میں ایک روز مرزا غالب کے مکان میں کچھ گورے گھس آئے اور اُن کو، دو تین نوکروں اور چند ہمسایوں کو پکڑ کر کرنل براؤن کے رُوبرو پیش کر دیا۔ مرزا صاحب کے سر پر کلاہِ پیاخ تھی۔ کرنل صاحب نے اُن کی نئی وضع کی ٹوپی دیکھ کر پوچھا: ''ویل، ٹم مسلمان ہے؟''

مرزا صاحب نے جواب دیا: ''جناب آدھا مسلمان ہوں۔''

کرنل بولا: ''اس کا کیا مطلب؟''

مرزا صاحب بولے: ''جناب شراب پیتا ہوں، سؤر نہیں کھاتا۔''

یہ سن کر کرنل صاحب ہنس پڑے۔ پھر مرزا صاحب نے وزیر ہند کی شکریہ کی چٹھی جو ملکہ وکٹوریہ کے قصیدہ کے جواب میں آئی تھی کرنل صاحب کو دکھائی۔ کرنل صاحب نے پوچھا کہ تم سرکار کی فتح کے بعد پہاڑی پر کیوں نہ حاضر ہوئے؟

مرزا صاحب نے جواب دیا: ''میں چار کہاروں کا افسر تھا وہ چاروں مجھے چھوڑ کر بھاگ گئے۔ میں کیونکر حاضر ہوتا؟ کرنل صاحب نے اُن کو مع اُن کے ہمراہیوں کے نہایت مہربانی سے رُخصت کر دیا۔''

ایک بار مرزا غالبؔ نواب فتح الملک بہادر سے ملنے ان کے یہاں گئے تو خدمت گاروں نے صاحب عالم کو اطلاع دی: ''مرزا نوشہ صاحب آ رہے ہیں۔''

وہ کسی کام میں مشغول تھے، اس لیے فوراً باہر نہ جا سکے۔ جبکہ مرزا صاحب کچھ دیر وہیں ٹہلتے رہے۔ اتنے میں صاحب عالم نے پکار کر ملازم سے پوچھا: ''ارے مرزا صاحب

کہاں ہیں؟'' ان کی آواز جب غلام گردش میں ٹہلتے ہوئے مرزا صاحب کے کان میں آئی تو انہوں نے وہیں سے جواب دیا: ''غلام گردش میں ہے۔''

صاحب عالم ہنستے ہوئے نکل آئے اور انہیں ساتھ لے گئے۔

جب مرزا غالب قید سے چھوٹ کر آئے تو میاں کالے صاحب کے مکان میں آکر رہے تھے۔ایک روز میاں صاحب کے پاس بیٹھے تھے کہ کسی نے آکر قید سے چھوٹنے کی مبارکباد دی۔ مرزا صاحب نے کہا: ''کون بھڑوا قید سے چھوٹا ہے۔ پہلے گورے کی قید میں تھا۔اب کالے کی قید میں ہوں۔''

ایک دفعہ مرزا غالب گلی میں بیٹھے آم کھا رہے تھے، ان کے پاس ان کا ایک دوست بھی بیٹھا تھا جو کہ آم نہیں کھاتا تھا۔ اسی وقت وہاں سے ایک گدھے کا گزر ہوا تو غالب نے آم کے چھلکے گدھے کے آگے پھینک دیئے۔ گدھے نے چھلکوں کو سونگھا اور چلتا بنا تو غالب کے دوست نے سینہ پھلا کر کہا دیکھا مرزا، گدھے بھی آم نہیں کھاتے تو مرزا نے بڑے اطمینان سے کہا کہ جی ہاں دیکھ رہا ہوں گدھے آم نہیں کھاتے۔

مرزا غالب شطرنج کے بڑے شوقین تھے۔ مولانا فیض الحسن سہارنپوری دلی میں نئے نئے آئے تھے۔ غالب کو پتہ چلا کہ وہ بھی شطرنج کے اچھے کھلاڑی ہیں تو انہیں دعوت دی اور کھانے کے بعد شطرنج کی بساط بچھا دی۔ ادھر سے کچھ کوڑا کرکٹ ڈھونے والے گدھے گزرے تو مولانا نے کہا: ''دلی میں گدھے بہت ہیں۔''

مرزا غالب نے سر اٹھا کر دیکھا اور بولے: ''ہاں بھائی، باہر سے آجاتے ہیں۔''

مرزا غالب رمضان کے مہینے میں دہلی کے محلے قاسم جان کی ایک کوٹھری میں بیٹھے پچیسی کھیل رہے تھے۔ میرٹھ سے ان کے شاگرد مفتی شیفتہ دہلی آئے تو مرزا صاحب سے ملنے گلی قاسم جان آئے۔ انہوں نے دیکھا کہ رمضان کے متبرک مہینے میں مرزا پچیسی کھیل رہے تھے۔ انہوں نے اعتراض کیا: ''مرزا صاحب ہم نے سنا ہے کہ رمضان میں شیطان قید کر دیا جاتا ہے۔'' مرزا غالب نے جواب دیا: ''مفتی صاحب آپ نے ٹھیک سنا ہے۔ شیطان جہاں قید کیا جاتا ہے، وہ کوٹھری یہی ہے۔''

مرزا غالب دوستوں کی محفل میں بیٹھے تھے اور دہلی اور لکھنو کی اُردو میں فرق پر گفتگو جاری تھی کہ کسی نے مرزا غالب سے پوچھا گیا:

''حضور! ''میرا قلم'' صحیح ہے یا ''میری قلم؟''

مرزا غالب نے کہا:

''عورت لکھے تو ''میری قلم''، مرد لکھے تو ''میرا قلم''!

اسی طرح کسی نے پوچھا:

''جُوتا صحیح ہے یا جُوتی؟''

''بھائی مرزا تو یہی کہیں کہ عورت پہنے تو جُوتی اور مرد پہنے تو جُوتا۔'' ایک صاحب کہنے لگے۔

مرزا غالب نے جواب دیا:

''جی نہیں!! زور سے پڑے تو جُوتا، آہستہ پڑے تو جُوتی۔''

ایک محفل میں لوگ میر تقی میر کی تعریف کر رہے تھے۔ اس محفل میں مرزا غالب بھی موجود تھے۔ اچانک شیخ ابراہیم ذوق بھی آ گئے اور بحث میں حصہ لیتے ہوئے مرزا رفیع سودا کو میر تقی میر پر ترجیح دینے لگے۔

غالب نے یہ سنا تو بے ساختہ بولے:

''میں تو آپ کو میری سمجھتا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ آپ سودائی ہیں۔''

نواب یوسف علی خاں والئ رام پور کی طرف سے مرزا کا سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر تھا۔ جب نواب صاحب کا انتقال ہوا تو مرزا صاحب تعزیت کے لیے اُن کے جانشین کلب علی خاں کے پاس گئے۔ چند روز کے بعد نواب کلب علی خاں لیفٹیننٹ گورنر سے ملنے بریلی روانہ ہوئے اور چلتے وقت حسبِ معمول مرزا صاحب سے کہا:

''مرزا صاحب! الوداع، خدا کے سپرد''

مرزا غالب جھٹ بولے: ''حضرت! خدا نے تو مجھے آپ کے سپرد کیا تھا، اب آپ اُلٹا مجھے خدا کے سپرد کر رہے ہیں۔''

ایک نوعمر نے غالب کو ایک خط لکھا جس میں انہیں دادا کہہ کر مخاطب کیا۔ نوعمر نے اپنی دانست میں غالب کے ادب و احترام کو ملحوظِ خاطر رکھا تھا لیکن غالب نے اس نوعمر کو جوابی خط میں لکھا: ''میاں میں تمہارا دادا نہیں بلکہ دلدادہ ہوں۔''

مرزا غالب کے پاس اکثر گمنام خطوط گالیوں سے بھرے ہوئے آیا کرتے تھے جن میں ان کی شاعری پر اعتراض کیے جاتے تھے اور اس کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ ایک روز اسی

قسم کا ایک خط آیا جس میں ان کو ماں کی گالی دی گئی تھی، پڑھ کر کہنے لگے:

اس اُلو کو گالی دینی بھی نہیں آئی۔ بوڑھے یا ادھیڑ عمر آدمی کو بیٹی کی گالی دیتے ہیں تاکہ اس کو غیرت آئے۔ جوان کو جورو کی گالی دیتے ہیں کیونکہ اسے اپنی بیوی سے زیادہ تعلق ہوتا ہے۔ بچے کو ماں کی گالی دیتے ہیں کیونکہ وہ ماں کے برابر کسی سے مانوس نہیں ہوتا۔ یہ بے وقوف جو ۷۲ سال کے بوڑھے کو ماں کی گالی دیتا ہے اس سے زیادہ حماقت اور کیا ہوگی۔

ایک روز مرزا سے ملنے ان کے کچھ دوست آئے ہوئے تھے کہ دوپہر کے کھانے کا وقت ہوگیا۔ دستر خوان بچھا اور کھانا آ گیا، برتن تو بہت زیادہ تھے لیکن کھانا نہایت قلیل تھا۔ مرزا نے مسکرا کر اپنے دوستوں سے کہا:

''اگر برتنوں کی کثرت پر خیال کیجیے تو میرا دستر خوان یزید کا دستر خوان معلوم ہوتا ہے اور جو کھانے کی مقدار کو دیکھیے تو بایزید کا۔''

دہلی میں مرزا صاحب کے زمانے میں بعض لوگ رتھ کو مؤنث اور بعض مذکر بولتے تھے، کسی نے مرزا سے پوچھا کہ رتھ مؤنث ہے یا مذکر؟

مرزا صاحب نے جواب دیا:

''بھیا، جب رتھ میں عورتیں بیٹھی ہوں تو مؤنث کہو اور جب مرد بیٹھے ہوں تو مذکر سمجھو۔''

ایک دفعہ شہر میں سخت وبا پھیلی، میر مہدی مجروح نے پوچھ بھیجا کہ حضرت، وبا شہر سے دفع ہوئی یا ابھی تک موجود ہے۔

اس کے جواب میں لکھتے ہیں: ''بھئی کیسی وبا، جب ایک ستر برس کے بڈھے اور ایک ستر برس کی بڑھیا نہ مار سکے تو تُف بریں وبا۔''

ایک روز غالب نے اپنے شاگردوں کو ہدایت کی۔ جوں ہی میری روح جسدِ خاکی کو چھوڑے، تم بھاگ کر کہیں سے پرانا کفن لانا اور مجھے اس میں لپیٹ کر دفنا دینا۔

ایک شاگرد بولا: ''استادِ محترم، یہ تو بتایئے، اس سے آپ کو کیا فائدہ پہنچے گا۔''

غالب نے کہا: ''کم بخت اتنی سی بات بھی نہیں سمجھے کہ منکر نکیر تشریف لائیں گے تو پرانے کفن کو دیکھتے ہی سوال جواب کیے بغیر ہی لوٹ جائیں گے، کیونکہ پرانا کفن دیکھ کر وہ سمجھیں گے کہ اس جگہ غلطی سے دوبارہ آ گئے ہیں۔''

ایک خط میں برسات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''دیوان خانے کا حال محل سرا سے بدتر ہے، میں مرنے سے نہیں ڈرتا، فقدانِ رحمت سے گھبرا گیا ہوں، چھت چھلنی ہوگئی ہے، ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔''

سردیوں کے دن تھے، ایک نواب صاحب مرزا کے ہاں تشریف لائے، مرزا نے ایک گلاس شراب سے بھر کے ان کے آگے رکھ دیا۔

نواب صاحب بولے: ''میں توبہ کر چکا ہوں۔''

مرزا نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا: ''کیا جاڑے میں بھی؟''

مرزا کی پنشن بند ہوئی تو لوگوں نے احوال پرسی کے خطوں کا تانتا باندھ دیا، ایک بار میر مہدی مجروح نے اسی مضمون کا خط بھیجا تو جواب میں مرزا نے لکھا:

''میاں بے رزق جینے کا ڈھب مجھ کو آ گیا ہے، اس طرف سے خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا مہینہ روزے کھا کھا کر کاٹا، آگے خدا رازق ہے، کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔''

ایک دفعہ مرزا صاحب نے ایک دوست کو دسمبر 1858ء کی آخری تاریخوں میں خط لکھا۔ انہوں نے اس کا جواب جنوری 1859ء کی پہلی تاریخ کو دیا۔ اس کے جواب میں مرزا انہیں لکھتے ہیں:

''دیکھو صاحب، یہ باتیں ہم کو پسند نہیں، 1858ء کے خط کا جواب 1859ء میں بھیجتے ہو اور مزہ یہ کہ جب تم سے کہا جائے گا تو یہ کہو گے کہ میں نے تو دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے۔''

ایک روز دیوان فضل اللہ خاں بگھی میں سوار مرزا کے مکان کے پاس سے انہیں ملے بغیر گزر گئے، مرزا کو پتہ چلا تو انہوں نے اس مضمون کا رقعہ دیوان جی کو لکھ بھیجا:

''آج مجھ کو اس قدر ندامت ہوئی ہے کہ شرم کے مارے زمین میں گڑا جاتا ہوں، اس سے زیادہ اور کیا نالائقی ہوسکتی ہے کہ آپ کبھی کبھی تو اس طرف سے گزریں اور میں سلام کو حاضر نہ ہوں۔''

جب رقعہ دیوان جی کے پاس پہنچا تو وہ نہایت شرمندہ ہوا اور اسی وقت بگھی میں سوار ہوکر مرزا صاحب کو ملنے چلا آیا۔

مرزا نے شاہی دربار میں اپنی غزل سنائی اور جب مقطع پڑھا:

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

تو بہادر شاہ ظفر بولا: ''بھئی! ہم تو جب بھی ویسا نہ سمجھتے۔''

مرزا نے کہا: ''حضور تو اب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں، مگر یہ اس لئے ارشاد ہوا ہے کہ میں اپنی ولایت پر مغرور نہ ہو جاؤں۔''

ایک روز کسی سے کہنے لگے: ''کیوں صاحب، ہم تو مرد ہیں، ہمارا نماز پڑھنا ٹھیک ہے، ہم نماز پڑھتے ہیں تو اس لیے کہ حوریں ملیں، غلمان ملیں، یہ عورتیں آخر کیوں نماز پڑھتی ہیں؟ انہیں کس کی تلاش ہے؟''

غدر کے بعد مرزا کی پنشن بند تھی اور دربار میں شرکت کی اجازت نہ تھی، ایک روز پنڈت موتی لعل، میر منشی لیفٹیننٹ پنجاب مرزا سے ملنے آئے، پنشن کا ذکر چلا تو مرزا نے کہا:

''تمام عمر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر اور ایک دفعہ نماز پڑھی ہو تو گنہگار، پھر میں نہیں جانتا کہ سرکار نے کس طرح مجھے باغی مسلمانوں میں شمار کر لیا۔''

مرزا کے ایک شاگرد نے ان سے کہا:

''حضرت آج میں امیر خسرو کی قبر پر گیا تھا، مزار پر کھرنی کا درخت ہے، اس کی کھرنیاں میں نے خوب کھائیں، کھرنیوں کا کھانا تھا کہ فصاحت و بلاغت کا دروازہ کھل گیا، دیکھیے میں کیسا فصیح و بلیغ ہو گیا ہوں۔''

مرزا چہک کر بولے: ''ارے میاں تین کوس کیوں گئے؟ میرے پچھواڑے کے پیپل کی پیپلیاں کیوں نہ کھالیں، جو چودہ طبق روشن ہو جاتے۔''

ایک دفعہ بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں حضرت سلطان خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اور حضرت امیر خسروؒ کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ مرزا غالب نے اُسی وقت یہ شعر موزوں کر کے پڑھا:

ملے دو مرشدوں کو قدرتِ حق ہی ہیں دو طالب
نظام الدین کو خسرو، سراج الدین کو غالب

یہ سُن کر سب اہل دربار ہنس پڑے۔

ایک روز کسی صحبت میں مولانا صہبائی کا ذکر آیا، مرزا نے کہا:
''مولانا نے بھی کیا عجیب و غریب تخلص رکھا ہے، عمر بھر میں ایک چلو بھی نصیب نہیں ہوئی اور صہبائی تخلص رکھا ہے۔ سبحان اللہ، قربان جایئے اس اتقا کے اور صدقے جایئے اس تخلص کے۔''

جاڑے کے موسم میں ایک دن طوطے کا پنجرا سامنے رکھا تھا، طوطا سردی کے سبب پروں میں منہ چھپائے بیٹھا تھا، مرزا نے دیکھا تو کہا:
''میاں مٹھو! نہ تمہارے جورو، نہ بچے، تم کس فکر میں یوں سر جھکائے بیٹھے ہو۔''

مرزا نے حضرت صاحب عالم مارہروی سے ان کا سنِ ولادت دریافت کیا، انہوں نے کہا کہ میرا سالِ ولادت لفظ ''تاریخ'' سے نکلتا ہے جس کا عدد 1211 ہجری ہے۔ مرزا کی ولادت 1212 ہجری میں واقع ہوئی تھی، چنانچہ اس کے جواب میں مرزا نے یہ شعر لکھ بھیجا:

ہاتفِ غیب سُن کے یہ چیخا
ان کی تاریخ، میرا تاریخا

ایک دفعہ مرزا غالب رات کو پلنگ پر لیٹے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے، تاروں کی ظاہری بے ربطی اور انتشار دیکھ کر بولے: ''جو کام خود آرائی سے کیا جاتا ہے، اکثر بے ڈھنگا ہوتا ہے، ستاروں کو دیکھو کس ابتری سے بکھرے ہوئے ہیں، نہ تناسب ہے نہ انتظام، نہ بیل ہے نہ بوٹا، مگر بادشاہ خود مختار ہے، کوئی دم نہیں مار سکتا۔''

نواب علاؤ الدین کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

بدست مرگ ولے بدتر از گماں تو نیست

مکرر لکھ چکا ہوں کہ قصیدے کا مسودہ میں نے نہیں رکھا۔ مکرر لکھ چکا ہوں کہ مجھے یاد نہیں کہ کونسی رباعیاں مانگتے ہو، پھر لکھتے ہو، رباعیاں بھیج، قصیدہ بھیج، معنی اسکے یہ کہ تو جھوٹا ہے، اب کے تو مکرر بھیجے گا۔ بھائی قرآن کی قسم، انجیل کی قسم، توریت کی قسم، زبور کی قسم، ہنود کے چار وید کی قسم، دساتیر کی قسم، ژند کی قسم، اوِستا کی قسم، گرو کے گرنتھ کی قسم، نہ میرے پاس وہ قصیدہ، نہ مجھے وہ رباعیاں یاد، کلیات کے باب میں جو عرض کر چکا ہوں۔

برہمانیم کہ ہستیم و ہماں خواہد بُود

مرزا خانہ داری کو سخت مصیبت قرار دیتے تھے، کسی نے ان کے ایک شاگرد امراؤ سنگھ کی دوسری بیوی کے مرنے کا حال لکھا اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ اس کے ننھے ننھے بچے ہیں اب اگر تیسری شادی نہ کرے تو کیا کرے اور بچوں کی کس طرح پرورش ہو۔

مرزا اس کے جواب میں لکھتے ہیں: ''امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے، اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک ہی پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندہ گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندہ ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے، اس کو سمجھاؤ کہ بھائی تیرے بچوں کو میں پال لوں گا، تو کیوں پھر بلا میں پھنستا ہے۔''

ایک روز مرزا برآمدے میں بیٹھے شراب پی رہے تھے، بارش ہو رہی تھی، کسی نے کہا: ''بارش بہت ہوئی ہے۔''

مرزا نے جواب دیا: ''میں تو جب جانوں کہ پانی چبوترے کے اوپر آ جائے۔''

ساتھی نے عرض کی: ''حضرت اتنے میں تو تمام دلی ڈوب جائے گی۔''

مرزا نے ایک کتاب ''قاطع برہان'' لکھی، اس کا جواب اکثر مصنفوں نے دیا، ان میں سے بعض کے جواب مرزا نے بھی لکھے اور ان میں زیادہ تر شوخی اور ظرافت سے کام لیا لیکن مولوی امین الدین کی کتاب ''قاطع قاطع'' کا جواب مرزا نے کچھ نہیں دیا کیونکہ اس میں فحش اور ناشائستہ الفاظ کثرت سے لکھے تھے۔ کسی نے کہا: ''حضرت آپ نے اس کا کچھ جواب نہیں لکھا؟'' مرزا نے جواب دیا: ''اگر کوئی گدھا تمہارے لات مارے تو کیا تم بھی اس کے لات مارو گے؟''

آموں کا موسم تھا۔ بہادر شاہ ظفر چند مصاحبوں کے ہمراہ جن میں مرزا صاحب بھی تھے باغ حیات بخش یا مہتاب باغ میں گلگشت کر رہے تھے۔ آم کے درخت رنگ برنگ کے آموں سے لد رہے تھے۔ یہاں کے آم اعلیٰ درجے کے ہوتے تھے اور صرف بادشاہ اور بیگمات کے لیے مخصوص تھے یا دوسرے ملکوں کے بادشاہوں کو تحفہ کے طور بھیجے جاتے تھے۔ مرزا صاحب کو آمو بالطبع مرغوب تھے اور درختوں پر آموں کو بار بار غور سے دیکھتے تھے۔ بادشاہ نے پوچھا:

''مرزا! اس قدر غور سے کیا دیکھتے ہو؟''

مرزا نے دست بستہ عرض کیا:

''پیرومرشد! یہ جو کسی بزرگ نے کہا ہے:

برسرِ ہر دانہ نبوشتہ عیاں
کز فلاں ابن فلاں ابن فلاں''

''اس کو دیکھتا ہوں کہ کسی دانہ پر میرا اور میرے باپ دادا کا نام بھی لکھا ہے یا نہیں۔''

بادشاہ یہ سُن کر مسکرائے اور اُسی روز مرزا صاحب کو عمدہ عمدہ آموں کی ایک بہنگی بھجوائی۔

مرزا آموں سے کبھی سیر طبیعت نہ ہوتے تھے۔ اہلِ شہر تحفتہً بھیجتے، مرزا خود بازار سے منگواتے، باہر سے دور دور کا آم بطور سوغات آتا تھا مگر مرزا کا جی نہ بھرتا۔

ایک محفل میں مولانا فضل حق اور دیگر احباب بیٹھے آموں کی تعریف کر رہے تھے، جب سب لوگ اپنی اپنی رائے ہانک چکے تو مولانا فضل حق نے مرزا سے کہا کہ تم بھی اپنی رائے بیان کرو۔

مرزا نے کہا: ''بھئی، میرے نزدیک تو آم میں صرف دو باتیں ہونی چاہئیں، میٹھا

ہواور بہت ہو۔''

اس پر سب حاضرین کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

ایک دن جب کہ آفتاب غروب ہو رہا تھا، مرزا غالب سے ملنے سیّد سردار مرزا آئے۔ جب تھوڑی دیر کے بعد رخصت ہونے لگے تو مرزا خود اپنے ہاتھ میں شمعدان لے کر کھسکتے ہوئے لبِ فرش تک آئے تا کہ وہ روشنی میں جوتا دیکھ کر پہن لیں۔ انہوں نے کہا: ''آپ نے کیوں تکلیف فرمائی؟ میں اپنا جوتا خود ہی پہنچ لیتا ہوں۔''

اس پر مرزا بولے: ''حضرت! میں آپ کا جوتا دکھانے کو شمعدان نہیں لایا بلکہ اس لیے لایا ہوں کہ کہیں آپ میرا جوتا نہ پہن جائیں۔''

ایک دفعہ مرزا مکان بدلنا چاہتے تھے، ایک مکان خود دیکھ کر آئے، اس کا دیوان خانہ تو پسند آ گیا لیکن محل سرا خود نہ دیکھ سکے۔ گھر پر آ کر اس کے دیکھنے کے لیے بی بی کو بھیجا، وہ دیکھ کر آئیں تو ان سے پسند ناپسند کا حال پوچھا۔ انہوں نے کہا: ''اس میں تو لوگ بلا بتاتے ہیں۔''

مرزا نے چہک کر جواب دیا: ''کیا دنیا میں آپ سے بھی بڑھ کر کوئی بلا ہے؟''

مرزا کی بہن بیمار ہوئیں تو عیادت کو گئے، پوچھا: ''بُوا، کیا حال ہے؟''

بولیں: ''مرتی ہوں، قرض کی فکر ہے کہ گردن پر لئے جاتی ہوں۔''

آپ نے کہا: ''بُوا یہ کیا فکر ہے؟ خدا کے ہاں کیا مفتی صدر الدین بیٹھے ہیں جو ڈگری کر کے پکڑوا لیں گے۔''

ایک بار کسی بنئے کا بہت سا قرض مرزا کے سر چڑھ گیا، اسے جب روپیہ ملنے کی امید نہ رہی تو مجبوراً ڈگری کروا دی، بادشاہ کے دربار سے بلاوا آیا، مرزا خود تو نہ گئے البتہ حکم نامے کی پشت پر لکھ دیا:

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

بادشاہ نے یہ پڑھا تو مسکرائے اور ڈگری کا روپیہ خزانے سے جاری کروا دیا۔

ایک روز کا واقعہ ہے، مرزا غالب اور ان کی بیگم بعد از موت عاقبت اور مغفرت کے مسائل پر بحث کر رہے تھے، مرزا کی بیگم بولیں:

''روزہ رکھنا تو دور کی بات ہے آپ نے تو کبھی نماز بھی نہیں پڑھی اور عاقبت سنوارنے کے لئے کم از کم نماز روزہ کی پابندی کرنی ہی پڑتی ہے۔''

مرزا نے جواب دیا: ''آپ بلا شبہ درست فرما رہی ہیں لیکن یہ بھی دیکھ لینا کہ آپ سے ہمارا حشر اچھا ہی ہوگا۔''

بیگم بولیں: ''وہ کیونکر؟ کچھ ہمیں بھی تو بتائیے۔''

''بھئی بات تو بالکل سیدھی ہے۔'' مرزا نے کہا: ''آپ تو انہی نیلے تہبند والوں کے ساتھ ہوں گی جن کے تہبند کے پلو میں مسواک بندھی ہوگی، ہاتھ میں ایک ٹونٹی دار لوٹا ہوگا اور انہوں نے اپنے سر بھی منڈوا رکھے ہونگے۔ آپ کے برعکس ہمارا حشر یہ ہوگا کہ ہماری سنگت بڑے بڑے غیر فانی، شہرت یافتہ بادشاہوں کے ساتھ ہوگی۔ مثلاً ہم فرعون، نمرود اور شداد کے ساتھ ہوں گے۔ ہم اپنی مونچھوں کو بل دے کر اکڑتے ہوئے زمین پر قدم دھریں گے۔''

ایک مرتبہ زنان خانے میں جانے لگے تو دیکھا بیگم صاحبہ عین صحن میں مصلا بچھائے نماز پڑھ رہی ہیں، مرزا نے یہ دیکھا تو دروازے پر ٹھہر گئے جب وہ نماز پڑھ چکیں تو آپ نے جوتا اتار کر سر پر رکھا اور ننگے پاؤں آہستہ آہستہ ڈرتے ہچکچاتے ہوئے صحن تک آئے، بیگم نے یہ حالت دیکھی تو مسکرا کر کہنے لگیں:

''یہ کیا؟''

مرزا نے جواب دیا: ''کچھ نہیں صرف آپ کے مصلّے کی تعظیم وتکریم ہے۔''

بیگم نے تشریح چاہی تو کہا: ''اب تو سارا صحن مسجد ہو گیا، پھر اگر کوئی قدم رکھے تو کیونکر اور کرے تو کیا کرے، اس لئے جوتا اتار کر سر پر رکھ لیا ہے۔''

مرزا غالب کی آخری عمر میں موت کی آرزو بہت بڑھ گئی تھی، ہر سال اپنی تاریخِ وفات نکالتے اور یہ خیال کرتے کہ اس سال ضرور مر جاؤں گا۔اُن کا مشہور شعر ہے:

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

1277ھ میں انہوں نے اپنے مرنے کی تاریخ کہی ''غالب مُرد۔'' اس سے پہلے کے تمام مادے غلط ہو چکے تھے، منشی جواہر سنگھ جوہر سے مرزا نے اس مادے کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا: ''حضرت، انشاءاللہ یہ مادہ بھی غلط ثابت ہوگا۔''

مرزا نے کہا: ''دیکھو صاحب، تم ایسی فال منہ سے نہ نکالو، اگر یہ مادہ مطابق نہ نکلا تو میں سر پھوڑ کر مر جاؤں گا۔''

ایک مرتبہ جب ماہ رمضان گزر چکا تو بہادر شاہ بادشاہ نے مرزا صاحب سے پوچھا:
''مرزا، تم نے کتنے روزے رکھے؟''
غالب نے جواب دیا: ''پیر و مرشد، ایک نہیں رکھا۔''

''ایک روز مرزا صاحب کے شاگرد میر مہدی مجروح ان کے مکان پر آئے۔ دیکھا مرزا صاحب پلنگ پر پڑے کراہ رہے ہیں، میر مہدی ان کے پاؤں دابنے لگے۔
مرزا نے کہا: ''بھئی تُو سید زادہ ہے مجھے کیوں گنہگار کرتا ہے۔''
میر مہدی نہ مانے اور کہا:
''آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پاؤں دابنے کی اُجرت دے دیجئے گا۔''
مرزا صاحب نے کہا: ''ہاں اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔''
جب پاؤں داب چکے تو انہوں نے اجرت طلب کی۔
مرزا صاحب نے کہا:
''بھیا کیسی اجرت؟ تم نے میرے پاؤں دابے میں نے تمہارے پیسے دابے، حساب برابر ہوا۔''

مرزا کے تنگ دستی کے دنوں میں جب پنشن وغیرہ بند تھی اور پینے پلانے کا سامان مہیا نہیں تھا، اپنے ایک خط میں اپنی حالت کو یوں بیان کرتے ہیں:
''میر مہدی، صبح کا وقت ہے، جاڑا خوب پڑ رہا ہے، انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے، دو حرف لکھتا ہوں، ہاتھ تاپتا جاتا ہوں، آگ میں گرمی سہی مگر وہ آتشِ سے کہاں کہ جب دو جرعے پی لئے فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی، دل توانا ہوگیا، دماغ روشن ہوگیا۔ نفسِ ناطقہ کو تواجد بہم پہنچایا، ساقیٔ کوثر کا بندہ اور تشنہ لب؟ ہائے غضب، ہائے غضب۔''

ابراہیم ذوق بہادر شاہ ظفر کے استاد مقرر تھے غالب اور ذوق ایک دوسرے کے رقیب تھے ایک دن ابراہیم ذوق اپنے ٹولے کے ساتھ گزر رہا تھا کہ غالب نے مصرعہ اچھالا:

بنا ہے شہ کا مصاحب، پھرے ہے اتراتا

ابھی صرف یہ مصرعہ ہی اپنے رقیب کی شان میں عرض کیا تھا کہ بادشاہ کو خبر ہو گئ۔ دربار بلا کر پوچھا کہ آپ نے ہمارے استاد ابراہیم ذوق کی شان میں گستاخی کی ہے۔ عقلمند آدمی تھے، کہنے لگے حضور یہ تو میری ایک تازہ غزل کے مقطع کا پہلا مصرعہ آپ تک پہنچایا گیا ہے۔ بادشاہ نے پورا مقطع سنانے کا کہا تو غالب نے مقطع عرض کیا:

بنا ہے شہ کا مصاحب، پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

مقطع سن کر بادشاہ سمیت سب شعرا واہ واہ کر اٹھے اور پوری غزل سننے کی خواہش کی۔ غالب نے پوری غزل پیش کی غزل سن کر بادشاہ اور ذوق سمیت سب حاظرین غالب کی عظمت کے قائل ہو گئے۔

ایک دفعہ مرزا غالب نے رمضان کے مہینے میں اپنے روزہ دار ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے ایک دوست کو خط میں لکھا:

''دھوپ بہت تیز ہے۔ روزہ رکھتا ہوں مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا، کبھی حقہ پی لیا، کبھی کوئی روٹی کا ٹکڑا کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجب فہم رکھتے ہیں۔ میں تو روزہ بہلاتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تُو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور روزہ بہلانا اور بات ہے۔''

ایک دفعہ رمضان کے مہینے میں مرزا غالب نواب حسین مرزا کے ہاں گئے اور پان منگوا کر کھایا۔ مرزا اصفدر علی بھی موجود تھے۔ انہوں نے متعجب ہو کر پوچھا:

قبلہ آپ روزہ نہیں رکھتے؟

مرزا مسکرا کو بولے: ''شیطان...... غالب...... ہے۔''

ایک خط میں مرزا صاحب لکھتے ہیں:

''پنشن مل جائے حواس ٹھکانے ہو جائیں تو کچھ فکر کروں (یعنی فکرِ شعر کروں)

پیٹ پڑیں روٹیاں تو سبھی گلاں موٹیاں''

جب غدر میں دہلی لٹنے لگی تو مرزا صاحب کی بیگم نے اپنی قیمتی اشیاء اور زیورات زمین میں گاڑ دیئے۔ فتح مند سپاہیوں کو خبر ہو گئی اور انہوں نے سب کچھ کھود کر نکال لیا۔ مرزا صاحب کو تنگدستی نے آن گھیرا اور وہ بیچارے کپڑے بیچ بیچ کر گزارہ کرنے لگے۔

مرزا صاحب لکھتے ہیں کہ اس ناداری کے زمانہ میں جس قدر کپڑا اوڑھنا اور بچھونا گھر میں تھا، سب بیچ بیچ کر کھا گیا، گویا اور لوگ روٹی کھاتے تھے اور میں کپڑا کھاتا تھا۔

ایک روز مرزا صاحب نواب مصطفی خاں کے مکان پر گئے۔ مکان کے آگے تاریک چھتّہ تھا۔ چھتے سے گزر کر دیوان خانہ کے دروازہ پر پہنچے جہاں نواب صاحب استقبال کے لیے کھڑے تھے۔

مرزا صاحب نے فرمایا:

آبِ حیواں در دِنِ تاریکی ست

جب دیوان خانہ میں داخل ہوئے تو اُس کے دالان میں بسبب شرق رویہ ہونے کے دھوپ بھری ہوئی تھی۔ مرزا صاحب نے کہا:

''ایں خانہ تمام آفتاب است''

ایک روز دوپہر کا کھانا دسترخوان پر چُنا گیا۔ برتن تو بہت سے تھے مگر کھانا نہایت قلیل تھا۔ مرزا صاحب نے مسکرا کر فرمایا: ''اگر برتنوں کی کثرت پر خیال کیجیے تو میرا دسترخوان یزید کا دسترخوان معلوم ہوتا ہے اور جو کھانے کی مقدار کو دیکھیے تو بایزید کا۔''

ایک دفعہ ایک شخص نے مرزا صاحب کے سامنے شراب کی بُرائیاں بیان کیں اور کہا کہ شرابی کی دُعا قبول نہیں ہوتی۔

مرزا صاحب بولے:

''بھائی! جس کو شراب میسر ہو اس کو اور کیا چاہیے جس کے لیے دُعا مانگے؟''

ایک دفعہ بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے مرزا صاحب سے پوچھا:

''مرزا! تم روزہ کیوں نہیں رکھتے؟''

مرزا صاحب نے عرض کیا:

''پیرومرشد! جب کچھ کھانے کو نہیں ملتا تو روزہ ہی کھا لیتا ہوں۔''

بادشاہ یہ سُن کر ہنس پڑے۔

لکھنؤ کی ایک مجلس میں دہلی اور لکھنؤ کی زبان پر بحث ہو رہی تھی۔ مرزا غالب بھی وہاں موجود تھے۔ کسی نے اُن سے کہا کہ جس موقع پر اہل دہلی ''اپنے تیئں'' بولتے ہیں وہاں اہل لکھنؤ ''آپ کو'' بولتے ہیں۔ آپ کی رائے میں فصیح ''آپ کو'' ہے یا ''اپنے تیئں''؟

مرزا صاحب فرمانے لگے: ''فصیح تو یہی معلوم ہوتا ہے جو آپ بولتے ہیں۔ مگر اس میں دقّت یہ ہے کہ مثلاً آپ میری نسبت یہ فرمائیں کہ میں آپ کو فرشتہ خصال جانتا ہوں اور میں اس کے جواب میں اپنی نسبت عرض کروں کہ میں تو آپ کو کتّے سے بھی بدتر سمجھتا ہوں تو سخت مشکل ہوگی۔ میں تو اپنی نسبت کہوں گا اور آپ ممکن ہے کہ اپنی نسبت سمجھ جائیں۔''

یہ لطیفہ سن کر سب سامعین پھڑک گئے۔

ایک دفعہ حسین علی خاں کے چھوٹے لڑکے نے مرزا صاحب سے کہا: ''دادا جان مٹھائی منگا دو۔'' مرزا صاحب نے کہا: ''پیسے نہیں ہیں۔'' اُس نے مرزا صاحب کا صندوقچہ کھولا اور پیسے ڈھونڈنے لگا۔ مرزا صاحب نے فوراً کہا:

درہم و دام اپنے پاس کہاں؟
چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں؟

ایک دفعہ ایک صاحب جن کی وضع سے معلوم ہوتا تھا کہ نہایت متقی اور پرہیزگار شخص ہیں، مرزا صاحب سے ملنے آئے۔ مرزا صاحب نے اُن کی بڑی خاطر مدارت کی۔ سامنے میز پر گلاس اور شراب کا شیشہ رکھا تھا۔ انہوں نے شربت کا شیشہ سمجھ کر اسے اُٹھا لیا۔ پاس سے کوئی شخص بولا کہ جناب یہ شراب ہے۔ انہوں نے جھٹ اُس کو میز پر رکھ دیا اور کہا

کہ میں نے تو شربت کے دھوکے میں اُٹھایا تھا۔ مرزا صاحب مسکرا کر بولے:

''زہے نصیب! دھوکے دھوکے میں نجات ہو گئی۔''

ایک دفعہ فرخ مرزا نے مرزا غالب سے پوچھا کہ حضرت ''بسمل'' کے کیا معنی ہیں؟ اس وقت مرزا صاحب ایک گاؤ تکیہ پر سر رکھے اور ٹانگیں اکٹھی کیے ہوئے کسی قدر اوندھے لیٹے تھے۔ کہنے لگے ''جس حالت میں اس وقت میں ہوں، سمجھ لو کہ اس حالت والے کو بسمل کہتے ہیں۔''

ایک دفعہ مرزا صاحب نے مسہل لیا۔ معالج نے مسہل کے دنوں میں چلنے پھرنے سے منع کیا۔ چنانچہ مرزا صاحب کئی روز تک گھر ہی میں لیٹے رہے۔ جب مسہل کے دن ختم ہوئے تو دربار شاہی میں حاضر ہو کر اتنے روز کی غیر حاضری کے عذر میں یہ قطعہ پڑھا:

سہل تھا مسہل و لے یہ سخت مشکل آ پڑی
مجھ پہ کیا گزرے گی اتنے روز حاضر بن ہوئے
تین دن مسہل سے پہلے تین دن مسہل کے بعد
تین مسہل تین تبریدیں یہ سب کے دن ہوئے؟

ایک مرتبہ کسی شخص نے مرزا صاحب کو عمدہ عمدہ آموں کا ٹوکرا تحفہ کے طور پر بھیجا۔ مرزا صاحب نے ٹوکرے کو کھول کر دیکھا تو فرمایا: ''لطفِ خاص نہیں فیضِ عام ہے، شراب نہیں آم ہے۔''

ایک دفعہ مرزا غالب نے اپنے ایک دوست کو اپنے گھر بلایا لیکن خود بھول گئے اور کسی کام کے سلسلے میں کہیں چلے گئے۔ مرزا غالب کا دوست کچھ دیر تک ان کا انتظار کرتا رہا، جب وہ نہ آئے تو دروازے پہ ''گدھا'' لکھ کر چلا گیا۔
اگلے دن وہ مرزا سے ملا اور کہا، ''میں کل آپ کے گھر آیا تھا'' تو مرزا بولے، ''ہاں میں نے دروازے پر تمہارے دستخط دیکھے تھے۔''

مرزا غالب نے اپنی طبیعت کی شوخی اور ظرافت سے کام لے کر اپنے خطوں میں بھی بذلہ سنجی اور شگفتگی کے گلزار کھلائے ہیں۔ لکھتے ہیں:
''میاں تمہارے دادا، امین الدین خان بہادر ہیں، میں تو تمہارا دلدادہ ہوں۔''

مرزا غالب سے کسی نے پوچھا: ''حضرت یہ بچھو ہیں، یہ گرمیوں میں تو بہت نظر آتے ہیں مگر سردیوں میں دکھائی نہیں دیتے، اس کی کیا وجہ ہے؟
مرزا نے جواب دیا: ''جناب، ان کی گرمیوں میں ہی کون سی پذیرائی ہوتی ہے کہ یہ سردیوں میں بھی دکھائی دیں۔''

مرزا غالب کے پاس اکثر گمنام خطوط گالیوں سے بھرے ہوئے آیا کرتے تھے جن میں ان کی شاعری پر اعتراض کیے جاتے تھے اور اس کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ ایک روز اسی قسم کا ایک خط آیا جس میں ان کو ماں کی گالی دی گئی تھی، پڑھ کر کہنے لگے: ''اس الو کو گالی دینی بھی نہیں آئی۔ بوڑھے یا ادھیڑ عمر آدمی کو بیٹی کی گالی دیتے ہیں تاکہ اس کو غیرت آئے۔ جوان کو جورو کی گالی دیتے ہیں کیونکہ اسے اپنی بیوی سے زیادہ تعلق ہوتا ہے۔ بچے کو ماں

کی گالی دیتے ہیں کیونکہ وہ ماں کے برابر کسی سے مانوس نہیں ہوتا۔ یہ بیوقوف جو ۷۲ سال کے بوڑھے کو ماں کی گالی دیتا ہے اس سے زیادہ حماقت اور کیا ہوگی۔''

دیوان فضل اللہ خان، مرزا غالب کے ملنے والے تھے۔ ایک دن وہ جلدی میں تھے۔ مرزا غالب کے مکان کے قریب سے گزر گئے لیکن مرزا صاحب کو مل نہ سکے۔ مرزا صاحب کو پتہ چلا تو انہیں لکھا: ''آج مجھ کو اس قدر ندامت ہوئی ہے کہ شرم کے مارے زمین میں گڑا جاتا ہوں۔ اس سے زیادہ اور کیا نالائقی ہوسکتی ہے کہ آپ کبھی کبھی تو اس طرف سے گزریں اور میں سلام کو حاضر نہ ہوں۔'' دیوان صاحب کو یہ خط ملا تو بے حد نادم ہوئے اور اسی وقت مرزا کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔

مولوی فضل حق صاحب کی عادت تھی کہ جب اُن کا کوئی بے تکلف دوست اُن سے ملنے آتا تو خالق باری کا یہ مصرع پڑھ کر اس کا خیر مقدم کرتے۔

بیا برادر آؤ رے بھائی

ایک روز مرزا صاحب اُن سے ملنے گئے تو انہوں نے کھڑے ہوکر استقبال کیا اور یہی مصرع پڑھا۔ اتنے میں مولوی صاحب کی زوجہ دوسرے دالان سے نکل کر آ گئی تو مرزا صاحب نے مولوی صاحب سے کہا:

ہاں صاحب! اب وہ دوسرا مصرع بھی پڑھ دیجیے!

بنشیں مادر بیٹھ ری مائی

میر انیس

ولادت: ۱۸۰۳ء (فیض آباد، یوپی)

وفات: ۱۰ر دسمبر ۱۸۷۴ء (لکھنؤ)

میر انیس ساتویں، یا آٹھویں محرم کو ایک نواب علی نقی خاں کے ہاں پڑھتے تھے۔ ایک روز مجلس شروع ہونے سے پہلے نواب صاحب نے پیغام بھیجا کہ میں آج دردِ سر کی وجہ سے حاضری سے معذور ہوں۔

میر انیس نے جواب دیا کہ

"آج میرا مزاج بھی درست نہیں ہے۔ مناسب ہے مجلس موقوف رکھی جائے۔ اِن شاءاللہ! سالِ آئندہ دیکھا جائے گا۔"

نواب صاحب گھبرا کر باہر نکل آئے۔ میر انیس سے معافی مانگی اور حالتِ مرض میں اختتامِ مجلس تک بیٹھے رہے۔

خواجہ آتش نہایت سیدھے سادے اور بھولے بھالے تھے۔ میر انیس ان کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن ان کو نماز پڑھنے کا خیال آگیا۔ ایک شاگرد سے کہا! بھئی ہمیں نماز سکھلا دو۔ وہ اتفاقاً اہل سنت میں سے تھا۔ اس نے ویسی ہی نماز سکھلا دی اور یہ کہہ دیا! کہ استاد عبادت الٰہی جتنی پوشیدہ ہو اتنی ہی اچھی ہوتی ہے۔ چنانچہ جب بھی نماز کا وقت ہوتا تو خواجہ صاحب یا تو حجرے میں چلے جاتے یا گھر کا دروازہ بند کر لیتے۔ میر خلیل ان کے شاگرد خاص اور خلوت وجلوت کے حاضر باش تھے۔ ایک دن انہوں نے نماز پڑھتے دیکھ لیا تو اہلسنت کی طرح نماز پڑھتے دیکھ کر حیران رہ گئے اور پوچھا! استاد آپ کا مذہب کیا ہے؟

انہوں نے جواب دیا: شیعہ۔ مگر کیوں پوچھتے ہو؟ انہوں نے کہا! جونماز آپ پڑھتے ہیں وہ تو سُنّیوں جیسی ہے۔ خواجہ صاحب نے کہا! بھئی میں کیا جانوں۔ فلاں شخص نے جو سکھا دی وہی پڑھتا ہوں۔ مجھے کیا خبر ایک خدا کی دو طرح کی نمازیں ہوتی ہیں۔ پھر شیعوں کی طرح نماز سیکھ کر پڑھنے لگ گئے۔

میر انیس مرحوم کی نسبت یہ روایت لکھنو میں بہت مشہور ہے کہ ایک مرتبہ مرثیے میں شیریں زبانی یہ دعائیہ مصرع کہہ چکے تھے:

یا رب، رسول پاک کی کھیتی ہری رہے

دوسرے مصرے کی فکر میں تھے۔ جیسا جی چاہتا تھا، ویسا برجستہ مصرع نہ ہوتا تھا۔ اسی اثنا میں میر نفیس مرحوم کی والدہ یعنی میر صاحب کی بیوی تشریف لائیں اور میر صاحب کو فکر میں دیکھ کر پوچھا: ''کیا سوچ رہے ہو؟'' آپ نے یہ مصرع پڑھا کہ اس کے دوسرے مصرے کی فکر میں دیر سے ہوں۔ یہ سننا تھا کہ ان کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا کہ یہ مصرع لگا دیجیے۔ میر انیس کی والدہ ماجدہ فرماتی ہیں:

صندل سے مانگ بچوں سے گودی بھری رہے

میر صاحب نے یہ مصرع فوراً لکھ لیا اور اب یہ شعر:

یارب رسول پاک کی کھیتی ہری رہے
صندل سے مانگ بچوں سے گودی بھری رہے

زبان کی لطافت اور محاورے سے مالا مال ہو گیا۔
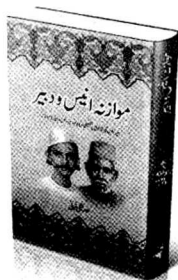
سر سید احمد خان

ولادت: ۱۷/ اکتوبر ۱۸۱۷ء (دہلی)

وفات: ۲۷/ مارچ ۱۸۹۸ء (علی گڑھ)

سر سید احمد خان ایک دفعہ ریل میں سوار تھے۔ کسی اسٹیشن پر دو انگریز ان کے ڈبے میں آ بیٹھے۔ ان میں سے ایک پادری تھا۔ اسے کسی طرح معلوم ہو گیا سر سید احمد خان یہی شخص ہے۔ پادری ان سے یوں مخاطب ہوا: ''مدت سے آپ سے ملاقات کا اشتیاق تھا۔ آپ سے خدا کی باتیں کرنا چاہتا تھا۔''

سر سید احمد کان نے کہا: ''میں نہیں سمجھا، آپ کس کی باتیں کرنا چاہتے ہیں؟''

پادری: ''خدا کی۔''

سر سید احمد خان (کمال سنجیدگی سے) ''میری تو کبھی ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔''

پادری: (متعجب ہو کر) ''ہیں ۔۔۔ آپ خدا کو نہیں جانتے۔''

سر سید احمد خان: ''مجھ ہی پر کیا موقوف، جس سے ملاقات نہ ہوئی ہو، اسے کوئی بھی نہیں جانتا۔'' پھر کسی کا نام لے کر پوچھا ''آپ اسے جانتے ہیں۔''

پادری: ''نہیں میں اس سے کبھی نہیں ملا۔''

سر سید احمد خان: ''پھر جس سے میں کبھی نہ ملا ہوں، نہ میں نے کبھی اسے اپنے ہاں کھانے پر بلایا ہو، نہ مجھے اس کے ہاں کھانے پر جانے کا اتفاق ہوا ہو، اسے میں کیوں کر جان سکتا ہوں۔''

پادری یہ سن کر خاموش رہا اور دوسرے انگریز سے انگریزی میں کہا:

''یہ تو سخت کافر ہے۔''

بسااوقات از راہِ شفقت و دل جُوئی بیمار طالب علموں کو سرسیّد اپنے گھر لے آیا کرتے تھے تاکہ علاج و پرہیز باقاعدہ ہو سکے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ دو ایسے طلبہ نے رُوبہ صحت ہونے کے دوران اُن کے باغ سے انار کھانا شروع کر دیے۔ صبح کو بے چارہ مالی جب انار پیڑوں سے اُتارنے جاتا تو خالی جھولی لوٹتا۔ اُس نے جب اِن انار خوروں سے رجوع کیا تو جواب ملا کہ گلہریاں کھا جاتی ہیں۔ اُس غریب نے سرسیّد کے رُوبہ رُو بھی اناروں کی گمشدگی کی یہی وجہ بیان کر دی۔ سرسیّد نے مسکرا کر کہا:

''اُن سے کہہ دینا کہ گلہریوں کے لئے آہنی مُنہ دان بنوا لیے ہیں۔''

چناں چہ اُس کے بعد گلہریاں ہوشیار ہو گئیں۔ اِس چھوٹے سے واقعے میں یہ بات سامنے آتی ہے، اُس سرقۂ اناراں کے مجرموں کو جانتے بوجھتے ہوئے سرسیّد نے سزا دینا تو درکنار، خود اُن سے پوچھ گچھ کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔

ایک روز دوپہر ہم کچی بارک میں اکٹھے بیٹھے تھے، گرمی کا زمانہ تھا، خربوزے کھائے جا رہے تھے۔ شوق پورا کرنے کے بعد ہم نے ٹوکری بھرے چھلکے اور بیج پچھلی کھڑکی سے میدان میں پھینک دیے۔ بدقسمتی سے عین اُسی وقت سرسیّد اپنی ''فٹن'' میں بیٹھے اُدھر سے گزر رہے تھے اور وہ سارے بیج اور چھلکے اُن کی گود میں جا پڑے، ہم سب لوگ سہم گئے اور خاموشی سے اپنے کام کاج میں اس طرح مشغول ہو گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، لیکن ذرا ہی دیر میں گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز نے سب کو چونکا دیا۔ دیکھا تو سرسیّد کی فٹن ٹھیک ہمارے کمرے کے دروازے کے سامنے کھڑی ہے اور اپنی گود بیجوں سے بھرے سرسیّد اُس میں سے اُترے۔ وارڈن صاحب بلائے گئے۔ ہم چار پانچ ملزمان دست بستہ پیش ہوئے۔ سرسیّد فرمانے لگے: ''میں سمجھ گیا تھا کہ یہ اِن رام پوریوں کی کارگزاری ہوسکتی ہے، اِس لیے براہِ راست اِن کے کمرے پر پہنچ گیا، یہ کھاتے پیتے وقت ایسے بے خود ہو جاتے ہیں کہ ادب و آداب بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔''

ہم چارج شیٹ کی ابتدا سن کر اپنی اپنی جگہ کانپ رہے تھے کہ خدا معلوم، یہ خربوزے کیا رنگ لائیں۔ پھر وہ وارڈن صاحب سے مخاطب ہوئے: ''کیوں ماسٹر صاحب! آپ اِنہیں یہی کچھ سکھاتے ہیں؟''

مجوب وارڈن صاحب بولے: ''حضرت! میں نے تو انہیں سخت تاکید کی ہے کہ چھلکے وغیرہ باہر پھینکتے وقت دیکھ لیا کریں کہ کوئی شریف آدمی تو اِدھر سے نہیں گزر رہا ہے۔''

سرسیّد فرمانے لگے: ''تب تو اِنہوں نے ٹھیک ہی کیا۔ کیوں کہ علی گڑھ میں مجھ سے زیادہ شریف اِنہیں کہاں ملتا۔''

اتنا کہہ کر وہ رخصت ہو گئے۔ نہ کان کھنچی، نہ اُٹھک بیٹھک، نہ ہوسٹل سے اخراج، نہ کوئی اور وارننگ، لیکن سچ پوچھئے تو اُن کے اِس اندازِ تنبیہ کا جو اثر ہوا وہ کبھی محو نہیں ہو سکا۔ چناں چہ میں اِس بڑھاپے میں بھی چھلکے وغیرہ پھینکتے وقت احتیاط برتتا ہوں۔

ایک دن ایک مولوی صاحب سرسید احمد خان کے پاس آ کر کہنے لگے:

''میں نے گزشتہ دنوں آپ کے خلاف فضول باتیں کہی ہیں اور آپ کو گالیاں بھی دی ہیں اور اب بھی کئی مرتبہ اس گناہ کا مرتکب ہوا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اپنے کیے پر نادم ہوں، آپ میرے گناہ بخش دیں۔''

سرسید یہ سن کر مسکرائے اور کہا: ''جایئے صاحب! میں نے آپ کی نہ صرف وہ گالیاں بخش دیں ہیں جو آپ نے پچھلے دنوں مجھے دی تھیں بلکہ وہ بھی بخش دی ہیں جو آپ آیندہ مجھے دیں گے۔''

ایک مولوی صاحب نے سرسید کو خط لکھا کہ معاش کی طرف سے بہت تنگ ہوں، عربی جانتا ہوں، انگریزی سے ناواقف ہوں، کسی ریاست میں میری سفارش کر دیں۔

سرسید نے جواب دیا: ''سفارش کی میری عادت نہیں اور معاش کی تنگی کا آسان حل یہ ہے کہ میری ''تفسیرِ قرآن'' کا رَدّ لکھ کر چھپوائیں، کتاب خوب بکے گی اور آپ کی تنگی دُور ہو جائے گی۔''

کسی منچلے نوجوان نے سرسید سے پوچھا: ''کیوں حضرت اگر نماز میں عربی عبارت کی بجائے صرف ترجمہ پڑھ لیا جائے تو کوئی حرج یا نقصان تو نہیں ہوگا؟''

''ہرگز کوئی حرج یا نقصان نہیں ہوگا میاں صاحبزادے !! البتہ نماز نہیں ہوگی۔'' سرسید نے جواب دیا۔

ایک دفعہ سرسید، شبلی نعمانی اور مولوی ممتاز علی بیٹھے تھے۔ مختلف موضوعات پر بحث ہو رہی تھی۔ اس دوران سرسید کا ایک کاغذ گم ہو گیا۔ سرسید اسے ڈھونڈنے لگے۔ اچانک مولانا شبلی کی نظر اس مطلوبہ کاغذ پر پڑی۔ انہوں نے ازراہ مذاق اس پر ہاتھ رکھ دیا۔ سرسید نے انھیں ایسا کرتے دیکھ لیا اور اونچی آواز میں بولے: ''سنا ہے جو چیز گم ہو جائے شیطان اسے ہاتھ تلے چھپا لیتا ہے۔'' پھر وہ مولانا سے مخاطب ہوئے:

''مولانا! ذرا دیکھنا کہ مطلوبہ کاغذ آپ کے ہاتھ کے نیچے تو نہیں آ گیا۔''

ایک شخص نے سرسید کو خط لکھا: ''میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ ہیں، جن کی لوگ تعریف کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ان کی ساری عمر قوم کی خیر خواہی اور بھلائی میں گزری، جب میری آنکھ کھلی تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بزرگ آپ ہی ہیں، پس میری مشکل اگر حل ہوگی تو آپ ہی سے ہوگی۔''

سرسید نے اسے جواب لکھا: ''جس باب میں آپ سفارش چاہتے ہیں اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے اور جس کو آپ نے خواب میں دیکھا تھا وہ غالباً شیطان تھا۔''

دلی میں ایک بہت مشہور گانے والی تھی جس کا نام شیریں تھا مگر اس کی ماں بہت بے ڈول اور بُری شکل کی تھی۔ ایک مجلس میں شیریں اپنی ماں کے ساتھ گانے اور مجرے کے لیے آئی، سرسید بھی وہاں موجود تھے اور ان کے برابر ان کے ایک ایرانی دوست بیٹھے ہوئے تھے، وہ شیریں کی ماں کو دیکھ کر کہنے لگے:

''مادرش بسیار تلخ است'' (اسکی ماں بہت تلخ ہے)۔

اس پر سرسید نے فوراً جواب دیا:

''گرچہ تلخ است ولیکن برشیریں دارد'' (اگرچہ وہ تلخ ہے لیکن پھل شیریں رکھتی ہے)

سرسید، ایک بار ریل گاڑی میں سفر کر رہے تھے۔ ان ہی کے ڈبے میں ہائی کورٹ کا ایک جج بھی سفر کر رہا تھا۔ کسی بات پر دونوں کی آپس میں تکرار ہوگئی۔ بات تو تو میں میں تک پہنچی اور جج نے کہا کہ معلوم ہے میں کون ہوں۔ میں ہائی کورٹ کا جج ہوں۔

اس پر سرسید نے کہا:

''میں جج کا باپ ہوں۔'' (سرسید کے بڑے بیٹے سید محمود جج تھے)

ایک دفعہ ایک مولوی صاحب سرسید سے ملاقات کے لیے آئے، تو سرسید اس وقت کھانا کھا رہے تھے۔ کچھ احباب شریک طعام تھے۔ سرسید نے از راہ اخلاق مولوی صاحب

سے بھی کھانے کے لیے کہا۔ مولوی صاحب نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ: ''آپ کے کھانے کا کیا اعتبار مسلمانوں کا تو ذکر ہی کیا کوئی ذلیل سے ذلیل شخص بھی آپ کے ساتھ کھانا پسند نہیں کرے گا۔'' سرسید مسکرائے اور کہا: ''بے شک ذلیل شخص میرے ساتھ کھانے میں شریک ہونا پسند نہیں کرسکتا۔'' مولوی صاحب آپے سے باہر ہو گئے اور بغیر کسی گفتگو کے چل دیے۔

سرسید احمد خان ٹرین میں سفر کر رہے تھے کہ ان کے ڈبے میں ایک انگریز آکر بیٹھ گیا سرسید کو ناگوار گزرا لیکن خاموش رہے۔ کچھ دیر بعد انہیں بھوک محسوس ہوئی تو انہوں نے اپنا ناشتہ دان کھول کر رکھا اور ہاتھ دھونے کے لیے غسلخانہ میں چلے گئے لوٹ کر آپ نے دیکھا تو ناشتہ دان غائب پایا۔

دراصل انگریز نے ان کی غیر حاضری میں ناشتہ دان چلتی گاڑی سے باہر پھینک دیا تھا۔ سرسید کو غصہ تو بہت آیا لیکن وہ پی گئے اور خاموش بیٹھے رہے۔ کچھ دیر بعد انگریز اپنی سیٹ سے اٹھا اور ٹائیلٹ میں چلا گیا۔ انگریز کا ہیٹ سیٹ پر رکھا رہا۔ سرسید فوراً اٹھے، ہیٹ پکڑا اور چلتی گاڑی کی کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ انگریز لوٹا اور ہیٹ کو اپنی جگہ نہ پایا تو بولا: ''ویل جنٹلمین ادھر ہمارا ہیٹ تھا کدھر گیا۔'' سرسید نے فوراً کہا ''تمہارا ہیٹ میرے ناشتہ دان کے تعاقب میں گیا ہے۔''

مولانا حالی کے مقامی دوستوں میں مولوی وحید الدین سلیم (لٹریری اسسٹنٹ سرسید احمد خاں) بھی تھے جب یہ پانی پت میں ہوتے تو روزانہ مولانا حالی کے پاس جا کر گھنٹوں بیٹھا کرتے تھے۔ ایک روز صبح ہی صبح پہنچے۔ مولانا نے رات کو کوئی غزل کہی تھی وہ ان کو سنائی سلیم سن کر پھڑک اٹھے اور کہنے لگے ''مولانا کیا جادو ہے۔'' مولانا کے بالا خانے کے نیچے ایک کوٹھڑی تھی وہ مولانا نے ایک مجذوب فقیر کو رہنے کے لیے دے رکھی تھی۔ وہ مجذوب

باہر گلی میں بیٹھا دھوپ تاپ رہا تھا۔ جب اس کے کان میں یہ فقرہ پڑا تو بے اختیار چلا اٹھا ''جادو برحق کرنے والا کافر۔'' مولانا نے مسکرا کر سلیم صاحب سے کہا: ''لیجیے مولوی صاحب، سرٹیفکیٹ مل گیا۔''

شمس العلما مولانا ذکاءاللہ وقت کے بڑے پابند تھے۔ ان کا معمول تھا کہ روزانہ دن کے ٹھیک آٹھ بجے گھر سے نکل کر کہیں جایا کرتے تھے، مولوی صاحب دلّی کے کوچۂ چیلاں میں رہتے تھے۔ ایک دن جو باہر نکلے تو سرسیّد کے لڑکے سیّد محمود گھڑی لیے اپنے مکان کے آگے ان کے انتظار میں ٹہلتے نظر آئے۔ مولانا نے پوچھا: ''میاں! یہاں کیوں ٹہل رہے ہو؟''

سیّد محمود نے جواب دیا: ''جی! میں اپنی گھڑی کو چابی دینا بھول گیا تھا، اس لیے یہ بند ہوگئی، میں اب آپ کے انتظار میں ٹہل رہا تھا تاکہ اپنی گھڑی درست کرلوں۔''

مرزا داغ دہلوی

ولادت: ۲۵ر مئی ۱۸۳۱ء (دہلی)

وفات: ۱۴ر فروری ۱۹۰۵ء (حیدر آباد)

ایک بار داغ دہلوی اجمیر گئے۔ جب وہاں سے رخصت ہونے لگے تو ان کے شاگرد نواب عبداللہ خان مطلب نے کہا:

"استاد! آپ جا رہے ہیں، جاتے ہوئے اپنی کوئی نشانی تو دیتے جایئے۔"

یہ سن کر داغ نے بلا تامل کہا: ع

داغ کیا کم ہے نشانی کا، یہی یاد رہے

ایک دن حضرت داغ دہلوی نماز پڑھ رہے تھے کہ ان کا ایک شاگرد آیا۔ استاد کو نماز پڑھتے دیکھا تو واپس چلے گئے۔ اسی وقت داغ دہلوی نماز سے فارغ ہوئے تو نوکر نے کہا فلاں صاحب آئے تھے۔ داغ نے نوکر سے کہا، دوڑ کر بلا لاؤ۔ جب وہ صاحب آئے تو داغ نے کہا، آپ آ کر چلے گے؟ شاگرد نے کہا، آپ نماز پڑھ رہے تھے۔ داغ کہنے لگے، جناب ہم نماز پڑھ رہے تھے، لاحول تو نہیں پڑھ رہے تھے جو آپ بھاگ گئے۔

داغ کے یہاں ایک طوائف ملازم تھی۔ عمر میں کوئی بیس بائیس برس کی ہوگی۔ ایک دفعہ داغ نے اپنے آدمی کے ذریعے اسے بلا بھیجا۔ اس نے آدمی سے یہ کہا کہ ان سے کہہ دے میری بلا بھی نہیں آتی ملازم نے یہی جملہ داغ سے آ کر دہرایا۔ داغ لطف اندوزی کی خاطر بار بار اس سے دریافت کرتے تھے کہ اس نے کیا کہا اور وہ اسی جملہ کو دہراتا جاتا تھا۔ اسی کیفیت میں انہوں نے نواب عزیز یار جنگ سے (جو موجود تھے) کہا کہ لکھو۔

یہ کیا کہا کہ میری بلا بھی نہ آئے گی کیا تم نہ آؤ گے تو قضا بھی نہ آئے گی

بعد کو غزل مکمل کر دی۔

جب داغ رامپور میں ملازم تھے تو ایک مرتبہ سیر سپاٹے کے لیے لکھنؤ بھی گئے۔ ان ایام میں لکھنؤ میں مشتری نامی ایک طوائف کی بڑی دھوم تھی۔ داغ نے اپنے رفیق سفر نواب بہادر حسین خاں انجم سے کہا ''چلو، ذرا مشتری سے ملتے چلیں۔'' چنانچہ دونوں وہاں پہنچے۔ مشتری نے نہایت تعظیم و تکریم سے دونوں معزز مہمانوں کی پذیرائی کی اور اس کے بعد داغ سے کچھ پڑھنے کی فرمائش کی۔ جس پر داغ نے یہ شعر سنایا ؎

شب ہجراں کے جاگنے والے　　　ایسے سوئے کہ پھر خبر نہ ہوئی

مشتری خود شاعرہ تھی۔ داغ کا یہ شعر سن کر بیخود ہوگئی اور دیر تک وجد میں آکر اسے بار بار دہراتی رہی۔ پھر داغ نے کہا ''آپ بھی اپنا کلام سنایئے۔ اس پر وہ بیاض لینے دوسرے کمرے میں گئی وہاں اتفاق سے حقہ بھرا ہوا رکھا تھا۔ کسی آدمی کی ٹھوکر لگانے سے چلم فرش پر گر پڑی اور سفید چاندنی جگہ جگہ سے جل گئی۔ آدمی دوڑ پڑے اور انہوں نے جلدی جلدی فرش سے انگارے اٹھائے۔ جب مشتری بیاض لے کر آئی تو کسی نے پوچھا ''کیا ہوا؟'' داغ نے بے ساختہ کہا ''داغ لگ گیا۔''

ایک دفعہ حبیبی کنتوری صاحب کے ہاں نشست تھی، جس میں مرزا داغ بھی شریک تھے۔ کنتوری صاحب نے غزل پڑی، جس کی زمین تھی ''سفر سے پہلے، ہجر سے پہلے'' وغیرہ۔ انہوں نے ایک شعر جس میں سفر کا قافیہ باندھا تھا۔ بہت زور دے کر اسے پڑھا اور فرمایا کہ کوئی دوسرا اگر ایسا شعر نکالے، تو خون تھوکنے لگے۔ مرزا داغ یہ سن کر مسکرائے اور بولے کہ ہم تو اس زمین پر تھوکتے بھی نہیں۔ اس جملے پر حاضرین میں ہنسی کی لہر دوڑ گئی اور کنتوری صاحب خفیف ہو کر رہ گئے۔

ایک بار حضرت داغ اپنے ساتھیوں سمیت 'پھول والوں کی سیر' میں گئے۔ داغ پان کے رسیا تھے۔ ایک نوجوان اور شوخ پنواڑن کی دکان سجی دیکھ کر اس کی طرف بڑھے اور پنواڑن سے بولے: ''بی پنواڑن! دس پان لگانا۔'' پنواڑن نے جوتی کی نوک پر ہاتھ لگا کر کہا: ''کیا فرمایا، کتنے لگاؤں؟'' مرزا داغ جھینپ گئے اور پنواڑن سے صحیح محاورہ سن کر چوکڑی بھول گئے اور سنبھل کے بولے: ''دس پان بنانا۔'' دلی کی پنواڑنیں بھی بامحاورہ اُردو بولتی تھیں۔

مرزا داغ کے ایک شاگرد احسن مارہروی اپنی غزل پر اصلاح کے لیے ان کے پاس حاضر ہوئے۔ اس وقت مرزا صاحب کے پاس دو تین دوستوں کے علاوہ ان کی ملازمہ صاحب جان بھی موجود تھی۔ جب احسن نے شعر پڑھا:

کسی دن جا پڑے تھے بیخودی میں ان کے سینے پر　　بس اتنی سی خطا پر ہاتھ کچلے میرے پتھر سے

اس پر صاحب جان جو صحبت یافتہ اور حاضر جواب طوائف تھی، بولی: احسن میاں! بے خودی میں بھی آپ دونوں ہاتھوں سے کام لیتے ہیں۔ اس پر سب کھلکھلا کر ہنسنے لگے اور مرزا صاحب نے احسن سے کہا: ''لیجیے، صاحب جان نے آپ کے شعر کی اصلاح کر دی:

کسی دن جا پڑا تھا بیخودی میں ان کے سینے پر　　بس اتنی سی خطا پر ہاتھ کچلا میرا پتھر سے

بشیر رامپوری، حضرت داغ دہلوی سے ملاقات کے لیے پہنچے تو وہ اپنے ماتحت سے گفتگو بھی کر رہے تھے اور اپنے ایک شاگرد کو اپنی نئی غزل کے اشعار بھی لکھوا رہے تھے۔ بشیر صاحب نے سخن گئی کے اس طریقہ پر تعجب کا اظہار کیا تو داغ صاحب نے پوچھا: ''خاں صاحب! آپ شعر کس طرح کہتے ہیں؟'' بشیر صاحب نے بتایا کہ حقہ بھروا کر الگ تھلگ ایک کمرے میں لیٹ جاتا ہوں۔ تڑپ تڑپ کر کروٹیں بدلتا ہوں، تب کوئی شعر موزوں ہوتا ہے۔'' یہ سن کر داغ مسکرائے اور بولے: ''بشیر صاحب! آپ شعر کہتے نہیں، شعر جنتے ہیں۔''

ڈپٹی نذیر احمد دہلوی

ولادت: ۶ر دسمبر ۱۸۳۶ء (ضلع بجنور)

وفات: ۳ر مئی ۱۹۱۲ء (دہلی)

مولوی نذیر احمد بڑے بذلہ سنج اور حاضر جواب تھے۔ ایک مرتبہ علما میں یہ بحث چلی کہ اجمیر شریف، تونسہ شریف اور بغداد شریف کہنا جائز ہے یا نہیں؟

بعض علما اس کے حق میں تھے، بعض مخالف۔ ایک شخص نے مولانا کی رائے بھی دریافت کی۔ انہوں نے جواب دیا: ''اگر مزاج شریف کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں تو اجمیر شریف بھی کہنا درست ہے۔''

نامور ادیب مولوی نذیر احمد حیدرآباد میں ڈپٹی کلکٹر تھے، ان کا تبادلہ کسی دوسرے شہر ہو گیا۔ وہاں کے ایک رئیس ان سے ملاقات کے لئے حاضر ہوئے۔ دورانِ ملاقات انہوں نے جیب سے اپنا شجرۂ نسب نکالا اور پڑھ کے بتانے لگے: ''فلاں رشتے میں ہمارے دادا لگتے ہیں۔ فلاں ہمارے چچا ہیں فلاں ماموں لگتے ہیں۔''

نذیر صاحب ان کی گفتگو سن کر طیش میں آ گئے اور کہنے لگے:

''معاف کیجئے گا، اس وقت میرا شجرۂ نسب ہمراہ نہیں ورنہ میں آپ کو بتاتا کہ ہمارا شجرہ نسب بھی باوا آدم سے ملتا ہے۔''

دہلی میں ایجوکیشنل کانفرنس ہو رہی تھی اور نذیر احمد تقریر کر رہے تھے، اتنے میں

لارڈ کچز تشریف لائے، مولوی صاحب چند منٹ تقریر کر کے بیٹھ گئے، تھوڑی دیر کے بعد جب لارڈ صاحب رخصت ہوئے تو مولوی صاحب پھر تقریر کرنے کھڑے ہوئے اور اس آیت کے ساتھ تقریر شروع کی:

قد جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا

''حق آیا...... اور باطل چلا گیا۔ بے شک باطل کو چلا جانا ہے۔''

لارڈ کچز عربی جانتے تھے۔ سمجھ گئے کہ بڈھے نے کیا خوب چوٹ کی ہے۔

مولانا عبدالحلیم شرر کا ناول ''بدر النساء کی وصیت'' شائع ہوا، تو خواجہ حسن نظامی نے ڈپٹی نذیر احمد نے پوچھا ''حضرت پردے کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟''

ڈپٹی صاحب نے فرمایا: ''کس کے پردے کے متعلق جواب دوں، زمانہ وہ آ گیا ہے کہ اب تو لڑکوں کو بھی پردہ کرنا چاہیے۔''

ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کے پاس عربی کی ایک کتاب تھی، دلّی کے ایک مولوی صاحب اس کتاب کو دیکھنے کے شائق تھے، تعلقات کچھ اس قسم کے تھے کہ ڈپٹی صاحب نہ انکار کرتے نہ دینا چاہتے تھے، مولوی صاحب کے اصرار پر آخر انہیں ایک دن کتاب دینی پڑی۔ کتاب مولوی صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے ڈپٹی صاحب نے فرمایا ''کتاب تو بڑی اچھی ہے لیکن اس کی جلد سؤر کے چمڑے کی ہے۔''

مولوی صاحب نے یہ الفاظ سنے تو لاحول پڑھتے ہوئے فوراً پیچھے ہٹ گئے اور کتاب لینے سے انکار کر دیا۔

شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ وقت کے بڑے پابند تھے، ان کا معمول تھا کہ روزانہ دن کے ٹھیک نو بجے اپنے گھر سے نکل کر کہیں جایا کرتے تھے، مولوی صاحب دہلی کے کوچہ چیلاں میں رہتے تھے، ایک دن جو باہر نکلے تو سرسید کے لڑکے سید محمود گھڑی لیے اپنے مکان کے آگے ان کے انتظار میں ٹہلتے نظر آئے، مولانا نے پوچھا:

''میاں! یہاں کیوں ٹہل رہے ہو؟''

سید محمود نے جواب دیا''جی! میں اپنی گھڑی کو چابی دینا بھول گیا تھا، اس لیے وہ بند ہوگئی، میں اب آپ کے انتظار میں ٹہل رہا تھا تا کہ اپنی گھڑی درست کرلوں۔''

مولانا الطاف حسین حالی

ولادت: ۱۸۳۷ء (پانی پت، ہریانہ)

وفات: ۱۳ر دسمبر ۱۹۱۴ء و یکم جنوری ۱۹۱۵ء کی درمیانی شب (پانی پت، ہریانہ)

مولانا حالی کے پاس ان کے ایک ملنے والے غزل لکھ کر لائے اور برائے اصلاح پیش کی غزل میں کوئی بھی مصرع عیب سے خالی نہ تھا۔ مولانا حالی نے تمام غزل پڑھنے کے بعد بے ساختہ فرمایا ''بھئی غزل خوب ہے اس میں تو کہیں انگلی رکھنے کو بھی جگہ نہیں۔''

ایک مرتبہ مولانا حالی سہارن پور تشریف لے گئے اور وہاں ایک معزز رئیس کے پاس ٹھہرے۔ گرمی کے دن تھے۔ مولانا کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔ اُس وقت اتفاق سے ایک کسان آ گیا۔ رئیس نے کہا:

''یہ جو صاحب آرام کر رہے ہیں، اِن کو پنکھا جھل۔''

وہ بے چارہ پنکھا جھلنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے چپکے سے رئیس سے پوچھا:

''یہ جو صاحب پلنگ پر سو رہے ہیں کون ہیں۔ اِن کو پہلی مرتبہ یہاں دیکھا ہے؟''

رئیس نے کہا: ''ارے کم بخت! تُو اِنہیں نہیں جانتا! سارے ہندوستان میں اِن کا چرچا ہو رہا ہے، یہ مولوی حالی ہیں۔''

اس پر غریب کسان نے تعجب سے پوچھا:

''ہالی بھی مولوی ہوتے ہیں؟''

وہ بے چارہ ''حالی'' کو ''ہالی'' یعنی ہل چلانے والا سمجھا۔

مولانا لیٹے ہوئے تھے۔ یہ فقرہ سنا تو پھڑک اٹھے اور رئیس سے کہا:

''اِس تخلص کی جو داد آج ملی ہے، کبھی نہیں ملی۔''

ایک مرتبہ مولانا حالی کے پاس مولوی وحید الدین سلیم (لٹریری اسسٹنٹ سر سید احمد خان) بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص آیا اور مولانا حالی سے پوچھنے لگا: ''حضرت، میں نے غصہ میں آ کر اپنی بیوی سے کہہ دیا کہ تجھ پر تین طلاق، لیکن بعد میں مجھے اپنے کیے پر افسوس ہوا، بیوی بھی راضی ہے مگر مولوی کہتے ہیں کہ طلاق پڑ گئی، اب صلح کی کوئی شکل نہیں، خدا کے لیے میری مشکل آسان فرمائیں اور کوئی ایسی ترکیب بتائیں کہ میری بیوی گھر میں دوبارہ آباد ہو سکے۔''

ابھی مولانا حالی کوئی جواب نہیں دے پائے تھے کہ مولوی سلیم اس شخص سے کہنے لگے: ''بھئی یہ بتاؤ کہ تُو نے طلاق 'ت' سے دی تھی یا 'ط' سے؟''

اس شخص نے کہا۔ ''جی میں تو ان پڑھ اور جاہل آدمی ہوں، مجھے کیا پتہ کہ 'ت' سے کیسی طلاق ہوتی ہے اور 'ط' سے کیسی ہوتی ہے۔''

مولوی صاحب نے اس سے کہا کہ ''میاں یہ بتاؤ کہ تم نے قرأت کے ساتھ کھینچ کر کہا تھا کہ ''تجھ پر تین طلاق'' جس میں 'ط' کی آواز پوری نکلتی ہے یا معمولی طریقہ پر کہا تھا جس میں 'ط' کی آواز نہیں نکلتی بلکہ 'ت' کی آواز نکلتی ہے۔''

بیچارے غریب سوال کنندہ نے کہا: ''جی مولوی صاحب، میں نے معمولی طریقہ پر کہا تھا، قرأت سے کھینچ کر نہیں کہا تھا۔''

یہ سننے کے بعد مولوی سلیم صاحب نے پورے اطمینان کے ساتھ اس سے کہا: ''ہاں بس معلوم ہو گیا کہ تُو نے 'ت' سے 'تلاق' دی تھی اور 'ت' سے کبھی طلاق پڑ ہی نہیں سکتی، 'ت' سے 'تلاق' کے معنی ہیں 'آ محبت کے ساتھ مل بیٹھ'، تُو بے فکر ہو کر اپنی بیوی کو گھر لے آ اور اگر کوئی مولوی اعتراض کرے تو صاف کہہ دیجو کہ میں نے تو 'ت' سے 'تلاق' دی تھی 'ط' سے ہر گز نہیں دی۔''

مولانا حالی کے مقامی دوستوں میں مولوی وحید الدین سلیم تھے، جب یہ پانی پت روانہ ہوئے تو روزانہ مولانا حالی کے پاس جا کر گھنٹوں بیٹھا کرتے تھے، ایک روز صبح ہی صبح

پہنچے، مولانا نے رات کو کوئی غزل کہی تھی، وہ ان کو سنائی سلیم سن کر پھڑک اٹھے اور کہنے لگے:

''مولانا! واللہ جادو ہے۔''

مولانا کے بالا خانے کے نیچے ایک کوٹھڑی تھی وہ مولانا نے ایک مجذوب فقیر کو رہنے کے لیے دے دی تھی۔ وہ مجذوب باہر گلی میں بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا جب اس کے کان میں یہ فقرہ پڑا تو بے اختیار چلا اٹھا ''جادو برحق کرنے والا کافر۔''

مولانا نے مسکرا کر سلیم صاحب سے کہا ''لیجیے مولوی صاحب! سرٹیفکیٹ مل گیا۔''

پانی پت میں مسلم حالی ہائی سکول کا سنگ بنیاد رکھا جا چکا تھا، دیواریں اُٹھا دی گئی تھیں، مگر قلتِ زر کی وجہ سے چھتیں نہیں پڑ سکی تھیں، تاہم پڑھائی کا آغاز کر دیا گیا تھا۔ مولانا وحید الدین سلیم بے کاری، بے روزگاری کی زندگی گزار رہے تھے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے خواہش ظاہر کی کہ وہ سکول میں طلباء کو اُردو فارسی پڑھا دیا کریں۔ گزارے کے لیے تیس روپے ماہوار اعزازیہ قبول کر لیں، مگر مولانا وحید الدین سلیم نے اس پیش کش کو قبول کرنے کے بجائے ایک نظم لکھ کر بھجوا دی، جس کا ایک شعر یہ تھا:

کیسا نیا مکاں ہے، چھت جس کی آسماں ہے
پتھر پڑیں گے اس پر اب آگرے سے آکر

اکبر الٰہ آبادی

ولادت: ۱۶ر نومبر ۱۸۴۶ء (الٰہ آباد، یوپی)

وفات: ۹ر ستمبر ۱۹۲۱ء (الٰہ آباد، یوپی)

شبِ برات کا دن تھا۔ ملنے والے جمع تھے۔ ان میں سے ایک قدسی جائسی نامی تھے۔ ڈاڑھی مونچھ صاف۔ لڑکی سے معلوم ہوتے تھے۔ بہت شوخیاں کر رہے تھے اور بے تکلف و گستاخ ہوئے جاتے تھے۔

بار بار اکبر الٰہ آبادی سے کہتے: ''آج شبِ برات ہے، شب براتی دلوایئے۔''

اصرار زیادہ بڑھا تو اکبر نے تنگ آ کر ایک شعر داغ دیا:

تحفہ شب براَت میں کیا دوں
جانِ من تم تو خود پٹاخہ ہو

اکبر الٰہ آبادی ایک بار دِلّی گئے۔ وہ خواجہ حسن نظامی کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک دن اکبؔر نے دیکھا کہ دو طوائفیں آئیں اور خواجہ صاحب سے تعویذ لے کر چلی گئیں۔ اُن کے جاتے ہی اکبؔر نے کہا: ''حضرت! میں تو سمجھتا تھا، اِس گھر میں صرف فرشتے نازل ہوتے ہیں، آج تو حوریں بھی اُتر آئیں۔'' یہ کہہ کر انھوں نے فی البدیہہ کہا:

فقیروں کے گھروں میں لطف کی راتیں بھی آتی ہیں
زیارت کے لیے اکثر ''مسماتیں'' بھی آتی ہیں

جس زمانے میں اکبر نے آزادی نسواں اور بے پردگی کے خلاف جہاد شروع کیا، ترقی پسند خواتین اور اسی قسم کے مردوں نے ان پر بوچھاڑ شروع کر دی۔ لاہور کا ''تہذیب نسواں'' ان سب میں پیش پیش تھا۔ اکبر کے خلاف بہت سے مضامین شائع کیے گئے، اور ''آصف جہاں بیگم'' نے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ آنے والا طوفان اب کسی کے روکے نہیں رک سکتا۔ اکبر خود بھی اسے تسلیم کرتے تھے اور جانتے تھے کہ ہوا کا رُخ کس طرف ہو رہا ہے۔ پھر بھی ان دھمکیوں سے مرعوب ہونے کو تیا نہ تھے۔ کہا ہے:

اکبر دبے نہیں کسی سلطاں کی فوج سے
لیکن شہید ہو گئے بیگم کی نوج سے

کاتبوں کی ''غلط نوازیوں'' سے بہت دل برداشتہ خاطر رہتے تھے۔ مولانا ظفر الملک علوی ایڈیٹر ماہنامہ ''الناظر'' کو ایک خط (مطبوعہ الناظر، یکم جنوری 1910ء) میں تحریر فرماتے ہیں: ''اپنے مسودار خود نہیں پڑھ سکتا۔ کاتب کو ہدایت میں نہایت دقت ہوتی ہے۔ کاتب صاحب ایسے ''ذی استعداد'' ہیں کہ ''کونسلوں میں سیٹ'' کو ''گھونسلوں میں بیٹ'' لکھ دیتے ہیں۔''

پھر اسی خط میں پردہ کی بحث چھیڑتے ہوئے لکھا ہے: ''تعلیم نسواں کا مخالف میں کیوں کر ہو سکتا ہوں۔ بغیر تعلیم کے ''معشوقانہ انداز'' ممکن نہیں۔ میں تو شاعر آدمی ہوں، اس قدر تعلیم چاہتا ہوں کہ شعر کا سلیقہ پیدا ہو جائے۔ ''سبز پری'' اگر ایسا مطع نہ کہہ سکتی:

معمور ہوں شوخی سے شرارت سے بھری ہوں
دھانی میری پوشاک ہے میں سبز پری ہوں

تو ''گلفام'' کی کیا کم بختی تھی کہ اس پر مرتا اور راجہ مندر کی سختیاں اٹھاتا۔

ایک صاحبِ ذوق نے نے اکبر کو لکھا:

''میں صاحبِ ذوق ہوں۔ آپ کی الہامی شاعری کا پرستار اور والہ و شیدا، اتنی استطاعت نہیں کہ آپ کے دیوان یا کلیات کو خرید کر پڑھ سکوں۔ اس لیے از راہ علم دوستی اپنے دیوان کی ایک جلد بلا قیمت مرحمت فرما کر ممنون فرمایئے۔''

خط دیکھ کر کہنے لگے:

''اور سنئے ۔۔۔۔ آج مفت دیوان طلب فرما رہے ہیں، کل فرمائش کریں گے کہ صاحبِ ذوق ہوں، مفت میں ''جانکی بائی'' کا گانا سنوا دیجیے۔''

کلکتے کی مشہور مغنیہ گوہر جان ایک دفعہ الہ آباد گئی تو اپنی میزبان جانکی دیوی کو لے کر اکبرالہ آبادی کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ سخن فہم تھیں اور اکبر الہ آبادی کی قدردان بھی...... جانکی دیوی نے ان کا تعارف کرایا اور کہا: ''یہ کلکتے کی نامور مغنیہ ہیں آپ سے ملنے کی بے حد مشتاق تھیں۔'' اکبرالہ آبادی نے فرمایا: ''زہے نصیب! ورنہ میں نہ راجہ، نہ مہاراجہ، نہ امام، نہ غوث، جو قابل زیارت ٹھہرایا جاؤں۔ پہلے جج تھا اب ریٹائرڈ ہو کر صرف اکبرالہ آبادی رہ گیا ہوں۔ حیران ہوں آپ کی خدمت میں کیا پیش کروں۔ ایک شعر بطور یادگار لکھ دیتا ہوں قبول فرمایئے:

خوش نصیب آج بھلا کون ہے گوہر کے سوا
سب کچھ خدا نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

اکبرالہ آبادی کے ایک دوست نے جُوتوں کی دکان کھولی اور دُکان کے افتتاح پر اکبرالہ آبادی کو مہمان خصوصی کے طور پر مدعو کیا۔ فیتہ کٹا۔ چائے سموسے چلے پھر اکبرالہ آبادی

کو اس موقع پر کچھ کہنے کی دعوت دی گئی۔ اکبر الہ آبادی نے فرمایا:

شو میکری کی ہم نے کھولی ہے دکان
اب ہم کمائیں گے جوتوں کے زور سے روزی

ایک مرتبہ اکبر الہ آبادی کے دوست نے انہیں ایک ٹوپی دکھائی جس پر ''قل ہو اللہ'' کڑھا ہوا تھا۔

آپ نے دیکھتے ہی فرمایا:

''بھئی عمدہ چیز ہے۔ کسی دعوت میں کھانا ملنے میں دیر ہو تو یہ ٹوپی پہن لیا کرو، سب سمجھ جائیں گے کہ انتڑیاں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں۔''

اکبر الہ آبادی کو کسی صاحب نے خط لکھا اور خط میں انہیں قبلہ کہہ کر مخاطب کیا۔ اکبر نے جواب دیا: ''آپ نے مجھے قبلہ لکھا ہے جو کہ مسلمانوں کے لیے قابل احترام جگہ سمجھی جاتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کیا لکھوں۔ یہی لکھ سکتا ہوں کہ وعلیکم السلام جامع مسجد۔''

سر سید احمد خاں کو 1888ء میں گورنمنٹ نے سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب دیا۔ تو اکبر الہ آبادی نے ان پر پھبتی کسی ؎

فضل خدا سے یہ عزت پائی
آج ہوئے ہم سی، ایس، آئی
شیخ نہ سمجھے لفظ انگریزی
بولے ہوئے ہیں ہم عیسائی

اکبر کے مشہور ہو جانے پر بہت سے لوگوں نے ان کی شاگردی کا دعویٰ کر دیا۔ ایک صاحب کو دور کی سوجھی اور انہوں نے خود کو اکبر کا استاد مشہور کر دیا، اکبر کو جب یہ اطلاع پہنچی کہ حیدر آباد میں ان کے ایک استاد کا ظہور ہوا ہے تو کہنے لگے:

''ہاں مولوی صاحب کا ارشاد سچ ہے، مجھے یاد پڑتا ہے، میرے بچپن میں ایک مولوی صاحب الہ آباد میں تھے۔ وہ مجھے علم سکھاتے تھے اور میں ان کو عقل، مگر دونوں ناکام رہے، نہ مولوی صاحب کو عقل آئی اور نہ مجھ کو علم۔''

ایک دفعہ اکبر سخت بیمار تھے، جگر کی خرابی کی وجہ سے حکیموں نے تجویز کیا کہ اونٹنی کا دودھ پیجیے، مسکرا کر کہنے لگے:

''بڑھاپے میں جگر کی خرابی مجھے شیر خوار بنا رہی ہے، ماں باپ نے بچپن میں ہی غلطی کی، اگر کسی دراز قامت انا کا دودھ پلا دیتے تو آج یہ اونٹنی کا دودھ کیوں تلاش کرنا پڑتا۔''

ایک کافی عمر رسیدہ مگر فیشن ایبل بزرگ بناؤ سنگار میں مصروف تھے، وہ اکبر کے بے تکلف دوستوں میں تھے مگر اکبر کو دیکھ کر جھینپ گئے۔

اکبر ایسے موقعوں پر کب چوکنے والے تھے، مسکرا کر کہنے لگے ؎

مصروف ہیں حضور کس بندوبست میں
اپریل کی بہار نہ ہو گی اگست میں

ایک صاحب نے شاید اپنی گھڑی ملانے کے خیال سے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے پوچھا۔ کیا بجا ہوگا؟...... ذرا گھڑی تو دیکھیے۔

اکبر نے کہا:

اس کے لیے گھڑی دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں یونہی بتائے دیتا ہوں، میں نے عصر کی نماز ساڑھے چار بجے پڑھی تھی۔ اس وقت سے اب تک تین مرتبہ پیشاب کے لیے جا چکا ہوں اور پیشاب کے لیے ہر آدھ گھنٹے کے بعد مجھے جانا پڑتا ہے، اس حساب سے اس وقت چھ بجے ہیں۔ اس کے بعد کہنے لگے۔

اس سلسلہ میں ایک لطیفہ بھی سن لیجیے۔ ایک شکاری شکار سے واپس ہو رہا تھا، راستے میں دھوبیوں کا گھاٹ پڑا، شکاری نے ایک دھوبی سے پوچھا، کیا وقت ہوگا؟

دھوبی نے جواب دیا۔ میرا گدھا بارہ بجے کی توپ داغنے کے بعد سے اب تک صرف دو مرتبہ رینگا ہے۔ اس کی عادت ہے کہ ہر آدھ گھنٹے کے بعد رینگتا ہے۔ اس حساب سے ایک بجا ہے۔

چنانچہ جب گھڑی دیکھی گئی تو واقعی ایک ہی بجا تھا۔

یہ لطیفہ بیان کر کے بولے۔

ایک لطیفہ اور یاد آ گیا۔ ایک شیخ صاحب کو چاند کی پہلی تاریخ کو دورہ پڑا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ لوگوں میں ''رویت ہلال'' کے بارے میں اختلاف ہو گیا۔ ایک صاحب نے اس کا حل یہ سوچا کہ آپس میں لڑنے جھگڑنے سے اچھا ہے کہ شیخ صاحب کو جا کر دیکھ لو، اگر ان پر دورہ پڑ گیا ہے تو چاند ہے ورنہ نہیں!

حکومت حجاز نے ایک برطانوی کمپنی کو ''حجاز لائن'' تعمیر کرنے کا ٹھیکہ دیا، تجویز یہ تھی کہ جدہ سے مکہ معظمہ ریل نکال کر حاجیوں کی سفری مشکلات کا خاتمہ کر دیا جائے۔

اکبر نے جب اس خبر کو سنا تو ان کی جولائی طبع نہ رک سکی۔

فرمانے لگے:

مکے تک ریل کا سامان ہوا چاہتا ہے
اب تو انجن بھی مسلمان ہوا چاہتا ہے

اکبر دلی میں ہمیشہ خواجہ حسن نظامی کے یہاں ٹھہرا کرتے تھے۔ ''نظام الدین اولیاء'' میں خواجہ حسن نظامی سے دوستانہ مراسم اور خواجہ نظام الدین اولیاءؒ سے عقیدت تھی۔ بستی نظام نظام الدین اولیاء کے ایک ویران گوشے میں مرزا غالب کا مزار بنا ہوا ہے۔ ایک چھوٹی سی ٹوٹی پھوٹی چہار دیواری میں بے چھت اور مقبرہ کے منہدم سی قبر (شاید اب درست ہو گئی ہے) ایک دن خواجہ حسن نظامی نے کہا۔ آیئے غالب کے مزار پر فاتحہ پڑھ آئیں چل کر۔ اکبر نے تجاہل عارفانہ پڑھ آئیں چل کر۔ اکبر نے تجاہل عارفانہ سے پوچھا۔ کون غالب؟ ارے آپ غالب کو نہیں جانتے! خواجہ نے تعجب ظاہر کیا۔ کہنے لگے اکبر......! اچھا وہی غالب جنہوں نے یہ شعر کہا ہے:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

جسے ''جنت'' کے وجود ہی سے انکار ہے، اسے فاتحہ سے کیا ثواب پہنچے گا۔

شمس العلماء خواجہ حسن نظامی ایک واقعہ تحریر فرماتے ہیں۔ ایک دن ہم سب کھانا کھا رہے تھے۔ آلو کا سالن تھا۔ حضرت اکبر بھی شریک طعام تھے۔ حور بانو (خواجہ صاحب کی صاحبزادی) سے پوچھا۔ بھئی یہ آلو کہاں سے آئے، بڑے اچھے ہیں؟ حور بانو نے جواب دیا۔ میرے خالو بازار سے لائے ہیں۔ چند منٹ سکوت فرما کر حضرت اکبر مسکرا دیئے اور فی البدیہہ یہ شعر پڑھا:

لائے ہیں ڈھونڈھ کے بازار سے آلو اچھے
اس میں کچھ شک نہیں ہیں "حور" کے خالو اچھے

اوراس برجستہ شعر پر سب لوگ بے ساختہ ہنسنے لگے!

ایک وکیل صاحب جن کے اکبر سے بھی اچھے خاصے مراسم تھے، اپنے سنی دوستوں میں بیٹھ کر اپنی بے تعصبی کے ڈھول پیٹنے کے لیے اکثر کہا کرتے، میں شیعہ گھرانے میں پیدا ہوا ہوں۔ مگر پھر بھی شیعہ نہیں ہوں۔ ماتم، مجلس، تعزیئے اور علم وغیرہ کو نہیں اپناتا ...... اکبر مرحوم کو ان کی اس "دورنگی" سے سخت نفرت تھی، کیونکہ اپنے شیعہ ہونے سے خود انکار تھا مگر وہ اپنے سنی ہونے کا اقرار بھی نہیں کرتے تھے۔ پھر بھی اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے تھے۔ عجب تماشا تھا۔ اکبر اس کی اس دورنگی پر کہا کرتے تھے کہ یہ "مونث" اور "مذکر" کے بیچ کی "درمیانی جنس" ہیں اور یہ شعر انہیں کے متعلق کہا ہے:

مذکر کے لیے "ہی" ہے، مونث کے لیے "شی" ہے
مگر حضرت مخنث ہیں نہ ہیوں میں نہ شیوں میں

ہندوستان کے مسلمانوں کو سب سے زیادہ "تبلیغ" اور مناظرے نے تباہ کیا۔ سوامی دیانند سرسوتی نے جب "آریہ سماج" کی داغ بیل ڈالی تو جگہ جگہ آریوں اور مسلمانوں کے مناظرے ہونے لگے۔ آئے دن بڑے بڑے جلسے ہوتے، گھنٹوں تقریریں ہوتیں، مزاجوں میں گرمی پیدا ہوتی، سنجیدگی اشتعال میں بدل جاتی، نہ کوئی آریہ ان مناظروں سے متاثر ہو کر مسلمان ہوتا اور نہ کوئی مسلمان آریہ...... مگر مذہب کے نام پر یہ خانہ جنگی برابر جاری رہی اور عرصہ تک! نواب احمد حسین خاں مرحوم مذاق (تعلقدار پریانواں ضلع پرتاب گڑھ) عشرت حسین کے خسر اور اکبر مرحوم کے سمدھی تھے، بہت پڑھے لکھے راسخ العقیدہ مسلمان،

تعصّبات اور تنگ نظری کے دشمن۔ اکبر سے اکثر اسی ''مذہبی بدحالی'' پر تبادلہ خیال کیا کرتے تھے۔ اکبر نے اس قطعہ میں اسی طرف اشارہ کیا ہے:

دیکھا مناظروں کا بہت اس نے رنگ ڈھنگ
اکبر کے دل میں اب نہ رہی بحث کی امنگ
کہتے بہت صحیح تھے یہ حضرت مذاق
ایماں برائے طاعت و مذہب برائے جنگ

مسلمانوں کی ''مادی ترقیوں'' کا پرشور پروپیگنڈہ ہو رہا تھا...... اور زندگی کے ہر شعبے میں مسلمانوں کو سب سے آگے ثابت کیا جا رہا تھا۔ اسی زمانے میں ایک دن اکبر اپنے چند احباب کے ساتھ کہیں جا رہے تھے...... راستے میں شراب خانے سے چند خانہ خراب مسلمان نکلتے ہوئے نظر آئے...... اکبر نے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

دیکھا آپ نے مسلمانوں کی ترقی کا حال!......

مسجدیں چھوڑ کر جا بیٹھے ہیں میخانوں میں
واہ کیا جوش ترقی ہے مسلمانوں میں

غالباً ''الہلال'' کے دور ادارت میں مولانا ابوالکلام آزاد نے اکبر سے غزل کی فرمائش کی۔ کئی بار تقاضے کے بعد جو غزل بھیجی اس کا مقطع تھا:

ان کے پرچے کے لیے اکبر نے کہی یہ غزل
شکر ہے اترا تقاضا حضرت آزاد کا

مولانا عبد الماجد صاحب دریا آبادی تحریر فرماتے ہیں: آخر 1919ء سے میں نے مثنوی مولانا رومؒ کا والہانہ مطالعہ شروع کیا اور 1920ء و 1921ء میں کہنا چاہیے کہ یہ دھن اپنے اوپر سوار تھی اور میں مثنوی میں مست تھا۔ حضرت اکبر کی خدمت میں مثنوی کا ذکر چھیڑا۔ ایک بار پھر دوسری بار...... اور جب تیسری بار یہی نام میری زبان پر آیا تو حضرت تڑ سے بول اٹھے۔

کیوں صاحب یہ فرمایئے کہ اللہ میاں بڑے ہیں یا مولانا روم؟ میں نے کھسیانے ہو کر کہا۔ اللہ میاں.... بولے میں آپ کی گفتگو سے یہ سمجھتا تھا کہ شاید مولوی رومؒ بڑے ہیں، جب سے آپ آئے ہیں بار بار انہیں کا ذکر کر رہے ہیں۔ اللہ میاں کا نام میں نے ایک بار بھی نہ سنا۔

مولانا عبد الماجد صاحب دریا آبادی نے تحریر فرمایا ہے۔ سنہ غالباً 1918ء یا 1919ء ہے۔ اکبر لکھنؤ میں امین الدولہ پارک کے ایک بالا خانے پر مقیم تھے۔ ایک صاحب جو بی اے، ایل ایل بی ہیں اور اس وقت منصف کے عہدے پر ممتاز تھے، صاحبانہ مسلک و خیال کے ساتھ ملنے تشریف لائے۔ گفتگو کچھ عورتوں کی تعلیم و آزادی پر چلی، اکبر نے کہا۔ ہم تو اپنے زمانے میں آزاد خیالی کا امام سید احمد خان (سرسید) کو سمجھتے تھے۔ لیکن عورتوں کی آزادی انہیں بھی سخت ناپسند تھی۔ وہ صاحب جیسے بھرے بیٹھے تھے، بات کاٹ کر بولے۔ سرسید کی رائے اس معاملے میں سخت قابل ترمیم تھی۔ اکبر برجستہ بول اٹھے۔ جی کیوں نہیں ...... ایک اسی معاملے میں کیا خدا معلوم کتنے معاملوں میں ان کی رائے قابل ترمیم تھی۔ وہ خود قابل ترمیم تھے، دیکھیے نا زمانے نے انہیں کی ترمیم کر دی۔ وہ گزر گئے اور ان کی بجائے آپ کو پیدا کر دیا۔

مولانا شبلی ایک مرتبہ اکبر سے ملنے کے لیے گئے ...... جمعہ کا دن تھا، نماز کا وقت آیا تو اکبر مرحوم اور مولانا نماز جمعہ کے لیے مسجد کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ لوگ دروازے سے نکل رہے تھے اور عشرت مکان میں داخل ہو رہے تھے۔ عشرت نے یہ دیکھ کر کہ یہ لوگ نماز کے لیے جا رہے ہیں، نگاہ بچانے کی کوشش کی اور منظر خود بخود ایک دلچسپ ماحول میں تبدیل ہو گیا۔ اکبر کی جولانی طبیعت نہ رک سکی۔ ٹھہر گئے۔ عشرت کو آواز دی اور مولانا شبلی کو مخاطب فرماتے ہوئے فی البدیہہ یہ شعر سنایا۔ عشرت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔

بے نمازوں میں ہیں یہ اور اس پہ شرماتے نہیں
خیریت یہ ہے کوئی ٹوکے تو گرماتے نہیں

''بزم اکبر'' کے مصنف مولوی قمر الدین احمد صاحب بدایونی جو اکبر مرحوم کے خاص ندیم اور ہر وقت کے اٹھنے بیٹھنے والے لوگوں میں سے تھے، ایک مرتبہ سائیکل سے گر کر زخمی ہو گئے ایک ہفتے تک صاحب فراش رہے اور اکبر مرحوم کے پاس نہ پہنچ سکے۔ آٹھ دس دن کے بعد پہنچے تو اکبر نے بائیسکل کی خیریت پوچھی اور اظہار افسوس کرتے ہوئے فرمایا ...... برا ہوا، اجی مجھے خواہ کوئی قدامت پسند کہے یا قدامت پرست ...... مجھے تو عہد حاضر کی اچھی سے اچھی ایجاد میں بھی مضرت کے پہلو نظر آتے ہیں۔ خواہ وہ موٹر ہو، ہوائی جہاز یا بائیسکل۔ پھر کچھ سوچ کر کہنے لگے ...... اور یہ بائیسکل تو مجسم روگ ہے۔ (BI) بائی سے شروع ہوتا ہے پھر سک (SICK) ہوتا ہے اور پھر اِل (ILL) ہوتا ہے۔ اس طرح یہ لفظ ''بائیسکل'' بنتا ہے۔

اکبر ڈاکٹر اقبال کو ایک مخلص دوست، سنجیدہ مجدد اور اچھا مفکر تو مانتے تھے مگر ان

کے نظریات کی آنکھیں بند کر کے تقلید جائز نہیں سمجھتے تھے۔ خواجہ حسن نظامی کو ایک خط میں لکھا ہے۔ اقبال صاحب نے بہت ترقی کی ہے، ان کو ضرورت ہے، میں یہ لکھ دوں گا:

آپ کے ہاتھ میں ، میں ہاتھ نہیں دے سکتا
داد دیتا ہوں، مگر ساتھ نہیں دے سکتا

ڈاکٹر اقبال کے مشہور ترانے ''ہندوستان ہمارا'' کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ نصاب کی ہر کتاب میں یہ ترانہ جگہ پا چکا تھا اور ہر بچے کی زبان پر:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا

ہی تھا۔ کہنے لگے۔ سنتے سنتے کان پک گئے ہیں۔

اب تو کوئی ایسا نعرہ ہونا چاہیے:

کالج میں ہو چکا جب یہ امتحان ہمارا
سیکھا زباں نے کہنا ''ہندوستان ہمارا''
رقبے کو کم سمجھ کر اکبر یہ بول اٹھا
ہندوستان کیسا؟ سارا جہاں ہمارا

عزیز لکھنوی فرمایا کرتے تھے۔ ''میں شعر اپنے لیے کہتا ہوں۔'' اکبر بھی اسی خیال کے حامی تھے۔ کہتے ہیں:

نہ میرے لیے اور نہ تیرے لیے
نہ اشعار ہیں یہ صلے کے لیے
بہت خوب ہے قول ہادی عزیز
کہ میں شعر کہتا ہوں اپنے لیے

محترمی پروفیسر آغا اشہر لکھنوی بیان فرماتے ہیں کہ...... ایک مرتبہ اکبر مرحوم کے یہاں اکبر کے ''فن و آرٹ'' پر بحث ہو رہی تھی۔ ایک صاحب نے اکبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ افسوس زمانے نے آپ کی قدر نہیں کی؟ حالانکہ آپ نے زمانے، ماحول اور وقت کی جو نبض شناسی کی ہے وہ کہیں دوسری جگہ نظر نہیں آتی۔ اکبر نے ایک پر عزم مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ جی ہاں!

مری ناکامیابی کی کوئی حد ہو نہیں سکتی
تقیہ کر نہیں سکتا ، خوشامد ہو نہیں سکتی

جارج برنارڈ شا

ولادت: ۲۶/جولائی ۱۸۵۶ء (ڈبلن، آئرلینڈ)

وفات: ۲/نومبر ۱۹۵۰ء (ہارٹفورڈشائر، انگلینڈ)

مشہور مصنف جارج برنارڈ شا پُرانی کتابوں کی دُکان پر گئے تو وہاں اُنہیں اپنے ڈراموں ایک مجموعہ نظر آیا۔ ورق اُلٹے تو خود اُن کے ہاتھ سے لکھا ہوا تھا: ''جارج برنارڈ کی طرف سے بصد خلوص ---'' وہ کتاب اُنہوں نے اپنے ایک دوست کو تحفتاً دی تھی۔ برنارڈ شا نے کتاب خرید لی اور اُس پر لکھا: ''جارج برنارڈ کی طرف سے دوبارہ بصد خلوص ---'' اور کتاب اُنہی صاحب کو بھجوا دی، جنہیں پہلے پیش کی تھی۔

جارج برنارڈ شا ایک ہوٹل میں بیٹھے تھے اور ساز والے انتہائی بور میوزک بجا رہے تھے۔ جارج برنارڈ شا نے ویٹر کو بلا کر پوچھا کہ کیا یہ کوئی فرمائشی چیز بجاتے ہیں؟

ویٹر نے کہا: ''جی ہاں!''

جارج برنارڈ شا نے کہا: ''ان سے کہو کہ بغلیں بجائیں۔''

جارج برنارڈ شا ایک سیاسی جلسے سے خطاب کر رہے تھے۔ سٹیج پر گنجائش سے زیادہ لوگ چڑھ جانے کی وجہ سے سٹیج لرز رہا تھا۔ جارج برنارڈ شا بلند آواز میں پورے جوش اور ولولے سے تقریر کر رہے تھے کہ اچانک کڑاک کی آواز کے ساتھ سٹیج ٹوٹ گیا اور جارج برنارڈ شا دھڑام سے نیچے گر گئے۔ اپنے حواس قائم رکھتے ہوئے سکون سے اُٹھے اور مسکراتے ہوئے بولے: ''حاضرین! آپ نے میرے دلائل کا وزن ملاحظہ فرمایا؟''

مشہور انگریزی مزاح نگار جارج برنارڈ شا عظیم ادیب تو تھے ہی، بلا کے خود پرست بھی تھے۔ اکثر کہتے تھے کہ میرے ہر لفظ کی قیمت ایک پونڈ ہے۔ اس زمانے میں ایک پونڈ کی بڑی وقعت تھی۔ ایک صاحب نے از راہِ مذاق انہیں ایک پونڈ بھیجا اور لکھا کہ برائے مہربانی اپنا ایک لفظ بھیج دیجئے۔ جواب میں برنارڈ شا نے صرف ایک لفظ لکھا: ''شکریہ''

ایک ڈراما نگار کا ڈراما اسٹیج ہوا تو اس نے جارج برنارڈ شا کو بھی ڈرامہ دیکھنے کی دعوت دی۔ ڈرامے کے دوران سارا وقت برنارڈ شا سوئے رہے۔ جب ڈراما ختم ہوا تو ڈراما نگار نے خفگی سے کہا: ''میں ڈرامے کے بارے میں آپ کی رائے جاننے کا متمنی تھا مگر آپ سارا وقت سوئے رہے۔'' برنارڈ شا نے بڑے سکون سے جواب دیا: ''سونا بھی تو ایک طرح کی رائے ہی ہے۔''

کسی پارٹی میں برنارڈ شا کے پاس ایک سردار جی آکر بیٹھ گئے اور غیر ضروری طور پر بے تکلف ہوتے ہوئے اِدھر اُدھر کی ہانکنے لگے۔ برنارڈ شا بوریت کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پہلو بدلنے لگے لیکن سردار جی کی نان سٹاپ فضول گفتگو جاری تھی۔ آخر تنگ آکر برنارڈ شا نے سردار جی کو مخاطب کیا اور بولے: ''آپ دنیا جہاں کی بہت سی باتیں جانتے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ آپ بے حد بور انسان ہیں۔''

برطانیہ کے مشہور مزاح نگار ادیب جارج برنارڈ شا لندن کے ایک ہال میں سرمایہ داری کے خلاف تقریر کر رہے تھے۔ وہ مجمع کو سرمایہ داروں کے خلاف خوب مشتعل کر چکے تو پُرجوش لہجے میں بولے: ''ہال کے باہر جو کاریں کھڑی ہیں۔ وہ تمہارے خون پسینے کی کمائی

ہے۔ جاؤ ان کو جلا کر راکھ کر دو۔''

مشتعل ہجوم ان کاروں کی طرف دوڑا برنارڈ شا نے چلا کر کہا: ''ذرا ٹھہرو!! باہر جو نیلے رنگ کی BX221 رولز رائیس کھڑی ہے اسے مت جلانا یہ تمہارے غریب ادیب برنارڈ شاء کی ہے۔''

ہالی وڈ کی حسین وجمیل اداکارہ نے ایک فنکشن میں مشہور ڈرامہ نگار برنارڈ شا سے کہا: ''آپ مجھ سے شادی کرلیں۔''

برنارڈ شاء نے حیران ہوکر پوچھا: ''مگر میں آپ سے شادی کیوں کروں؟''

خوبصورت اداکارہ نے مٹکتے ہوئے کہا: ''ذرا سوچیے ہماری اولاد.......... جو میرا حسن اور آپ کا ذہن لے کر پیدا ہوگی وہ کیا چیز ہوگی، دُنیا ان پر رشک کرے گی۔''

برنارڈ شاء نے کچھ سوچتے ہوئے کہا: ''لیکن محترمہ اگر ہماری اولاد آپ کا ذہن اور میرا حسن (برنارڈ شا خاصے فضول صورت تھے) لے کر پیدا ہوئی تب کیا بنے گا؟''

جارج برناڈ شا کے زمانے کے مشہور موسیقار آرسٹرانگ کی بہت شہرت تھی اور برناڈ شا اس سے جلتا تھا۔ ایک دن آرسٹرانگ نے سوچا کہ برناڈ شا سے ملاقات کرنی چاہیے۔ چنانچہ وہ اس کے گھر پہنچا۔ اسے دیکھتے ہی جارج برناڈ شا نے سر پکڑ لیا اور بہانا بنانے لگا کہ میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔ آرسٹرانگ نے ہمدردی سے کہا:

''کیا میں آپ کے سر درد کو دُور کرنے کے لیے کوئی دھن سناؤں؟''

''خدا کے لیے ـــــ یہ ہرگز نہ کرنا۔ تمہاری دھن سے زیادہ سُریلا تو میرا سر درد ہے۔'' برنارڈ شا نے کہا۔

علامہ شبلی نعمانی

ولادت: ۴؍جون ۱۸۵۷ء (اعظم گڑھ)

وفات: ۱۸؍نومبر ۱۹۱۴ء (اعظم گڑھ)

علامہ شبلی نعمانی کو کاتبوں سے بڑا گلہ تھا کہ وہ ان کے الفاظ کا حلیہ اس طرح بگاڑ دیتے ہیں کہ مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ ایک بار مولانا نے خط لکھ کر نیچے اپنے دستخط کیے اور تاریخ ڈال دی۔ جسے ستم ظریف کاتب نے ''شبلی، 2، اکتوبر کو۔۔۔'' ''ستلی 2 کبوتر'' بنا دیا۔

جب مولانا شبلی نعمانی الہ آباد آئے اور حضرت اکبر الہ آبادی کو ان کی آمد کی خبر پہنچی۔ آپ نے مولانا کی دعوت کی اور قلم برداشتہ یہ اشعار لکھ کر مولانا کی خدمت میں روانہ کیے۔

آتا نہیں مجھ کو قبلہ قبلی
بس صاف یہ ہے کہ بھائی شبلی
تکلیف اٹھاؤ آج کی رات
کھانا یہیں کھاؤ آج کی رات
حاضر جو کچھ ہو دال دلیا
سمجھو اس کو پلاؤ قلیا

اس کے جواب میں مولانا شبلی نعمانی نے اشعار مندرجہ ذیل لکھ کر معذرت چاہی:

آج دعوت میں نہ جانے کا مجھے بھی ہے ملال
لیکن اسباب کچھ ایسے ہیں کہ مجبور ہوں میں

آپ کے لطف و کرم کا مجھے انکار نہیں
حلقہ در گوش ہوں ممنون ہوں مشکور ہوں میں
لیکن اب میں وہ نہیں ہوں کہ پڑا پھرتا تھا
اب تو اللہ کے افضال سے تیمور ہوں میں
دل کے بہلانے کی باتیں ہیں یہ شبلی ورنہ
جیتے جی مردہ ہوں مرحوم ہوں مغفور ہوں میں

نواب تاباں، نواب سائل کے بڑے بھائی تھے۔ بالکل انہیں کی طرح میدہ وشباب رنگ، ویسا ہی ڈیل ڈول، ناک نقشہ اور لباس مگر دونوں بھائیوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ بڑے بھائی کو چھوٹے بھائی سے نہ جانے کیا کد تھی کہ ہمیشہ بُرا بھلا ہی کہتے رہتے تھے۔ بلکہ گالیاں دینے سے نہ چوکتے تھے اور گالی بھی ایک سے ایک نئی تراشتے تھے۔ سائل بے چارے سر جھکا کر کہتے "بھائی جان آدھی مجھ پر پڑ رہی ہیں اور آدھی آپ پر" اس پر وہ اور بگڑتے اور ایسی سناتے جو دوہرائی جائیں نہ اُٹھائی جائیں۔

نواب تاباں کے مزاج کی کیفیت بیان کر کے شاہد احمد دہلوی مولانا شبلی نعمانی سے اُن کے ٹاکرا کا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ نواب تاباں بھی شاعر تھے۔ اردو میں بھی شعر کہتے تھے اور فارسی میں بھی۔ ایک دفعہ شبلی نعمانی دلّی آئے تو حکیم اجمل خان کے ہاں مہمان ہوئے۔ نواب تاباں کی تعریف غائبانہ سن چکے تھے۔ ان سے ملنے کے خواہش مند ہوئے۔ حکیم صاحب نے ایک صاحب کے ساتھ شبلی کو ان کے گھر بھیج دیا۔ نواب صاحب نے بڑے تپاک سے ان کا خیر مقدم کیا۔ عزت سے بٹھایا۔ خاطر تواضع کی۔

شبلی کی فرمائش پر اپنی غزل سنانی شروع کی۔ شبلی بھی ذرا انوکھے مزاج کے آدمی تھے، خاموش بیٹھے سنتے رہے۔ تاباں نے دیکھا مولانا ہوں ہاں بھی نہیں کرتے تو چمک کر بولے "ہاں صاحب، یہ شعر غور طلب ہے اور غزل کا اگلا شعر سنایا۔ مولانا نے فرمایا سبحان اللہ

خوب شعر کہا ہے آپ نے۔" بس پھر تاباں آئیں تو جائیں کہاں؟ بگڑ کر بولے "ابے لنگڑے، میں نے تو یہ شعر ۳ دن میں کہا اور تُو نے اسے ایک منٹ میں سمجھ لیا، بیٹا یہ شعر العجم نا باشد۔ اس کے بعد ان کی گالیوں کا پٹارہ کھل گیا اور مولانا شبلی کو اپنا پنڈا چھڑانا مشکل ہو گیا۔

ایک مرتبہ سرسید، مولانا شبلی نعمانی اور سید ممتاز علی ایک ہی کمرے میں بیٹھے تھے۔ سرسید احمد خان کا ایک بہت ضروری کاغذ گم ہو گیا وہ اسے مسلسل تلاش کر رہے تھے۔ مگر ملتا نہ تھا۔ اتفاقاً وہ کاغذ شبلی نعمانی کو مل گیا، انہوں نے مذاق مذاق میں اس پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ سرسید احمد خان نے ان کو ایسے کرتا دیکھ لیا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے فرمایا: "بڑے بوڑھوں سے سنتے آئے تھے کہ جو چیز گم ہو جائے۔ شیطان اسے اپنے ہاتھ کے نیچے دبا لیتا ہے۔ حضرت مولانا ذرا دیکھئے کہیں میرا مطلوبہ کاغذ آپ کے ہاتھ کے نیچے تو نہیں۔"

ڈاکٹر مصطفیٰ خان صاحب اسسٹنٹ سول سرجن جو اعظم گڑھ میں مولانا شبلی کے معالج تھے، جن کے چند ہی روز کے علاج سے فائدہ محسوس ہونے لگا تھا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کا اسی اثنا میں گونڈہ تبادلہ ہو گیا اور مولانا بھی ان سے علاج کرنے کے لیے گونڈہ روانہ ہو گئے۔ وہاں قاضی خادم حسین صاحب جو مولانا سیّد امیر علی شہید کی بہن کے نواسے ہیں اور جن کے نانا وہیں وکیل تھے وہ اس زمانے میں وہاں طالب علم تھے اور نوجوان تھے۔ وہ مولانا کی تصنیفات پڑھ کر ان کی زیارت کے بے حد مشتاق تھے۔ مگر ملاقات کی کوئی صورت نہ تھی۔ مولانا کے گونڈہ آنے کا حال سنا تو عقیدت مندانہ حاضر ہوئے اور شوقِ ملاقات عرض کیا۔ اس پر مولانا شبلی فرمانے لگے: "اب مجھے معلوم ہوا کہ میری یہ علالت ایک مخدوم زادے کی عنایت تھی۔"

بے خود دہلوی

ولادت: ۲۱ر مارچ ۱۸۶۳ء (بھرتپور)

وفات: ۲ر اکتوبر ۱۹۵۵ء (دہلی)

بے خود دہلوی کافی بدمزاج تھے لیکن چونکہ حضرت داغ کے جانشین تھے اس لئے سب ہی بہت احترام کرتے تھے۔ ایک بار کسی مجلس میں پہنچے تو ایک نوجوان اپنی غزل سنا رہا تھا، بے خود کی آمد پر احتراماً سب کھڑے ہو گئے اور انہیں حلقہ صدارت میں نشست دی۔ انہوں نے پوچھا: ''بھئی کیا ہو رہا تھا؟'' لوگوں نے نوجوان کی طرف اشارہ کیا اور کہا: ''یہ سائل صاحب کے فرزند ہیں، غزل سنا رہے تھے۔'' بے خود بولے: ''بھئی وہ تو میرا خواجہ تاش ہے اس اعتبار سے تم میرے بھتیجے ہوئے، اس لئے ہم بھی تمہاری غزل سنیں گے، ہاں تو میاں سناؤ!''

سائل کے بیٹے نے انتہائی ادب کے ساتھ غزل سنانی شروع کی جو بے خود نے غور سے سنی۔ مقطع سن کے پوچھا: ''میاں کس سے اصلاح لیتے ہو؟'' لڑکے نے کہا: ''اپنے بابا جان سے۔'' بے خود بولے: ''مجھ سے اصلاح لیا کرو اور اچھا کہنے لگو گے۔'' سائل کے بیٹے خاموش رہے۔ محفل برخاست ہوگئی۔ گھر جا کر بیٹے نے باپ کو یہ واقعہ سنایا تو سائل خاموش رہے۔ اگلے دن سائل نے بیٹے سے کہا تیار ہو جاؤ اور میرے ساتھ چلو، راستے سے سیر بھر مٹھائی خریدی اور بے خود کے گھر پہنچے۔ اطلاع کروائی کہ سائل آیا ہے۔ کچھ دیر میں بے خود بیٹھک میں آئے اور سائل کے ساتھ ان کے بیٹے کو دیکھ کر گویا ہوئے۔ بھئی سائل تمہارا بیٹا اچھا کہتا ہے۔ سائل نے کہا: ''اسی لئے تو لایا ہوں کہ اور اچھا کہنے لگے۔'' اور بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر بے خود کے ہاتھ میں دے دیا اور سامنے مٹھائی رکھتے ہوئے بولے: ''منہ میٹھا کر لو۔''

بے خود اور سائل کسی مشاعرہ میں یکجا نہیں ہوتے تھے، کیونکہ مسئلہ یہ ہوتا کہ سب سے آخر میں کون پڑھے۔ دونوں ہی استاد تھے اور ایک سے مرتبہ کے تھے۔ اس لئے منتظمین مشاعرہ کو پریشانی سے دور رکھنے کے لئے دونوں میں سے کوئی ایک ہی مشاعرہ میں آتا تھا۔ ایک بار کچھ لوگوں کو شرارت سوجھی اور دونوں کو بتائے بغیر ایک ساتھ مشاعرہ میں بلا لیا۔ دونوں نے بزم میں ایک دوسرے کو دیکھا، مگر پلٹ کر کوئی نہ گیا۔ خاموشی سے آکر مسند پر بیٹھ گئے۔ دوران مشاعرہ باہم کلام بھی نہ کیا۔ تمام شاعر پڑھ چکے تو ناظم مشاعرہ بھی خاموش ہو بیٹھے۔ مجمع منتظر کہ دیکھیں کیا گل کھلتا ہے۔ چند لمحہ سناٹے کے بعد بے خود نے شیروانی کی جیب سے ایک پرزہ نکالا جس پر ان کی تازہ غزل تھی۔ یہ دیکھ کر کہ بے خود ان سے پہلے پڑھنے پر آمادہ ہیں، سائل نے کہا: ''ہائیں، ہائیں، یہ کیا بدتمیزی ہے؟''

بے خود نے یہ سن کہ پرزہ جیب میں واپس رکھتے ہوئے سائل کو جواب دیا: ''تو یہ بدتمیزی تم کرلو!'' اور یوں مشاعرہ بے خود کی غزل پر تمام ہوا۔

ایک محفل میں کچھ شاعر بیخود دہلوی اور سائل دہلوی کا ذکر کر رہے تھے۔ ایک شاعر نے شعر سنائے جس میں دونوں کے تخلص نظم تھے۔ وہاں اُستاد شاعر خیام الہند حیدر دہلوی بھی موجود تھے۔ شعر سن کر کہنے لگے: ''اس شعر میں سائل اور بیخود تخلص صرف نام معلوم ہوتے ہیں۔ کمال تو یہ تھا کہ شعر میں تخلص بھی نظم ہو اور محض نام معلوم نہ ہو۔''

کسی نے کہا یہ کیسے ممکن ہے؟ حیدر نے وہیں برجستہ یہ شعر کہہ کر سب کو حیران کر دیا:

پڑا ہوں میکدے کے در پر اس انداز سے حیدرؔ
کوئی سمجھا کہ بے خود ہے کوئی سمجھا کہ سائل ہے

بابائے اُردو

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

ولادت: ۱۶ر نومبر ۱۸۷۲ء (ہاپوڑ، یوپی)

وفات: ۱۶ر اگست ۱۹۶۱ء (کراچی)

ایک دفعہ بابائے اردو مولوی عبد الحق کے ایک بے تکلف دوست نے ان سے استفسار کیا: ''مولوی صاحب! آپ خاصی عمر گزار چکے ہیں، لیکن آپ نے اب تک شادی نہیں کی، آخر اس کی کیا وجہ ہے؟'' مولوی صاحب نے یہ سنا تو مسکرا کر بولے، ''میرے بھائی! میری شادی کو تو طویل عرصہ گزر چکا ہے۔'' دوست سخت حیرت زدہ ہوا اور بولا: ''آپ کی شادی کب ہوئی، کس سے ہوئی اور کہاں ہوئی؟'' مولوی صاحب نے اپنے دوست کو کان قریب کرنے کے لیے کہا اور جب ان کا دوست جھکا تو مولوی صاحب نے منہ جھکا کر اس کے کان میں کہا: ''میری شادی اردو سے ہو چکی ہے اور اردو ہی میری دلہن ہے۔''

مولوی عبدالحق نے اپنے ایک مضمون ''آئی سی ایس'' میں ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ ایک کالا انگریز اپنے کسی دوست کے ساتھ بیٹھا تھا کہ اسکے والد کمرے میں بے تکلفانہ چلے آئے۔ ان کی دیہاتی وضع قطع ایسی تھی کہ صاحب بہادر کو اپنے دوست کے سامنے انہیں اپنا والد بتاتے ہوئے شرم آئی، لہٰذا یہ کہہ کر تعارف کروایا: ''یہ میرے والد کے ایک دوست ہیں۔'' والد محترم کو غصہ آ گیا، انہوں نے بیٹے کے دوست کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''میں ان کے والد کا نہیں، والدہ کا دوست ہوں۔''

بابائے اردو مولوی عبد الحق ریل گاڑی میں سفر کر رہے تھے کہ ڈبے میں بیٹھے ہوئے کسی مغرب زدہ شخص نے ان سے کہا: ''کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟''

مولوی عبد الحق نے جواب دیا:

''جی ہاں، پوچھ سکتے ہیں۔''

اس کے بعد دونوں خاموش ہو گئے اور بات آئی گئی ہوگئی۔ بعد میں مولوی صاحب کے کسی عقیدت مند نے ان سے دریافت کیا ''مولوی صاحب، آخر آپ نے اپنا نام انہیں کیوں نہیں بتایا تھا؟''

مولوی صاحب فرمانے لگے:

''صاحب، گفتگو کا یہ کیا انداز ہوا؟ ہماری زبان میں اس طرح نہیں کہتے، بلکہ یوں کہتے ہیں کہ ''آپ کا اسم شریف یا جناب کا نام؟''

ان صاحب نے اپنی روایات کو سمجھے بغیر انگریزی کے اس جملے کا محض لفظی ترجمہ کر دیا کہ:

"May I know your name"

اور جتنی بات انہوں نے پوچھی، میں نے اس کا جواب دے دیا۔''

جب مولائی عبد الحق اورنگ آباد سے انجمن ترقی اردو کا دفتر دہلی لے آئے تو شیخ محمد اسماعیل پانی پتی ان سے دریا گنج میں ملے اور کہا ''اگر پانی پت میں اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے کوئی جلسہ کیا جائے تو کیا آپ تشریف لے آئیں گے؟''

مولوی صاحب فرمانے لگے ''اگر جہنم میں بھی اردو کی حمایت اور نصرت میں کوئی جلسہ منعقد ہو تو میں وہاں بھی خوشی سے جانے کو موجود ہوں۔''

ایک مرتبہ مہاتما گاندھی نے اعلان کیا کہ وہ 125 برس تک زندہ رہیں گے۔ اس پر بابائے اردو مولوی عبد الحق نے انہیں ایک خط لکھا کہ میری بھی دلی دعا یہی ہے کہ آپ 125 برس تک زندہ رہیں تا کہ آپ نے اب تک جو غلطیاں کی ہیں، ان کی تلافی کے لیے مناسب وقت مل سکے۔''

اُردو ادیبوں کی ایک محفل میں مولوی عبدالحق کے پہلو میں بیٹھے ہوئے ایک صاحب کھانا کھاتے کھاتے اپنی انگلیاں چاٹنے لگے، مولوی صاحب کو اس سے بہت کوفت ہوئی، جب وہ چٹخارے لے کر انگلیاں چاٹ چکے، تو مولانا نے اپنا دستِ تعاون بڑھایا، یعنی انگلیاں ان کے منہ کے قریب لا کر کہنے لگے:

''لیجیے حضرت! اب انھیں بھی صاف کر دیجیے۔''

مولانا ظفر علی خان

ولادت: ۱۷ جنوری ۱۸۷۴ء (وزیرآباد)

وفات: ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء (لاہور)

ایک محفل میں مولانا آزاد اور مولانا ظفرعلی خان حاضر تھے۔ مولانا آزاد کو پیاس محسوس ہوئی تو ایک بزرگ جلدی سے پانی کا پیالہ لے آئے۔ مولانا آزاد نے ہنس کر ارشاد کیا:

لے کے اک پیرِ مغاں ہاتھ میں مینا، آیا

مولانا ظفرعلی خان نے برجستہ دوسرا مصرع کہا:

مے کشو! شرم، کہ اس پر بھی نہ پینا آیا

ایک بار مولانا ظفرعلی خاں کو دھن سمائی کہ اگر ہند بھر کے مسلمان ایک ایک روپیہ بھی چندے کے طور پر جمع کریں تو کروڑوں روپے جمع ہو سکتے ہیں۔ اس خطیر رقم سے خانۂ خدا کی تعمیر ہونا ممکن ہے۔ اپنے ہمراہیوں کو لے کر جب وہ ایک میراثی کے درِدولت پر گئے تو میراثی اور میراثن دروازے کی دہلیز پر کھڑے ہو گئے۔ مولانا نے عجز و انکساری کے ساتھ مقصد بیان کیا تو میراثی نے بڑے فخر سے کہا: ''مولانا! لکھ لیجیے پانچ روپے۔۔۔'' ابھی مولانا قلم کو حرکت میں لانا ہی چاہتے تھے کہ میراثن بول اٹھی۔ ''واہ میاں واہ، خانہ خدا کی تعمیر اور صرف پانچ روپے چندہ، میاں یہ تو ہم سے نہ ہوگا، ذرا زیادہ رقم دو۔''

میراثی نے منہ پھلا کر کہا۔ ’’مولانا دس روپے لکھ دو۔‘‘ پیشتر اس کے کہ مولانا قلم کو جنبش دیتے میراثن پکار اٹھی۔ ’’نا میاں! دس روپے کوئی عطیہ ہوتا ہے؟‘‘ میراثی نے جھٹ سے کہا ’’مولانا پندرہ روپے لکھ لیں۔‘‘

میراثن تڑپ کر بولی۔ ’’میاں! کیوں شرمندہ کرتے ہو، پندرہ روپے، بھلا کیا ہوتے ہیں؟‘‘

میراثی بیس سے تیس اور پھر چھلانگ لگا کر پچاس پر پہنچا۔

زچ ہو کر مولانا نے کہا: ’’دادا جتنی رقم دینا چاہتے ہو، اتنی ہی لکھوا دو۔‘‘

میراثی نے نہایت سادگی سے جواب دیا ’’مولانا غریبوں کے ہاں نمک، نہ آٹا، بھلا ہم کیا چندہ دیں گے، البتہ ہم نے یہ ثابت کر دیا کہ گنتی ہم لوگوں کو بھی آتی ہے۔‘‘

علی گڑھ یونیورسٹی میں آل انڈیا مشاعرہ تھا۔ پورے ہندوستان سے شعراء مدعو تھے۔ شعرا کا ایک جمِ غفیر یونیورسٹی پہنچا ہوا تھا۔ ان شعرا میں دو سگے بھائی ’’کاندھلے‘‘ سے بھی آئے ہوئے تھے اور یہ دونوں بھائی اتفاق سے گنجے تھے اور بہت ہی شریر قسم کے تھے۔ ان دونوں نے اپنے قہقہوں اور پھبتیوں سے پورا پنڈال سر پر اٹھایا ہوا تھا۔ مولانا ظفر علی خاں صاحب یہ سارا ماجرا بے بسی سے دیکھ رہے تھے لیکن کچھ کہتے نہ بنتی تھی۔ ادھر مشاعرہ شروع ہونے میں کچھ دیر تھی، کچھ اساتذہ کا انتظار ہو رہا تھا۔ اس مشاعرہ کا مصرع طرح ’’قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا‘‘ تھا۔ جب یہ دونوں گنجے شاعر بھائی کسی طرح صحیح نہ ہوئے تو مولانا صاحب سے رہا نہ گیا۔ مولانا صاحب اُٹھے اور مائیک پر تشریف لائے اور یوں گویا ہوئے۔

حاضرین مشاعرہ شروع ہونے میں ابھی شاید کچھ اور دیر لگے، اس لیے جب تک میں نے جو اس مصرع طرح میں گرہ لگائی ہے وہ سماعت فرمائیے۔ جب خاموشی طاری ہو گئی تو مولانا نے گرہ کا شعر پڑھا، فرمایا:

آتا ہے کاندھلے سے جو لاتا ہے ساتھ گنج
قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا

بس جناب پھر کیا تھا، پورا پنڈال قہقہوں سے گونج اٹھا اور وہ دونوں گنجے شاعر بھائی ایسے بھیگی بلّی بن کر بیٹھے کہ جیسے مشاعرے میں شریک نہ تھے۔

مولانا ظفرعلی خان ایڈیٹر زمیندار نے ایک مرتبہ لالہ نانک چند ناز کی ہنگامی اور بمعنی تُک بندی پر تبصرہ کرتے ہوئے انہیں مخلصانہ مشورہ دیا۔

توڑتا ہے شاعری کی ٹانگ کیوں، اے بے ہُنر!
شعر کہنے کا سلیقہ سیکھ میلا رام سے

مولانا ظفرعلی خان، پنڈت میلا رام وفا کو استاد شاعر تسلیم کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنے حریف کو یہ نیک مشورہ دیا تھا۔ جب ناز صاحب نے اپنا پہلا مجموعہ کلام تبصرے کے لیے پنڈت میلا رام وفا کی خدمت میں پیش کیا تو وفا صاحب نے اس پر مندرجہ ذیل تبصرہ کیا: ''ناز صاحب کی کتاب برائے تبصرہ ملی۔ کتابت اچھی نہیں، لیکن کلام سے بدرجہا بہتر ہے، جس کے پڑھنے کے بعد یہ پتا آسانی سے لگ سکتا ہے کہ تعزیراتِ ہند میں شعر کہنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔''

کانگرس سے الگ ہونے کے بعد ایک روز مولانا ظفرعلی خاں بازار میں جوتوں کی ایک دُکان پر کھڑے تھے کہ سامنے سے کانگرس کا جلوس آتا دکھائی دیا۔

مولانا نے اُسی وقت یہ شعر کہا:

کانگرس آ رہی ہے ننگے پاؤں
جی میں آتا ہے بڑھ کے دُوں جوتا

سر محمد شفیع خاں نے جب اپنی لیگ بنالی تو مولانا نے کہا:

کون کہتا ہے بیکار رہے لاہور کی لیگ
ملک سے برسرِ پیکار ہے لاہور کی لیگ

''انقلاب'' میں مولانا سالک نے ایک مرتبہ لکھا کہ یہ خلافت کی بلّیاں کیوں ہمارا کھمبا نوچنے پر آمادہ ہیں۔

مولانا نے ''زمیندار'' کے کالم ''فکاہات'' میں جواب دیا۔ جس میں یہ چبھتا ہوا فقرہ تھا۔

''کیوں حضرت! خلافت کے ابوہریرہ یعنی مولانا عبدالقادر قصوری کے متعلق کیا ارشاد ہے؟''

بچہ سقّہ کے کابل پہنچنے اور امان اللہ خاں کے بھاگنے کی خبر آئی تو مولانا نے برجستہ یہ دو شعر کہے:

گدھوں کی آج کل کابل میں ہے فراوانی
گماں ہوتا ہے یہ انسان وہاں پیدا نہیں ہوتے
ہوا کرتے ہیں پیدا رات دن سقّوں کے ہاں بچے
مگر ہر روز امان اللہ خاں پیدا نہیں ہوتے

گاندھی کی لنگوٹی کا مسلمان کے تہمد سے موازنہ کرتے ہوئے ایک بار لکھا:

تُو نے گاندھی کی لنگوٹی کا جہاں رکھ لی ہے شرم
مرے تہمد کو بھی یا رب فتح دے پتلون پر

کانگرسی ملّاؤں نے مسلم لیگ کی تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی تو مولانا نے اِن پر پھبتی کستے ہوئے لکھا:

کانگرس نے پال رکھے ہیں عرب کے چند اُونٹ
عالمِ اسلام ہے ان بے مہاروں کے خلاف

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال

ولادت: ۹ نومبر ۱۸۷۷ء (سیالکوٹ)

وفات: ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء (لاہور، پاکستان)

علامہ اقبال بچپن ہی سے بذلہ سنج اور شوخ طبیعت واقع ہوئے تھے۔ایک روز جب ان کی عمر گیارہ سال کی تھی انہیں سکول پہنچنے میں دیر ہوگئی۔ماسٹر صاحب نے پوچھا: ''اقبال تم دیر سے آئے ہو؟''

اقبال نے بے ساختہ جواب دیا:''جی ہاں، اقبال ہمیشہ دیر سے آتا ہے۔''

ایک مرتبہ علامہ اقبال اپنے استاد محترم کے ساتھ تھے ۔ آپ فرماتے ہیں کہ میرے منہ سے کبھی استاد محترم کے سامنے شعر نہ نکلا۔میں استاد محترم کے بیٹے احسان کو اٹھائے ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔احسان کافی وزنی تھا۔میں نے ستانے کے لیے احسان کو ایک دکان کے پھٹے پر کھڑا کیا، استاد محترم آگے نکل گئے کچھ دیر کے بعد مجھے نہ پاکر واپس مڑے۔ مجھے کھڑا دیکھ کر کہنے لگے:''احسان کو اٹھانے میں دشواری ہے؟''

میں نے جواب میں بے ساختہ کہہ دیا:''تیرا احسان بہت بھاری ہے۔''

میرے (فقیر سیّد وحید الدین کے) ایک قریبی رشتے دار سیّد واجد علی کو کتے پالنے کا بڑا شوق تھا۔ایک دفعہ میں اُن کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر ڈاکٹر (علامہ محمد اقبال) صاحب سے

ملنے گیا۔ موٹر میں اُن کے کتے بھی تھے۔ ہم لوگ ڈاکٹر صاحب کے پاس جا بیٹھے اور کتوں کو موٹر ہی میں چھوڑ دیا۔

تھوڑی دیر میں ڈاکٹر صاحب کی ننھی بچی منیرہ بھاگتی ہوئی آئی اور کہنے لگی:

''ابا جان! موٹر میں کتے آئے ہیں۔''

ڈاکٹر صاحب نے ہماری طرف اشارہ کر کے کہا:

''نہیں بیٹا! یہ تو آدمی ہیں۔''

علامہ اقبال کو ستار بجانے کا بہت شوق تھا۔ ایک صبح ستار بجانے میں محو تھے کہ سر ذوالفقار علی اور سردار جوگندر سنگھ تشریف لے آئے۔ ان کو ستار بجاتے دیکھ کر جوگندر سنگھ بولے:

''ہر وقت ستار کو گود میں لیے بیٹھے رہتے ہو۔''

علامہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا:

''کیا کروں "سِکھنی" جو ہوئی۔

بزرگ ناول نگار، ایم اسلم علامہ اقبال سے اپنی ارادات اور ان سے وابستہ یادوں کو تازہ کر رہے تھے، انھوں نے حاضرین کو بتایا:

''ایک دن علامہ خوش گوار موڈ میں تھے، حقے کی نلی ان کے ہاتھ میں تھی مولانا گرامی بھی موجود تھے، دونوں باری باری کش لگاتے اور علم و فضل کے موتی رولتے تھے، یکا یک گرامی صاحب نے میری جانب توجہ کی اور کہا: ''اسلم! کوئی شعر سناؤ۔''

میں نے تازہ کہا ہوا شعر سنایا، مولانا گرامی نے تعریف کی لیکن علامہ خاموش رہے، میں نے دوبارہ شعر پڑھا اور علامہ کا ردعمل دیکھنے کے لیے ان کی جانب دیکھا، علامہ نے نلی

حقے کی لبوں سے الگ کی اور کہنے لگے :

''اسلم ! نثر لکھا کرو....'' سو حاضرین وہ دن اور آج کا دن، میں علامہ کی نصیحت پر عمل پیرا ہوں نثر لکھتا ہوں اور شعر کو ہاتھ نہیں لگاتا۔

پچھلی صفوں سے کسی نے سوال کیا: ''علامہ نے آپ کی نثر دیکھی تھی ؟''

لارڈ کچز جو ایک زمانے میں ہند کا کمانڈر انچیف بھی رہ چکا تھا بڑے مشہور برطانوی جنرلوں میں سے تھا۔ پہلی عالم گیر جنگ کے زمانے میں وہ غرقاب ہوا تو جس طرح آج ہٹلر کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ وہ زندہ ہے اور دنیا کے سامنے آنے کے لیے مناسب موقع کا منتظر ہے اسی طرح کچز کے متعلق بھی افسانہ تراش لیا گیا کہ وہ ڈوبا نہیں بلکہ زندہ ہے۔ علامہ اقبال ایک روز والد بزرگوار سے باتیں کر رہے تھے اتنے میں ایک خوش فکر بزرگوار نے کہا: ''سنا ہے کچز زندہ ہو گیا ہے۔''

علامہ اقبال نے جواب دیا: ''ہاں ممکن ہے Cord Liver Oil (مچھلی کا تیل) کی صورت میں آ گیا ہو۔''

سکول کے زمانے میں اُردو کے استاد نے املا لکھواتے ہوئے ایک لفظ ''غلط'' لکھوایا تو آپ نے ''غلط'' کو 'ط' کے بجائے 'ت' سے ''غلت'' لکھ دیا۔ استاد نے جب دیکھا تو کہا: ''اقبال میاں! آپ نے لفظ غلط لکھا ہے۔''

اس پر ذہین طالب علم نے سنجیدگی سے کہا: ''ماسٹر صاحب! آپ نے یہ لفظ پڑھا ہی غلط تھا تو میں نے بھی غلط لکھ دیا۔''

استاد صاحب حیران ہوئے اور بولے: ''میں نے غلط کیسے پڑھا تھا۔''

اس پر شاگرد نے اپنے لکھے ہوئے لفظ ''غلت'' کی طرف توجہ دلائی اور عرض کیا:

''آپ نے اس کو کیا پڑھا تھا؟''

استاد صاحب نے لامحالہ ''غلت'' کو ''غلت'' ہی پڑھا تو شاگرد نے فوراً جواب دیا:

''جناب! جو آپ نے پڑھایا اور لکھوایا، وہی میں نے لکھ دیا۔''

کمسن علامہ اقبال کی یہ ظریفانہ حرکت استاد صاحب کو مسکرانے پر مجبور کر گئی۔

طالبِ علمی کے زمانے میں اقبال کے ایک استاد کافی دراز قد تھے۔ لڑکوں نے ان کا نام ''ماسٹر جھنڈا'' رکھا ہوا تھا۔ ایک دن اقبال نے ماسٹر صاحب کی ہجو میں ایک شعر کہا اور کاغذ پر لکھ کر دروازے پر چپکا دیا۔ شعر پڑھ کر ماسٹر صاحب بہت خفا ہوئے۔ یہاں تک کہ معاملہ ہیڈ ماسٹر صاحب تک پہنچ گیا۔ انہوں نے شعر کہنے پر اقبال کو ایک اٹھنی (ایک روپے کا نصف) جرمانہ کر دیا۔ ایک طالب علم کے لئے اس زمانے میں یہ خاصی رقم ہوتی تھی۔ دوسرے دن اقبال ایک روپیہ لے کر ہیڈ ماسٹر کے کمرے میں پہنچے۔ روپیہ ان کی میز پر رکھ دیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے اٹھنی واپس دینا چاہی تو اس پر اقبال فرمانے لگے: ''بقایا رہنے دیجئے، کیوں کہ ماسٹر صاحب کی شان میں ایک اور شعر موزوں ہو گیا ہے، جس کا جرمانہ پیشگی ادا کرنا چاہتا ہوں۔''

ایک دن ایک پیر صاحب علامہ اقبال سے ملنے آئے۔ اتفاقاً اُسی وقت اُن کا ایک مرید نہایت بے چین اور مضطرب، ہانپتا کانپتا آیا، اور پیر صاحب کے پیروں میں گر پڑا اور کہا: ''حضور کی آمد کی اطلاع ملی تو بھاگا بھاگا آیا ہوں حضور! میری حالت بڑی خراب ہے، دو سو روپے کا قرض دار ہو چکا ہوں۔ حضور! میرے لئے دُعا فرمائیں کہ یہ قرض ادا ہو جائے۔''

یہ کہہ کے اُس نے دو روپے نذر کئے۔ پیر صاحب نے دونوں روپے جیب میں ڈال لئے اور ہاتھ اُٹھا کر اُس کے لئے دُعا کرنے لگے۔ یہ نظارہ دیکھ کر علامہ اقبال سے رہا نہ گیا۔ آپ

نے بھی فوراً آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اور بلند آواز سے دُعا مانگنی شروع کر دی: ''خدایا! آج کل کے پیر گمراہ ہو گئے۔ انہیں ہدایت دے اور اے خدا! آج کل کے مریدوں کو بھی ہدایت دے کہ پیروں کے کہنے میں نہ آئیں۔ یاالٰہی! یہ نادان مرید کہتا ہے کہ میں دوسو روپے کا مقروض ہوں مگر اب یہ نہیں جانتا کہ دوسو کا نہیں، بلکہ دوسو دو روپے کا مقروض ہو گیا ہے۔''

اس پر پیر صاحب بہت برہم ہوئے۔ مگر علامہ اقبال بولے: ''میں تو یہ دُعا اُس وقت تک مانگے جاؤں گا، جب تک آپ یہ دو روپے مرید کو واپس نہیں دیں گے۔''

آخر تنگ آ کر پیر صاحب نے دو روپے واپس کر دیئے، اور اقبال سے جان چھڑائی۔ بعد میں مرید کو علامہ اقبال نے کہیں نوکر کرا دیا، جس سے اُس کی مالی مشکلیں آسان ہو گئیں۔

ایک مرتبہ علامہ اقبال بیمار پڑ گئے۔ معالج نے آم کھانے سے منع کر دیا۔ بہت مضطرب ہوئے۔ کہنے لگے: ''مرنا تو برحق ہے، آم نہ کھا کر مرنے سے آم کھا کر مر جانا بہتر ہے۔'' اصرار بڑھا تو حکیم نابینا نے ہر روز ایک آم کھانے کی اجازت دے دی۔

مولانا عبدالمجید سالک لکھتے ہیں: ''میں ایک دن عیادت کے لیے علامہ صاحب کی قیام گاہ پر حاضر ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ آپ کے سامنے ایک سیر کا بمبئی آم رکھا ہے اور آپ اسے کاٹنے کے لیے چھری اٹھا رہے ہیں۔ میں نے عرض کی: ''آپ نے پھر بد پرہیزی شروع کر دی۔'' فرمانے لگے: ''حکیم نابینا نے دن میں ایک آم کھانے کی اجازت دے دی ہے اور یہ آم بہر حال ایک ہی تو ہے۔''

ایک مرتبہ علامہ اقبال باہر بیٹھے تھے کہ ایک فقیر تہبند باندھے ہاتھ میں بڑی سی لٹھ لیے نمودار ہوا اور آتے ہی علامہ اقبال کی ٹانگیں دبانے لگا۔ علامہ اقبال کچھ دیر خاموشی سے پاؤں دبواتے رہے، پھر فرمایا ''کیسے آنا ہوا؟'' فقیر نے جواب دیا: ''میں اپنے پیر صاحب

کے پاس گیا تھا۔ اُنھوں نے فرمایا ہے کہ ڈاکٹر اقبال کو تمھارے علاقے کا قلندر مقرر کیا گیا ہے۔'' علامہ اقبال نے کہا: ''لیکن مجھے تو اس منصبِ قلندری کے عطا کیے جانے کی ابھی تک کوئی اطلاع نہیں ملی۔'' فقیر نے علامہ کی اس بات کو قلندری کے کوچے کی کوئی رمز جانا اور بیٹھا پاؤں دباتا رہا۔ اتنے میں چوہدری محمد حسین تشریف لے آئے اور آتے ہی سر سکندر حیات سے متعلق کوئی بات کہنا چاہتے تھے کہ علامہ اقبال نے ٹوکا اور کہا: ''چوہدری صاحب! اس سکندری کو رہنے دیجیے آج تو یہاں قلندری کی باتیں ہو رہی ہیں۔''

جن دنوں علامہ اقبال کی بینائی کمزور ہو چکی تھی۔ نصراللہ خاں جو ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۸ء روزنامہ زمیندار سے وابستہ رہ چکے تھے، آپ کو سول اینڈ ملٹری گزٹ پڑھ کر سناتے تھے۔ نصراللہ خاں کے ایک عزیز دہریہ ہو گئے تھے اور یہ اُنھیں لے کر علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے: ''میرے یہ عزیز حلقہ شیطان میں جا شامل ہوئے ہیں، آپ انہیں سمجھائیں۔'' ہنس کر فرمانے لگے: ''جس کو اللہ نہ سمجھا سکا اسے میں کیا سمجھا سکوں گا۔''

خان نیاز الدین خان جالندھر کی بستی دانش منداں کے رئیس اور علم و ادب سے شغف رکھنے والے بزرگوں میں سے تھے۔ ایک قدرِ مشترک دونوں اصحاب میں یہ بھی تھی کہ دونوں اعلیٰ نسل کے کبوتروں کے شوقین تھے۔ خان صاحب، علامہ اقبال کو جالندھر سے اعلیٰ قسم کے کبوتروں کے جوڑے بھیجتے تھے۔ اپنے بچوں سے محبت کرنے اور پرورش کرنے کا جذبہ جانوروں میں بہت ہوتا ہے لیکن ایک جوڑا اُنھوں نے ایسا بھیجا جو ان اوصاف سے بالکل عاری تھا۔ چنانچہ ایک خط میں خان صاحب کو تحریر فرماتے ہیں: ''آپ کے کبوتر بہت خوب ہیں مگر افسوس کہ زمانہ حال کی مغربی تہذیب سے بہت متاثر معلوم دیتے ہیں۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ بچوں کی پرورش سے انتہائی بیزار ہیں۔''

ایڈیٹر ''رسالہ ہمایوں''، میاں بشیر احمد بیرسٹر لکھتے ہیں: ''۱۹۱۴ء میں، میں ولایت سے بیرسٹری کرنے کے بعد آیا اور لاہور چیف کورٹ میں پریکٹس کرنے لگا۔ بار روم میں علامہ اقبال کو اکثر دیکھنے کا موقع مل جاتا تھا۔ ایک دن میاں شاہ نواز بیرسٹر (ہمایوں صاحب کے تایا زاد بھائی) جو کہ علامہ کے خاص دوستوں میں سے تھے بار روم میں اکٹھے بیٹھے خوش گپیوں میں محو تھے۔ مجھے دیکھ کر فرمانے لگے: ''آیئے مولانا بشیر!'' یہ سن کر مجھے شرم محسوس ہوئی۔ میں جب بھی علامہ اقبال سے ملتا تو وہ مسکرا کر مجھے مولانا بشیر کہہ کر پکارتے۔ آخر ایک دن مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے دبی زبان میں احتجاج کیا۔ ڈاکٹر صاحب میں کہاں کا مولانا ہوں۔ یہ سن کر مسکرائے اور فرمانے لگے: ''واہ بھئی واہ! مولانا کوئی بری بات ہے اور کیا مولاناؤں کے سر پر سینگ ہوتے ہیں۔ آخر کچھ عربی جانتے ہی ہونا۔''

ماہِ رمضان میں ایک مرتبہ پروفیسر حمید احمد خاں، ڈاکٹر سعید اللہ صدر شعبہ فلسفہ اور پروفیسر عبدالواحد، علامہ اقبال کے دولت کدے پر گئے۔ کچھ دیر بعد مدیر انقلاب مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک بھی تشریف لے آئے۔ مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ افطار کا وقت ہو گیا۔ آپ نے گھنٹی بجا کر اپنے نوکر کو بلایا اور اس نے کہا ''افطار کے لیے سنگترے، کھجوریں کچھ نمکین اور میٹھی چیزیں جو کچھ ہو سکے سب لے آؤ۔'' سالک صاحب نے عرض کی ''اُفوہ! اتنا سامان منگوانے کی کیا ضرورت ہے، کھجوریں ہی کافی ہیں۔'' علامہ اقبال نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: ''سب کچھ کہہ کر ذرا رعب تو جمالیں۔ کچھ نہ کچھ تو لائے گا۔''

آخری دنوں میں علامہ اقبال کی صحت بڑی حد تک گر چکی تھی۔ بوقتِ شب دَمے کے دورے بھی پڑنے لگے تھے۔ضعفِ قلب کے ساتھ جگر بھی بڑھ گیا تھا۔معالجوں نے آپ کو تُرش اشیاء اور چاول وغیرہ کھانے سے منع کر دیا تھا۔علامہ اقبال کو پلاؤ اور کباب بہت پسند تھے۔آپ اُنہیں اسلامی غذا کہا کرتے۔ایک دن حکیم محمد حسن قرشی سے فرمانے لگے:''میری دلی خواہش ہے کہ ایک روز میرے ہاں آپ کی دعوت ہو۔آپ میرے سامنے بیٹھ کر پلاؤ اور کباب کھائیں تا کہ اگر میں پلاؤ کھا نہیں سکتا تو کم از کم کھاتے ہوئے دیکھ لوں۔''

اکبر الٰہ آبادی نے علامہ اقبال کے لیے الٰہ آباد سے لنگڑے آموں کا پارسل بھیجا۔ علامہ اقبال نے پارسل کی رسید پر دستخط کرتے ہوئے یہ شعر بھی لکھ دیا:

اثر یہ تیرے اعجاز مسیحائی کا ہے اکبرؔ
الٰہ آباد سے لنگڑا چلا، لاہور تک آیا

ایک دفعہ علامہ قبال سے سوال کیا گیا کہ''عقل کی انتہا کیا ہے؟''

جواب دیا:''حیرت''

پھر سوال ہوا:''عشق کی انتہا کیا ہے؟''

فرمایا:''عشق کی کوئی انتہا نہیں''

سوال کرنے والے نے پوچھا:''تو آپ نے کیسے کہا، ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں۔''

علامہ قبال نے مسکرا کر جواب دیا:''دوسرا مصرعہ بھی تو پڑھیے جس میں اپنی حماقت کا اعتراف کیا ہے:''میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں!''

مولانا گرامی اور علامہ محمد اقبال کی رفاقت مثالی تھی۔ علامہ صاحب اُنہیں جالندھر سے بطورِ خاص بلواتے اور بہت دنوں تک اپنے پاس رکھتے۔ ایک دفعہ اُنہوں نے علی بخش کو جالندھر بھیجا کہ جا کر اُنہیں کسی نہ کسی طرح لے آئے۔ علی بخش گیا اور علامہ صاحب کی طرف سے سلام و پیام دے کر کہنے لگا: "مولوی صاحب! آپ کل صبح میرے ساتھ چلے چلیے۔"

مولانا نے کہا: "ہاں ہاں ضرور چلیں گے۔ کیوں نہ چلیں گے۔ ڈاکٹر ہمارا دوست ہے۔ اپنے دوست کے ہاں کیوں نہ چلیں گے۔"

مولانا ایک خاص مزاج کے آدمی تھے۔ ہر وقت فکرِ سخن میں غرق رہتے اور اُنھیں بالکل احساس نہ ہوتا کہ کہاں جانا ہے اور کب جانا ہے۔ پروگرام بناتے، پھر بھول جاتے۔ سامان بندھواتے، پھر ذہنی رَو کہیں اَور چلی جاتی۔ اُنھیں جالندھر سے لاہور لانا ایک مشکل مرحلہ تھا، جسے عام طور پر علی بخش طے کر لیتا۔

پروگرام کے مطابق دوسرے دن بستر بندھوایا۔ جانے کی تیاریاں ہونے لگیں، پھر خدا جانے کیا خیال آیا، بستر کھلوایا اور ارادہ ملتوی کر دیا۔ اب علی بخش جزبز ہو رہا ہے اور وہ اُسے سمجھا رہے ہیں: "فکر نہ کرو، کل چلیں گے۔"

تیسرا دن آیا، پھر بستر بندھ گیا۔ تانگا منگا لیا۔ تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ اندر گئے باہر آئے۔ باہر گئے، اندر آئے۔ بیگم سے باتیں کیں۔ کچھ ضروری چیزیں ٹرنک میں ٹھونسیں۔ کوئی گھنٹے بھر بعد باہر نکلے۔ گرمی کا موسم تھا۔ تانگے کی نشست تپ گئی تھی۔ علی بخش اگلی نشست پر بیٹھا۔ مولانا پچھلی نشست پر بیٹھے ہی تھے کہ بے چین ہو کر اٹھے اور کہا: "ارے تانگا بہت گرم ہے۔"

یہ کہا اور نیچے اُتر گئے۔ علی بخش سے کہا: "ڈاکٹر سے کہہ دینا تانگا گرم ہو گیا تھا، اب سردیوں میں آئیں گے۔"

اب علی بخش اپنا سر پیٹنے کے علاوہ اَور کیا کر سکتا تھا۔

ایک دفعہ مولانا گرامی علامہ اقبال کے مہمان تھے۔ ایک روز علی بخش سے کہا: ''علی بخش! آج کل گوبھی نہیں ملتی؟''

عرض کیا: ''حضرت بہت ملتی ہے۔''

حکم دیا: ''شام کو گوبھی ضرور پکانا۔''

شام کو جب گوبھی پک کر سامنے آئی تو پوچھنے لگے: ''یہ کیا ہے؟''

کہا گیا: ''گوبھی۔''

بگڑ کر کہنے لگے: ''صبح بھی گوبھی۔ شام بھی گوبھی۔ دن بھی گوبھی۔ رات بھی گوبھی۔ بڑھے آدمی کو بادی سے مار ڈالو گے کیا؟''

علی بخش نے کہا: ''آپ نے ہی تو حکم دیا تھا۔''

علامہ صاحب نے علی بخش سے کہا: ''تم چپ رہو، صبح گوبھی کی فرمائش کرنے کے بعد مولانا گرامی اب تک اپنے تصور میں خدا جانے کتنی دفعہ گوبھی کھا چکے ہیں۔ تم بھی سچے ہو یہ بھی سچے ہیں۔''

اقبال کا دوسرا سفر ولایت تھا۔ ان کا جہاز تازہ پانی اور غذائی اجناس لینے کے لئے عدن (یمن) کی بندر گاہ پر ٹھہرا ہوا تھا۔ اس زمانے میں پختہ بندر گاہ نہ تھی اس لئے جہاز ساحل سے کچھ دُور لنگر انداز تھا۔ ایک شام اقبال عرشہ پر آ بیٹھے اور ایک کتاب کا مطالعہ کرنے لگے۔ تھوڑی دیر میں نیچے سمندر کی طرف سے کچھ شور سنائی دیا۔ اقبال کتاب ہاتھ میں لئے جنگلے پر آ کھڑے ہوئے۔ نیچے عرب بچے پانی میں تماشے دکھا رہے تھے۔ لوگ جہاز پر سے سکے نیچے پھینکتے اور کوئی بچہ پانی میں غوطہ لگاتا اور سکہ اٹھا لاتا اور جہاز پر کھڑے تماشبینوں کو فخر سے دکھاتا۔ اقبال بھی اس منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اب یا تو وہ بھی جیب سے سکہ نکالنا چاہ رہے تھے یا کسی کا دھکا لگا تو ان کے ہاتھ سے کتاب پانی میں گر گئی۔ نیچے عرب بچوں کی سمجھ میں نہ آیا کہ سکہ کے جگہ کیا پھینکا گیا ہے۔ اقبال بھی ایسی عربی نہیں جانتے تھے کہ

ان عرب بچوں کو بتا سکیں کہ سکہ نہیں کتاب ہے۔ بس یہی کہہ سکے:

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيهِ

بے شک یہ کتاب ہے!

ایک آدمی کی رنگت بالکل سیاہ تھی اور اوپر سے کپڑے بھی سیاہ پہنے ہوئے تھا۔ علامہ صاحب نے جب دیکھا تو کہنے لگے: ''کیوں بھئی! آج ننگے ہی چلے آئے!!!''

ایک کشمیری خاندان کا فرد دوسرے خاندان میں شادی کرنا چاہتا تھا کہ ڈاکٹر اقبال نے منع فرما دیا۔ اس پر ایک طالب علم نے اعتراض کیا کہ اقبال تو ہمیشہ ذات پات کی تمیز کو مٹانے کی تلقین فرماتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ہنس کر کہا: ''یہ بالکل درست ہے لیکن میرا مقصد تھا کہ یہ صاحب وہاں شادی کریں گے تو اس کی اولاد کالی کلوٹی ہوگی۔ میری خواہش ہے کہ مسلمانوں کے بچے بھی خوبصورت اور سرخ وسفید ہوں تا کہ ہم صحیح معنوں میں ''ملت بیضا بن جائیں۔''

چوہدری صاحب نے انیس کنال زمین پر عالی شان کوٹھی تعمیر کرائی۔

جب سار کام مکمل ہو گیا تو انہوں نے ڈاکٹر علامہ محمد اقبال سے مشورہ کیا: ''اس شاندار کوٹھی کا کیا نام رکھا جائے؟'' علامہ اقبال نے برجستہ کہا: ''دیو محل''

علامہ اقبال، چوہدری شہاب الدین سے ہمیشہ مذاق کرتے تھے۔ چوہدری

صاحب سیاہ فام تھے، ایک دن علامہ اقبال ان سے ملنے ان کے گھر گئے، انہیں بتایا گیا کہ وہ باتھ روم میں نہا رہے ہیں۔ علامہ اقبال کچھ دیر انتظار میں بیٹھے رہے، جب چوہدری صاحب باہر آئے تو علامہ اقبال نے فرمایا: ''آپ پہلے بتائیے کہ آپ کون سا صابن استعمال کرتے ہیں؟''

چوہدری صاحب نے کہا: ''یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''نالی میں بہت سا کالا پانی بہہ رہا تھا۔ بہت کارگر صابن معلوم ہوتا ہے۔''

ایک دفعہ علی گڑھ میں مشاعرہ ہو رہا تھا اہل ذوق دور دور سے مشاعرے میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے، علامہ اقبال بھی موجود تھے، مشاعرے کے اختتام پر علی گڑھ کے چند مقامی شعراء نے علامہ کو پریشان کرنے کی ٹھانی، انہوں نے ایک مصرعہ منتخب کر کے علامہ کو اس پر گرہ لگانے کے لیے کہا۔

مچھلیاں دشت میں پیدا ہوں، ہرن پانی میں

علامہ اقبال ایسے بکھیڑوں سے پرہیز کرتے رہے، تاہم لوگوں کے بے حد اصرار پر یہ مصرعہ لگا کر شعر مکمل کر دیا ؎

اشک سے دشت بھریں آہ سے سوکھیں دریا
مچھلیاں دشت میں پیدا ہوں ہرن پانی میں

اقبال مولوی سید میر حسن سے ابتدائی کتابیں پڑھتے تھے بچپن تھا۔ بٹیر پال رکھی تھی اسے ہاتھ میں پکڑے رہتے اور پڑھتے رہتے۔ مولوی صاحب نے کہا:

''کمبخت اس میں تجھے کیا مزہ ملتا ہے۔ اقبال نے کہا حضرت ذرا پکڑ کر تو دیکھئے۔

اقبال سیالکوٹ کے مشن اسکول میں پڑھتے تھے، مولوی میر حسن کے گھر کا سودا سلف لانا اپنے

لئے باعث عزت سمجھتے تھے۔ مولوی صاحب نے ایک بار دیکھا تو اشارۃً منع کر دیا۔ لیکن سعادت مندی کی وجہ سے اقبال سودا پھر بھی لاتے رہے ایک روز مولوی صاحب نے سودا لاتے دیکھا تو ناراض ہوئے فرمایا: ''اقبال میں نے تم سے کتنی بار کہا ہے کہ تم میرے گھر کا سودا سلف نہ لایا کرو۔ تم میرے شاگرد ہو نوکر نہیں ہو۔''

اقبال نے سر جھکا کر عرض کیا: ''جناب میں آپ کا شاگرد نوکر ہوں۔''

اقبال جب یورپ گئے تو وہاں تمام مشرق خصوصاً ہندوستان کے بارے میں جادو، درندوں اور سانپوں کی بہتات کے بارے میں عجیب و غریب قصے اور افسانے مشہور تھے۔ ایک مجلس میں ایک تیز و طرار خاتون اقبال سے پوچھنے لگیں: ''کیوں مسٹر کیا آپ کے پلنگ کے نیچے بھی ہر روز صبح کے وقت ایک کوڑیالہ سانپ ہوتا تھا۔''

اقبال نہایت سنجیدگی سے بولے ''نہیں محترمہ ہر روز نہیں ہر تیسرے دن۔''

اقبال کی مداح اور دوست، عطیہ فیضی نے جو خود بھی کم ذہین اور حاضر جواب نہیں تھیں ''اقبال'' کے بارے میں لکھا ہے:

''اقبال بہت حاضر جواب ہیں حاضرین پر مزاحیہ فقرے کسنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں زندہ دلی سے بہت دلچسپ باتیں کرتے ہیں۔ اگرچہ بسا اوقات ان کے مذاق میں طنز کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ 15 اپریل اور 22 جون 1907ء کی دعوتوں میں انہوں نے بہت زندہ دلی کا مظاہرہ کیا۔ پارٹی کے افراد پر فی البدیہہ مزاحیہ شعر کسے۔ جب میں نے ان اشعار کو قلم بند کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے یہ کہہ کر روک دیا۔ یہ وقتی نوعیت کے ہیں۔''

29 جون 1907ء کو میں نے اقبال کو ایک فیشن ایبل پارٹی میں دیکھا وہاں یہ لطیفہ ہوا کہ پر لطف گفتگو جاری تھی کہ ایک بر خود غلط ہندوستانی خاتون مس دسرجنی داس بنی ٹھنی

نہایت بھڑک دار کپڑوں میں ملبوس اور قیمتی زیورات اور ہیروں میں لدی پھندی کمرے میں در آئیں اور ساری محفل کو نظر انداز کرتی ہوئی سیدھی اقبال کے پاس پہنچیں اور ان کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر کہا: ''میں صرف آپ سے ملنے کے لئے آئی ہوں۔''

اقبال نے برجستہ کہا: ''محترمہ یہ صدمہ اس قدر فوری اور اچانک ہے کہ مجھے تعجب ہو گا اگر میں اس حادثہ سے جانبر ہو سکا۔''

اقبال کے اس فقرے سے سب بے انتہا محظوظ ہوئے۔

عطیہ فیضی نے ہائیڈل برگ جرمنی میں علامہ کی حاضر جوابی اور خوش طبعی کے دو دلچسپ واقعات لکھے ہیں:

''25 اگست 1908ء کو ہم لوگ باغ فردوس کی سیر کے لئے گئے۔ اس باغ میں کسی بادشاہ نے تمام ممالک کی عبادت گاہیں جن میں ایک مسجد بھی تھی تعمیر کی تھیں جس عمارت کو مسجد بتایا جاتا تھا وہ بہت دل کش اور شاندار تھی۔ اس پر ہر جگہ لفظ ''اللہ'' عربی میں کندہ تھا اور قرآن کی مختلف سورتوں کی آیات بھی کھدی ہوئی تھیں۔ ہر شخص یہ جاننے کے لئے بے چین تھا کہ ان تحریروں کا مطلب کیا ہے۔ چونکہ سب کو معلوم تھا کہ اقبال عربی جانتے ہیں اس لئے ان سے کہا گیا کہ وہ پڑھ کر بتائیں کہ اس جگہ کی تاریخ کیا ہے اقبال نہایت سنجیدگی سے آگے بڑھے کچھ دیر نظر جمائے پڑھتے رہے پھر بولے ''میں بتاتا ہوں کہ اصل قصہ کیا ہے ہوا یوں کہ جس بادشاہ نے یہ جگہ تعمیر کی تھی اُسے اتفاق سے ایک حور مل گئی وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ حور نے کہا میں ملکہ بننے کو تیار ہوں شرط یہ ہے کہ آپ مسلمان ہو جائیں اور ایک مسجد تعمیر کریں جہاں ہمارا نکاح پڑھایا جائے گا۔ بادشاہ نے شرط منظور کر لی۔ مسجد تعمیر کروائی یہیں ان کا نکاح پڑھوایا گیا تھا۔''

عطیہ لکھتی ہیں ''ہم ہندوستانی تو خوب ہنسے لیکن دوسرے حیرت زدہ رہے کہ یہ مذاق ہے یا امرِ واقعہ۔''

عطیہ بیگم نے جرمنی کے ایک اور واقعہ کا بھی ذکر کیا ہے ایک دن اقبال کی خوش شکل اور ذہین جرمن پروفیسریں جیمنزیم (ورزش گاہ) میں ورزش میں مصروف تھیں۔ ورزشی

ضرورت کے تحت فرالائن ویگے ناست عطیہ فیضی کو اپنے بازؤں میں لئے ہوئے تھیں۔ اتنے میں اقبال آ گئے اور آ کر ان خواتین کے سامنے کھڑے ہو گئے حیرت سے بت کی طرح ساکت ہو گئے جب پوچھا گیا کہ اس طرح کیا دیکھ رہے ہیں تو انہوں نے برجستہ جواب دیا:

''میں یکایک ماہر علم نجوم بن گیا ہوں اس لئے تاروں کے اس جھرمٹ کا مطالعہ کر رہا ہوں۔''

عطیہ فیضی مزید لکھتی ہیں:

''اسی رات کو رات کے کھانے پر ہمارے یہاں ایک مہمان خاتون آئیں جن کے بال بہت خوبصورت اور سنہری تھے اور چونکہ وہ بہت نوعمر تھیں اس لئے ان کے رخساروں پر نرم نرم سنہری روئیں زیادہ نمایاں تھے اقبال نے مجھے مخاطب کر کے اردو کا شعر پڑھا:

اس کے عارض پر سنہری بال ہیں
ہو طلائی استرا اس کے لئے

بذلہ سنجی کے اس دلچسپ مظاہرہ پر میں کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

علی بہادر حبیب اللہ یورپ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے واپس لوٹے تو علامہ اقبال سے ملنے کے لئے ان کی کوٹھی پر تشریف لائے۔ آپ نے چھوٹتے ہی کہا: ''کیوں بھئی ولایت ہو آئے؟'' اس کے جواب میں انہوں نے فخریہ انداز میں کہا میں تو آٹھ سال کی عمر میں ہی انگلینڈ چلا گیا تھا یہ سن کر علامہ مسکرائے اور کہا تو پھر یوں کہیے نا کہ میموں کے سائے میں ہم پل کر جوان ہوئے ہیں۔

جب جوانی تھی تو علامہ عملی مذاق کرنے سے بھی باز نہیں آتے تھے اس طرح کا ایک دلچسپ مذاق علامہ کے پرانے دوست اور ہم نشین مرزا جلال الدین کا بیان کیا ہوا

ملفوظات اقبال میں درج ہے لکھتے ہیں:

''ایک مرتبہ ہم مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے لکھنؤ گئے۔ اجلاس کے دنوں میں ایک شام ہم فارغ تھے اقبال جب بور ہونے لگے تو مجھ سے کہا چلو کہیں چل کے گھڑی دو گھڑی گانا ہی سن آئیں۔ میں پہلے تو آمادہ ہو گیا مگر بعد کو کسی اچانک کام کی وجہ سے رک گیا وہ چل کھڑے ہوئے کوئی گھنٹہ بھر بعد جب واپس لوٹے تو مسکرا رہے تھے کہنے لگے لو آج تمہیں تماشا دکھائیں میں نے حیرت سے پوچھا آخر ہوا کیا؟ ہونا کیا تھا بس آج مولوی صاحب کو ہم نے پکڑ لیا جس مغنیہ کے ہاں ہم گانا سننے کے لئے گئے تھے وہیں کانفرنس کے مندوبین میں سے ایک مولوی صاحب گانے سے جی بہلانے تشریف لے گئے تھے لیکن جب رخصت ہوئے تو گھبراہٹ میں کانفرنس کا دعوت نامہ وہیں چھوڑ آئے۔ اب جو ہم پہنچے تو اس طوائف نے ازرہ ہمدردی وہ دعوت نامہ ہمارے سپرد کیا اور تاکید سے کہا جس طرح بھی مولوی صاحب قبلہ کو تلاش کر کے ان کی امانت بحفاظت ان کے پاس پہنچا دیں۔ ہم نے حامی بھر لی اب ہم نے سوچا ہے کہ یہ دعوت نامہ ہم کانفرنس کے صدر نواب وقار الملک، صدر ایجوکیشنل کانفرنس ہی کی معرفت کیوں نہ پہنچائیں تاکہ ضابطہ کی پابندی بھی ملحوظ رہے اور نواب صاحب بھی دیکھ لیں کہ دنیا بھلی سے بھلی ہے اتنا کہہ کر اقبال نے کاغذ کا تختہ نکالا اور قلم لے کر نواب صاحب کو طوائف کی طرف سے ایک مفصل خط لکھ ڈالا اس میں شام کے واقعہ کی تمام تفصیل بے کم و کاست بیان کرنے کے بعد لکھا چونکہ بندی قبلہ مولوی صاحب کے پتے سے واقف نہیں اس لئے آپ سے التماس کرتی ہے کہ ان کا کھوج لگا کر ان کے کاغذات ان تک پہنچا دیں۔ اس خط کی بھنک مولوی صاحب کے کان میں پڑ گئی۔ وہ ہانپتے کانپتے اقبال کے پاس آئے اور بے طرح خوشامد کرنے لگے۔ اپنی عزت و آبرو کا واسطہ دیا معافی مانگی پھر اقبال تو گویا اسی وقت کے منتظر تھے۔ ''اب آتے ہو تو جاتے کہاں ہو'' کے مصداق انہوں نے ان حضرت کو وہ رگیدا کہ بس اللہ دے اور بندہ لے اس غریب نے ناک سے نہ جانے کتنی لکیریں کھینچیں تب کہیں جان چھوٹی۔''

یاد رہے کہ یہ باتیں اس وقت کی ہیں ''جبکہ آتش جواں تھا۔''

علامہ کی طبیعت کی شگفتگی زندگی کے آخری دور میں بھی باقی رہی 1922ء میں علامہ انارکلی والے بالاخانہ کو چھوڑ کر میکلوڈ روڈ پر ایک نہایت بوسیدہ سی کوٹھی میں منتقل ہو گئے تھے عبدالمجید سالک ملنے آئے تو عرض کیا ''حضرت کیا لاہور میں اس سے بہتر کوٹھی نہیں ملتی تھی؟ فرمانے لگے جی ہاں یہ تو صرف میری دعاؤں کے سہارے کھڑی ہے ورنہ اس میں قائم رہنے کی کوئی بات نہیں۔''

لندن میں گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے بعد واپسی اٹلی میں قیام پذیر تھے غالباً روم کا قصہ ہے وہاں کسی عورت نے جو اسلامی فن تعمیر کی دلدادہ تھی ایک مصنوعی جنت بنائی تھی۔ اس نے علامہ کو بھی اس جنت کی سیر کرائی پھر سیر کرانے کے بعد ان سے اپنی خودساختہ جنت کے متعلق رائے لی علامہ نے مسکرا کر کہا: ''جنت بھی ہے اور حور بھی کسر صرف ایک مردِ مومن کی ہے۔''

مئی 35ء میں والدہ جاوید کے انتقال کے بعد علامہ بجھ کے رہ گئے تھے مختلف عوارض نے بھی ستا رکھا تھا۔ لیکن طبیعت کی فطری شگفتگی گل کھلاتی رہتی تھی عبدالرشید طارق نے ملفوظات اقبال میں لکھا ہے:

''باتوں باتوں میں بات جنس کے موضوع کی طرف جانکلی علامہ مسکرائے اور کہا جب عورتیں میری شاعری پڑھتی ہیں تو وہ خیال کرتی ہیں کہ میں نوجوان ہوں جاوید کی ماں کے انتقال کے بعد مجھے شادی کرنے کے کئی پیغام موصول ہوئے حال ہی میں ایک خط ایک ذہین اور تعلیم یافتہ لڑکی کی طرف سے آیا ہے جس میں اُس نے لکھا ہے کہ وہ میری شاعری سے

کافی لطف اندوز ہوتی ہے اور مجھ سے شادی کرنے کی خواہش مند ہے میں نے اُسے جواب میں لکھا ''تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ تم میری شاعری سے لطف اندوز ہوتی رہو اور شادی کا خیال چھوڑ دو۔''

عبدالرشید طارق کا بیان ہے کہ یہ واقعہ بیان کر کے علامہ خوب زور سے ہنسے حاضرین بھی محظوظ ہوئے۔

علامہ نے ایک بار دوسری بیگم (سردار بیگم) کی فرمائش پر جاوید کو بکری کے بچے سے کھیلتے دیکھ کر چند مزاحیہ اشعار پنجابی میں فی البدیہہ کہے بانگ درا کے آخر میں علامہ کا ظریفانہ کلام بھی شامل ہے۔

خواجہ حسن نظامی نے ایک مرتبہ اپنے اخبار ''منادی'' میں لکھا کہ میں علامہ اقبال کو ہندوستان کا عظیم شاعر نہیں سمجھتا۔ انہیں دنوں علامہ اقبال کے گھٹنوں میں درد ہو گیا، خواجہ صاحب نے انہیں اپنا روغن فاسفورس بھیجا جس سے انہیں افاقہ ہوگیا۔ انہوں نے خواجہ صاحب کو خط لکھا کہ ''مجھے آپ کے روغن سے افاقہ ہوا ہے۔'' خواجہ حسن نظامی نے وہ خط اپنے اخبار ''منادی'' میں شائع کر دیا کہ اس تیل کے متعلق شاعر اعظم ڈاکٹر اقبال کی کیا رائے ہے۔

علامہ اقبال نے ''منادی'' اخبار پڑھ کر کہا کہ
''شکر ہے خواجہ صاحب کے روغنِ فاسفورس نے مجھے شاعر اعظم تو بنا دیا۔''

علامہ اقبال تمام عمر اسلام کی شان اور مسلمانوں کے بارے میں شاعری کرتے

رہے۔ لیکن اسلامی رواج کے مطابق داڑھی نہیں رکھتے تھے۔ ایک مولانا اپنے ایک مقدمے میں مشورے کے لیے اس کے پاس آتے رہتے تھے۔ وہ اپنی بہن کو جائیداد کے حصے سے محروم کرنا چاہتے تھے۔ علامہ کو اس مقدمہ میں کوئی دلچسپی نہ تھی، لیکن مولانا پھر بھی کسی نہ کسی سلسلے میں مشورہ کے لیے آدھمکتے اور ساتھ ہی اقبال کو نصیحت بھی کرتے رہتے کہ مسلمان ہونے کے ناطے انہیں کیا کیا فرائض انجام دینے چاہئیں۔ ایک دن بولے کہ آپ عالم دین ہیں اور شریعت کے حامی، لیکن آپ داڑھی نہیں رکھتے جو اسلامی شعار ہے اور میں نے عہد کیا ہے کہ آپ کے ساتھ ایک معاہدہ کروں یہ بجا ہے کہ مسلمان کی منہ پر داڑھی نہ ہونا غلط ہے، لیکن اسلام کے مطابق بہن کو وراثت سے محروم کرنا بھی تو شریعت کے خلاف ہے۔ لایئے ہاتھ میں داڑھی بڑھا لیتا ہوں، آپ اپنی بہن کو وراثت میں حصے دے دیجیے۔ یہ سن کر نہ تو مولانا کا ہاتھ آگے بڑھا، نہ علامہ اقبال کی داڑھی ہی بڑھی۔

خلافت تحریک کے زمانے میں مولانا محمد علی اقبال کے پاس آئے اور تنقید کرتے ہوئے بولے۔ ''ظالم تم نے لوگوں کو گرما کر ان کی زندگی میں ہیجان برپا کر دیا ہے۔ خود کسی کام میں حصہ نہیں لیتے۔ اس پر اقبال نے جواب دیا تم بالکل بے سمجھ ہو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں تو قوم کا قوال ہوں۔ اگر قوال خود وجد میں آکر جھومنے لگے تو قوالی ہی ختم ہو جائے گی۔

لاہور کے میکلوڈ روڈ والی جس کوٹھی میں علامہ رہائش پذیر تھے۔ اس کے پچھواڑے میں ایک میدان تھا۔ جس میں اکثر پانی بھرا رہتا اور مینڈک ٹراٹرا کر ساری رات سونا حرام کر دیتے۔ جاوید اقبال کی والدہ نے علامہ سے اس کی شکایت کی تو آپ ہنس پڑے اور بولے: ''یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ لوگ شب بیداری کے لیے کیا کیا جتن کرتے ہیں لیکن

آپ کے لیے قدرت نے خود ہی انتظام کر دیا ہے۔ اس لیے مینڈکوں کو برا بھلا کہنے کی بجائے اللہ اللہ کیجیے۔

نوجوانی کے ایام میں علامہ اقبال دوسروں پر چوٹیں کرنے میں مشہور تھے۔ موچی دروازے میں ایک حکیم صاحب رہتے تھے مگر ہاتھ میں شفا نہ تھی۔ علامہ اقبال نے ان کے متعلق یہ شعر لکھا:

موچی دروازے میں ہیں فخر اطبائے زماں
ان سے امید شفا لیکن خیال خام ہے

ایک مرتبہ منشی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار نے اقبال کی ایک نظم اپنے اخبار میں چھاپنے سے انکار کر دیا۔ اس پر انہوں نے کہا:

آج کل لوگوں میں ہے انکار کی عادت بہت
نام محبوبان عالم کا یونہی بدنام ہے

مشہور ہے کہ ایک لالہ جی کو علامہ اقبال سے شکایت تھی کہ انہوں نے جگہ جگہ لفظ 'لالہ' کا استعمال کیا ہے اور ایک جگہ پر تو انہوں نہ حد ہی کر دی ہے جہاں پر انہوں نے یہ مصرعہ کہا ہے:

عروس لالہ مناسب نہیں مجھ سے حجاب

مولانا عبدالمجید سالک لکھتے ہیں کہ ایک دن تیسرے پہر میں ڈاکٹر اقبال کے گھر گیا۔ باہر مولانا گرامی بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ آٹھ دس سنگترے پڑے تھے۔ میں نے کہا: ''مولانا سنگترے منگوائے ہیں؟'' کہنے لگے: ''ہاں، ابھی علی بخش لے آیا ہے۔''

مجھے شرارت سوجھی تو میں نے کہا: ''مولانا یہ تو کھٹے معلوم ہوتے ہیں۔''

کہنے لگے: اچھا آپ کہتے ہیں تو ضرور کھٹے ہوں گے۔ یہ علی بخش بڑا ہی احمق ہے اسے کیا معلوم سنگترہ کس کو کہتے ہیں۔ جو کچھ کسی نے دے دیا اُٹھا کر لے آیا۔ اس کے بعد علی بخش کو بلا کر کہا: ''یہ کھٹے سنگترے کیوں اُٹھا لائے ہو؟''

علی بخش نے جواب دیا: ''مولوی صاحب میٹھے ہیں۔''

اس پر بگڑ کر بولے: ''سالک جیسا معتبر آدمی تو کہہ رہا ہے کھٹے ہیں اور یہ میٹھے بتا رہا ہے۔''

علی بخش سمجھ گیا۔ ایک طرف ہو کر میرے آگے ہاتھ جوڑے۔ میں نے سنگتروں کو ٹٹول کر دیا اور کہا: ''مولانا غلطی ہوگئی یہ تو ناگپوری ہیں ضرور میٹھے ہوں گے۔''

یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے: ''ہاں ضرور میٹھے ہوں گے۔ میں تو پہلے ہی جانتا تھا۔ سارے ہندوستان میں علی بخش جیسا سنگترہ فہم آدمی موجود نہیں۔''

ایک دفعہ افغانستان کے ایک جنرل لاہور آئے تو علامہ اقبال سے ملاقات کے دوران کہنے لگے: 'میں آپ کو دیکھ کر بہت حیران ہوا ہوں کیا آپ اقبال ہیں؟ میرا خیال تھا کہ آپ لمبی داڑھی والے بزرگ ہوں گے۔''

علامہ اقبال نے جواب دیا: ''آپ سے زیادہ حیرت تو مجھے ہو رہی ہے کیوں کہ میرا خیال تھا آپ جرنیل ہیں ضرور دیوہیکل ہوں گے مگر میں تو دیکھ رہا ہوں کہ آپ انتہائی دُبلے پتلے ہیں۔''

علامہ اقبال سے ان کے ایک دوست نے کہا: ''آپ کی نظم پر ایک صاحب سخت تنقید کر رہے تھے۔ اقبال نے پوچھا ''کیا وہ شاعر ہیں'' دوست نے جواب دیا ''نہیں'' اقبال نے سنجیدگی سے کہا ''جو لوگ کچھ کرتے ہیں، وہ اکثر خاموش رہتے ہیں۔ لیکن جو کچھ نہیں کرتے وہ صرف تنقید کرتے ہیں۔''

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں: ''ایک مرتبہ علامہ اقبال بیمار تھے۔ کچھ دنوں کے بعد بیماری سے کچھ افاقہ ہوا مگر برابر ہائے ہائے کرتے رہے۔ منشی طاہر الدین وہاں موجود تھے، انہوں نے دریافت کیا: ''خیر تو ہے۔''

جواب میں علامہ اقبال کہنے لگے: ''ہاں، میں ذرا بیماری کی یاد تازہ کر رہا ہوں۔''

علامہ اقبال کا لباس نہایت کم قیمت اور سادہ ہوتا تھا۔ آپ انگریزی لباس پسند نہیں کرتے تھے۔ گھر کے اندر عموماً تہمد اور بنیان ہی پہنے رہتے تھے۔ انگلستان سے واپس آنے کے بعد صرف عدالت تک جانے کے لئے انگریزی سوٹ پہنتے تھے، پھر گھر آتے ہی سب سے پہلے اپنے خاص ملازم کو بلند آواز میں کہتے: ''علی بخش! انسانوں والے کپڑے لے کر آؤ۔''

علامہ اقبال کی اہلیہ کو مرغیاں پالنے کا بہت شوق تھا، اور اکثر مرغیوں کے چوزے نکلوایا کرتی تھیں۔ چوزے نکل آتے تو گھر کی رونق دوبالا ہو جاتی۔ مرغی اپنی فوج کو لے کر سارے گھر میں گھومتی رہتی۔ علامہ اس فوج کو چوزہ بریگیڈ کہا کرتے تھے اور اگر کبھی مرغی اپنے بچوں سمیت علامہ کے کمرے میں گھس آتی تو آپ فوراً اپنے خاص ملازم علی بخش کو آواز دیتے: ''علی بخش! چوزہ بریگیڈ کی ڈیوٹی دوسری طرف لگاؤ۔''

علامہ اقبال کو حکومت کی طرف سے ''سر'' کا خطاب ملا تو انہوں نے اسے قبول کرنے کی یہ شرط رکھی کہ ان کے استاد مولانا میر حسن کو بھی شمس العلماء کے خطاب سے نوازا جائے۔ حکام نے یہ سوال اٹھایا کہ ان کی کوئی تصنیف نہیں، انہیں کیسے خطاب دیا جاسکتا ہے! علامہ نے فرمایا ''ان کی (یعنی مولانا کی) سب سے بڑی تصنیف خود میں ہوں۔'' چنانچہ حکومت کو ان کے استاد کو شمس العلماء کا خطاب دینا پڑا۔

لندن کا ذکر ہے کہ جون 1907ء میں ایک معزز خاتون لیڈی ایلیٹ نے ایک پارٹی دی۔ جس میں اقبال بھی مدعو تھے۔ دفعتاً مس سروجنی نائیڈو نہایت پر تکلف لباس اور جھلملاتے ہوئے زیورات پہنے ہوئے جھم جھم کرتی سامنے ان موجود ہوئیں اور آتے ہی اقبال کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا ''میں تو صرف آپ سے ملنے یہاں آئی ہوں۔'' اقبال کی ظرافت کا شعلہ چمکا اور انہوں نے فی البدیہہ کہا ''تو یہ صدمہ اس قدر ناگہانی ہے کہ میں نہیں سمجھتا کہ یہاں سے زندہ سلامت باہر جاسکتوں گا یا نہیں۔''

کیمبرج کی تعلیم کے زمانے میں اقبال کی چند ساتھیوں سے مذہب پر بحث چھڑ گئی۔ ایک صاحب پوچھنے لگے: کیا بات ہے، جتنے بھی پیغمبر دنیا میں آئے ہیں سب کے سب ایشیا ہی میں آئے، یورپ میں ایک بھی پیدا نہیں ہوا۔ اقبال نے جواب دیا کہ شروع ہی میں اللہ تعالیٰ اور شیطان نے اپنا اپنا علاقہ چن لیا۔ اللہ تعالیٰ نے ایشیا کو پسند کیا اور شیطان نے یورپ کو، اسی لیے جتنے اللہ کے پیغمبر ظہور میں آئے وہ تو ایشیا میں پیدا ہوئے اور شیطان کے نمائندے یورپ میں اس پر سب کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔

آغا حشر کشمیری یوں تو انگریزی لباس بھی پہنتے تھے، لیکن جب ایک مرتبہ وہ لاہور تشریف لائے اور ان کے اعزاز میں ایک جلسے کا اہتمام کیا گیا تو وہاں وہ اپنا پسندیدہ لباس ریشمی کرتا اور تہمد پہن کر گئے۔ علامہ اقبال بھی جلسے میں تشریف فرما تھے۔ سامعین میں ابھی خاصی تعداد ادیبوں اور شاعروں ہی کی تھی۔ جب آغا صاحب تقریر کرنے کے لیے اٹھے تو لوگوں نے ان کو سننے کے بجائے ان کے لباس پر نہ صرف ہنسا شروع کر دیا، بلکہ آوازے کسے اور تالیاں بجا بجا کر شور مچانے لگے۔ ان کی سادگی دیکھ کر یقین نہیں ہوتا تھا کہ یہ ہندوستان کے مایہ ناز ڈرامانگار ہیں۔ علامہ اقابل کو آغا صاحب کے ساتھ یہ سلوک بہت برا لگا۔ انہوں نے نہایت غصہ سے یہ شعر پڑھا:

شور ایسا ہے کہ قصابوں کی ہو جیسے برات
آیئے لاہور کی یہ بزم ماتم دیکھیے

علامہ کا یہ شعر پڑھنا تھا کہ جلسے میں سناٹا چھا گیا۔ پھر آغا صاحب نے پڑھنا شروع کیا تو لوگ دو ڈھائی گھنٹے تک ان کی گوہرافشانی کا لطف اٹھاتے رہے۔

اخبار ''وطن'' کے ایڈیٹر مولوی انشاء اللہ خان کے علامہ اقبال سے دوستانہ تعلقات تھے اور وہ علامہ کی اس دور کی قیام گاہ واقع انارکلی بازار لاہور اکثر حاضر ہوا کرتے تھے، اس دور میں انارکلی بازار میں گانے والیاں آباد تھیں۔ انہی دنوں میونسپل کمیٹی نے گانے والیوں کو انارکلی سے نکال کر دوسری جگہ منتقل کر دیا۔ ان ایام میں جب بھی مولوی صاحب، علامہ سے ملاقات کے لئے آئے، اتفاقاً ہر بار یہی پتہ چلا کہ علامہ گھر پر تشریف نہیں رکھتے، باہر گئے ہوئے ہیں۔

ایک روز مولوی انشاء اللہ پہنچے تو علامہ گھر پر موجود تھے، مولوی صاحب نے ازراہِ مذاق کہا: ''ڈاکٹر صاحب جب سے گانے والیاں انارکلی سے دوسری جگہ منتقل ہوئی ہیں،

آپ کا دل بھی اپنے گھر میں نہیں لگتا۔''

علامہ نے فوراً جواب دیا: ''مولوی صاحب، آخر ان کا کیوں نہ خیال کیا جائے، وہ بھی تو ''وطن'' کی بہنیں ہیں۔''

علامہ اقبال کا دولت خانہ ہر خاص اور عام کے لئے کھلا رہتا تھا۔ ایک دفعہ گورنمنٹ کالج کے چار پانچ طالب علم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ جانتے ہیں کہ کالج کی مخلوق میں بننے سنورنے کا شوق زیادہ ہے۔ پوڈر سُرخی کا استعمال روز بروز بڑھتا جا رہا ہے آبروؤں کو خم دینے، زلفوں میں بل ڈالنے ہونٹوں کو سرخی سے رنگین بنانے کا شوق زیادہ ہوتا جا رہا ہے ایک تو یہ چاروں پانچوں کل چہرہ اور نازک اندام اس پر بناؤ سنگار کا اہتمام انہوں نے آتے ہی پردے کی بحث چھیڑ دی۔ ایک نوجوان کہنے لگا: ''ڈاکٹر صاحب! اب مسلمانوں کو پردہ اُٹھا دینا چاہیے۔''

علامہ صاحب مسکرائے اور بولے: ''آپ عورتوں کو پردے سے نکالنا چاہتے ہیں اور میں اس فکر میں ہوں کہ کالج کے نوجوانوں کو بھی ''پردہ'' میں بٹھا دیا جائے۔''

علامہ اقبال برطانوی وزارتِ خارجہ پر طنز کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ ایک اجلاس میں سامعین پر امید تھے کہ اقبال کوئی فصیح و بلیغ تقریر کریں گے لیکن انہوں نے مختصر سی تقریر کی اور یہ لطیفہ سنا کر واپس چلے گئے۔

''جنگ عظیم کے ایام میں ابلیس کے چند مرید اس کے پاس گئے تو دیکھا کہ وہ فارغ بیٹھا سگار پی رہا ہے۔ جب اس سے بے کاری کا سبب دریافت کیا گیا تو اس نے جواب دیا: ''آج کل بالکل فارغ ہوں کیونکہ میں نے اپنا سارا کام برطانوی فارن آفس کے سپرد کر رکھا ہے۔''

اقبال فرماتے ہیں کہ انگلستان میں طالبِ عالمی کے زمانے میں مجھے ہر روز شام کے وقت اپنی قیامت گاہ کی طرف ریل گاڑی میں سفر کرنا پڑتا تھا۔ یہ گاڑی ایک جگہ ختم ہوتی تھی اور سب مسافر سامنے والے پلیٹ فارم پر دوسری گاڑی میں سوار ہو جاتے تھے۔ گاڑی جب اسٹیشن پر پہنچتی تو گارڈ بلند آواز سے پکارتا: ''All Change'' (سب بدلی کرلو)

ایک روز میں حسب معمول گاڑی میں بیٹھا تھا کہ میرے اردگرد اخبار بین مسافر آپس میں بدھ مذہب کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ ایک صاحب نے میری طرف اشارہ کر کے کہا: ''یہ صاحب غالباً ایشیائی ہیں، ان سے بدھ مذہب کے متعلق پوچھنا چاہیے۔'' چنانچہ مجھ سے پوچھا گیا تو میں نے جواب دیا، ابھی بتاتا ہوں۔ یہ کہہ کر میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ چند منٹ بعد انہوں نے دوبارہ پوچھا۔ میں نے پھر کہا، ابھی بتاتا ہوں۔ وہ کہنے لگے: ''شاید آپ جواب سوچ رہے ہیں۔'' میں نے کہا: ''ہاں''۔ اس دوران میں اسٹیشن آ گیا اور گارڈ نے پکارا: ''All Change''۔ میں نے کہا: ''بس یہی بدھ مذہب ہے۔''

علامہ کا اشارہ بدھ مت کے نظریہ تاریخ تناسخ کی طرف تھا جس کی رو سے انسان بار بار دُنیا میں مختلف شکلوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

مولانا عبدالمجید سالک کے فکاہیہ کالموں میں اقبال اور ان کے احباب کی ''انبہ خوری'' کا بکثرت ذکر آیا ہے۔ میاں نظام الدین ہر سال آموں کے موسم میں علامہ اور ان کے حلقہ احباب میں شامل چودھری محمد حسین، غلام رسول مہر، سالک، تاثیر، عبداللہ چغتائی اور مجید ملک وغیرہ کو اپنے باغات میں مدعو کرتے اور یہ لوگ وہاں جی بھر کر انبہ خوری کرتے۔ اقبال کا ذاتی ملازم علی بخش اور جاوید اقبال (بعمر چار پانچ سال) بھی ہمراہ ہوتے۔ اسی طرح کی ایک دعوت انبہ خوری کا نقشہ سالک صاحب نے ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

''جوں ہی ہم باغ میں داخل ہوئے، کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے رہٹ کے حوض میں پانی جمع ہو رہا ہے۔ اس کے پاس ہی مونج کی کھری چارپائی پر حضرت علامہ تشریف رکھتے ہیں۔ چودھری محمد حسین پاس ہی بیٹھے ہوئے نہایت فلسفیانہ انداز میں بچّے (عزیزی جاوید اقبال) کی طرف تک رہے ہیں۔ ایک طرف علی بخش سب کی نظر بچا کر آموں پر دست درازی بلکہ زبان درازی کر رہا ہے۔ میاں محمد اسلم (مشہور ناول نگار) مختلف اقسام کے آموں کی تنظیم وتقسیم اور ترتیب وتربید میں بے حد اہتمام فرما رہے ہیں۔ بہت سے آم رہٹ کے حوض میں ڈال دیئے گئے۔ حوض کا نکاس بند کر دیا گیا۔ ہم کوٹ اتار کر آستین چڑھا، آموں سے دست و گریباں ہو گئے۔ بچّے کے کپڑے اتار کر اسے حوض میں اتار دیا گیا۔ چودھری صاحب، محمد اسلم اور تاثیر صاحب حوض میں پاؤں لٹکا کر بیٹھے تھے۔ علامہ اقبال چارپائی پر بیٹھے تھے۔ آپ نے تبرکاً ہر قسم میں سے صرف دو دو، تین تین آم کھائے ہوں گے اور بس ۔۔۔ لیکن واضح رہے آموں کی قسمیں تقریباً چالیس ہوں گی ۔۔۔ ایک خاص قسم کا آم علامہ کی خدمت میں پیش کیا گیا، جس کا رنگ خون شہداء سے ملتا جلتا تھا۔ علامہ نے اس کی شیرینی، اس کی باصرہ افروزی اور سرخی دیکھ کر فرمایا کہ اس آم کا نام آج سے ''ٹیپو سلطان'' رکھا جائے۔ یہ نام بہت پسند کیا گیا اور سبھی محظوظ ہوئے۔

علامہ اقبال نے جب کیمبرج یونیورسٹی سے بی۔ اے کر لیا تو ان کے بڑے بھائی نے انہیں لکھا کہ ''اب بیرسٹری کا کورس پورا کر کے واپس آجاؤ۔'' لیکن علامہ کا ارادہ پی ایچ ڈی کرنے کا تھا۔ اس لیے انہوں نے بھائی کو لکھا کہ ''کچھ رقم بھیجیے تاکہ جرمنی جا کر ڈاکٹری کی سند لے لوں۔'' انہیں دنوں میں وہ ایک روز سیالکوٹ میں اپنے بے تکلف دوستوں کی صحبت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کسی نے ان سے دریافت کیا۔ ''کیوں شیخ صاحب! سنا ہے اقبال نے ایک اور ڈگری لی ہے؟'' ان کے بھائی نے جواب دیا: ''بھی کیا بتلاؤں، ابھی تو وہ ڈگریوں پر ڈگریاں لیے جا رہا ہے۔ خدا جانے ان ڈگریوں کا اجراء کب ہوگا۔''

چوہدری شہاب الدین صاحب اور سر اقبال دونوں دوست تھے اور کامیاب وکیل بھی۔ ایک دفعہ ایک فاحشہ عورت نے کسی صاحب اقبال آدمی کے خلاف مقدمہ دائر کیا تو اس کے وکیل علامہ محمد اقبال تھے اور مخالف سمت کے وکیل چوہدری صاحب۔ جب جسٹس اوترم نے پوچھا کہ محترمہ کے وکیل کون ہیں؟ تو چوہدری صاحب فوراً بولے کہ KNIGHT صاحب کے سوائے اور کون ان کے وکیل ہوتے ہیں (KNIGHT کا خطاب اقبال صاحب کو ملا ہوا تھا) بھلا اقبال کب چوکنے والے تھے، فوراً بولے کہ جناب KNIGHT تو میں بھی ہوں اور چوہدری صاحب بھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ بغیر K کے یعنی NIGHT ہیں، میں K کے ساتھ ہوں۔

ہائی کورٹ بار میں علامہ اقبال، چودھری صاحب کے متعلق لطیفے گھڑ کے دوستوں کو سنایا کرتے اور محفل کو لالہ زار بنا دیتے۔ ایک دفعہ اپنے دوستوں سے کہنے لگے: ''مجھے عدالت عالیہ کے جج نے یاد فرمایا۔ میں فوراً اُٹھا اور کھونٹی پر سے اپنا گاؤن اتارنے لگا کہ پہن کر جاؤں، دو تین بار کھینچا، مگر گاؤن نے اترنا تھا نہ اترا۔ آنکھ اٹھا کر دیکھا تو وہ چودھری شہاب الدین تھے۔''

اسی طرح کا ایک واقعہ بھی چوہدری شہاب الدین کی ذات کے حوالے سے ہے۔ ان کی رنگت خاصی سیاہ تھی۔ ایک دفعہ ایک آدمی کسی اسلامی ملک سے علامہ اقبال سے ملاقات کے لئے آیا۔ علامہ نے اس کی دعوت کی اور اپنے دوست احباب کو بھی بلایا۔ جن میں چوہدری شہاب الدین بھی شامل تھے۔ چوہدری صاحب کہنے لگے: ''بھئی اب کے تو تعارف صحیح انداز

میں کرانا اور معزز مہمانوں کے سامنے مذاق سے باز رہنا۔''

اس پر علامہ اقبال نے کہا: ''بہت اچھا۔''

مگر پھر بھی اپنی عادت سے باز نہ رہے اور معزز مہمانوں سے چوہدری شہاب الدین کا یوں تعارف کرایا: ''منافقت کے اس دور میں چوہدری صاحب بڑے مخلص اور صاف باطن مسلمان ہیں اور ان کا ظاہر و باطن ایک سا ہے۔''

ایک روز یہی چوہدری صاحب سرتاپا سفید کپڑے پہن کر ایک دعوت میں آئے تو اقبال نے انہیں دیکھ کر پھر چوٹ کی: ''اوہ ویکھو کپاہ وچ کٹا وڑ گیا۔'' (یعنی کپاس کے کھیت میں بھینسا گھس گیا)''

چوہدری شہاب الدین بلدیہ لاہور کے صدر منتخب ہوگئے۔ اسی زمانے میں سر شجاع الملک مہتر چترال لاہور تشریف لائے۔ نواب سر ذوالفقار علی خاں کے ہاں پرتکلف دعوت دی گئی اور نواب صاحب نے علامہ اقبال سے کہا کہ آپ ہز ہائی نس سے مقامی معززین کا تعارف کرا دیجیے۔ علامہ اقبال تعارف کرانے لگے۔ جب چوہدری صاحب کی باری آئی تو کہا۔ ''اعلیٰ حضرت! حضرت والا مہتر چترال اند ایں خاں بہادر چوہدری شہاب الدین مہتر لاہوری باشند۔'' اس پر مجلس میں ایک قہقہہ بلند ہوا۔

علامہ اقبال کے پرانے خادم علی بخش کا بیان ہے کہ وہ شروع شروع میں علامہ صاحب کے ہاں ملازم ہوا تو شہر والوں کے طور طریقوں سے ناواقف تھا۔ ایک دن ڈاکٹر صاحب نے اس سے کہہ دیا کہ جاؤ بازار سے پتاشوں کا مربہ لے آؤ۔ وہ سارے شہر میں پھرا

لیکن پتاشوں کا مربہ کہاں سے ملتا۔ دوکاندار پتاشوں کے مربے کا نام سنتے تھے اور ہنستے تھے۔

علی بخش سے علامہ صاحب کی یہ چھیڑ خانی آخر تک رہی۔ ایک دن یہ سوال پیش ہوا کہ علی بخش کی مونچھوں کی رنگت کیا ہے؟ کسی نے کہا خاکستری ہے، کسی نے کہا اگری ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے: ''علی بخش کی مونچھوں کا رنگ موچھئی ہے۔''

اسلامیہ کالج لاہور میں انجمن حمایت اسلام کا سالانہ جلسہ ہو رہا تھا۔ علامہ اقبال صدارت گاہ کے عقب میں برآمدے کے پاس کھڑے، میاں شاہنواز سے باتیں کر رہے تھے۔ کسی نے کہا آپ نے ''ٹائمز'' کی یہ خبر پڑھی کہ آرچ بشپ آف کنٹربری نے کہا ہے کہ ترکوں نے آرمینیوں پر جو مظالم ڈھائے ہیں، ان سے اسلام کا چہرہ داغ دار ہو گیا ہے۔ اب جبکہ جنگ ختم ہو چکی ہے، مسلمانانِ ہند کو چاہیے کہ اور نہیں تو محض اسلام کی خاطر ہم سے مل جائیں اور ترکوں کے خلاف آواز اٹھائیں۔ اس پر میاں صاحب کو بے اختیار ہنسی آ گئی، کہنے لگے: ''خوب! بلی، چوہے کو دعوتِ اتحاد دے رہی ہے۔ اس پر علامہ اقبال نہایت محظوظ ہوئے اور برجستہ یہ قطعہ ارشاد فرمایا:

اخبار میں یہ لکھتا ہے لندن کا پادری
ہم کو نہیں ہے مذہب اسلام سے عناد
مسلم بھی ہوں حمایتِ حق میں ہمارے ساتھ
مٹ جائے تاجہاں سے بنائے شر و فساد
سن کر یہ بات خوب کہا شاہنواز نے
بلی چوہے کو دیتی ہے پیغامِ اتحاد!

ایک زمانے میں جب علامہ اقبال کو بہاولپور، ملتان، شجاد آباد سے کوئی آموں کی ٹوکری بھیجتا تو علی بخش کو بھیج کر عبدالمجید سالک اور غلام رسول مہر صاحب کو بلوا لیتے۔ قالین کے فرش پر اخبار بچھا کر ایک دیگچے میں پانی سے آم تر کیے جاتے۔ سب لوگ بیٹھ کر کھانے لگتے اور علامہ صاحب صوفے پر بیٹھے ہوئے دیکھتے رہتے۔ ایک دن کہا، اب میں کھانے کی منزل سے گزر کر کھلانے کے مرحلے میں ہوں اور مجھے آم کھلا کر بھی مسرت ہوتی ہے۔ سالک صاحب نے کہا، علامہ صاحب یہ تو وہی بات ہوئی ''پیشہ کند دلالی''۔ علامہ صاحب ہنسے اور کہنے لگے مجھے یقین تھا کہ سالک صاحب یہ مصرع پڑھے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

یہی نہیں علامہ اقبال نے اپنے اشعار میں بھی طنز و مزاح کا ایسا بھرپور استعمال کیا ہے کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ اقبال کی خوبی یہ ہے کہ طنز و مزاح میں بھی وہ کوئی نہ کوئی سبق دیتے نظر آتے ہیں۔ یعنی یہاں بھی بامقصد شاعری ہی ان کے پیش نظر ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں!!
مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہو گئے
وعظ میں فرما دیا کل آپ نے یہ صاف صاف
پردہ آخر کس سے ہو جب مرد زن ہو گئے

نئی تہذیب کے متعلق علامہ فرماتے ہیں:

میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ
نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے!
اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

مولانا محمد علی جوہر

ولادت: ۱۰؍ستمبر ۱۸۷۸ء (رامپور، یوپی)

وفات: ۴؍جنوری ۱۹۳۱ء (لندن)

مولانا محمد علی کا تعلق رام پور سے تھا۔ ایک بار ان کا جانا سیتا پور ہوا۔ وہاں میزبان واقف تھے کہ مولانا کا شکر کا پرہیز ہے اس لئے انہوں کھانے کے بعد کہا: ''مولانا میٹھا تو آپ کھائیں گے نہیں!!''

مولانا بولے: ''بے شک میٹھا میرے لیے شجر ممنوعہ ہے لیکن سسرال میں میٹھا کھانے سے انکار بھی نہیں کر سکتا۔''

میزبان نے حیرت سے پوچھا: ''کیا سیتا پور میں آپ کی سسرال بھی ہے۔''

مولانا بولے: ''ارے بھائی، رام پور سے سیتا پور آیا ہوں، آپ کو رام اور سیتا کا رشتہ بھی نہیں پتہ!!''

علی گڑھ میں ایک تقریب میں کھانے کے بعد سویٹ ڈش کے طور پر شریفے رکھے گئے، اس تقریب میں مولانا محمد علی جوہر بھی شریک تھے۔ مولانا نے شریفے کھا کر اس کے بیج باہر آنگن میں پھینکنے شروع کر دیے۔

لوگوں نے حیرانگی سے پوچھا: ''مولانا یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔''

اس پر مولانا ہنس کو بولے: ''اچھا ہے یہاں بھی شریفے اُگ آئیں، یہاں پر ''شریفوں'' کی کمی بھی ہے۔''

شملہ میں ایک کانفرنس ہو رہی تھی جس میں مولانا محمد علی جوہر بھی شریک تھے۔ گفتگو اُردو زبان ہی میں ہو رہی تھی۔ بات میں کچھ الجھاؤ پیدا ہو گیا تو جوشِ خطابت میں مولانا نے انگریزی میں بولنا شروع کر دیا اور سب کو لا جواب کر دیا۔ مجلس میں ایک ہندو رانی بھی تھی۔ اس نے جب ایک مولانا کو اتنی شستہ انگریزی بولتے سنا تو ششدر رہ گئی اور پوچھا: ''مولانا آپ نے اتنی اچھی انگریزی کہاں سیکھی؟'' مولانا نے جواب دیا: ''میں نے انگریزی ایک بہت ہی چھوٹے سے قصبے میں سیکھی ہے۔'' انہوں نے حیرانی سے پوچھا: ''کہاں سے؟'' تو مولانا شگفتگی سے بولے: ''آکسفرڈ میں۔'' جس پر سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

ایک مرتبہ مولانا محمد علی سے کسی دوست نے سوال کیا: ''آپ تین بھائی ہیں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ تینوں شاعر ہیں۔ آپ کا تخلص 'جوہر' ہے، آپ کے بڑے دوسرے بھائی ذوالفقار علی کا تخلص 'گوہر' ہے، لیکن شوکت علی کا کیا تخلص ہے؟''

مولانا محمد علی جوہر نے برجستہ جواب دیا: ''شوہر''

مولانا کا جواب بڑی معنی خیز تھا، کیونکہ مولانا شوکت علی واقعی چار بیویوں کے شوہر تھے۔

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب مولانا محمد علی اخبار ''ہمدرد'' کے نمائندے کی حیثیت سے مرکزی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرتے تھے۔ ایک بار وہ دوسرے نمائندوں کے ساتھ اوپر گیلری میں بیٹھے ہوئے تھے کہ پیچھے سے ان کے کانگریسی گہرے دوست نے کہا: ''جب یہاں تک آ گئے ہو تو دو قدم اور سہی۔ آؤ، ہماری جماعت میں شامل ہو جاؤ کہ مل کر کام کریں۔''

مولانا نے جواب دیا: ''میں آپ کی جماعت میں کیسے شامل ہو سکتا ہوں، میں تو اس بلندی سے آپ کی پستی کا منظر دیکھ رہا ہوں۔''

جب کانگریس نے نمک بنانے کی تحریک شروع کی اور گاندھی جی نے مولانا محمد علی جوہر کو بھی نمک بنانے اور سول نافرمانی کی تحریک میں حصہ لینے کی دعوت دی تو مولانا نے فرمایا ''میں کیا نمک بناؤں گا، قوم کے غم میں دس سال سے شکر جو بنا رہا ہوں۔'' (مولانا کو ذیابیطس کا عارضہ تھا)

کسی انگریز پرست آدمی نے ایک مجلس میں کہہ دیا کہ یہ محمد علی اور شوکت علی تو لفنگے ہیں۔ مولانا شوکت علی کو کسی نے بتا دیا۔ کہنے لگے بات تو اس نے ٹھیک کہی۔ ہم لفنگے ضرور ہیں، لیکن اللہ میاں کے لفنگے ہیں کافروں کے لفنگے نہیں۔

خواجہ حسن نظامی

ولادت: ۲۵ر دسمبر ۱۸۷۸ء (دہلی)

وفات: ۱۹۵۵ء (دہلی)

دہلی میں ایک جیب کترا تھا جن کا انگوٹھا قینچی کے پھل کی طرح دودھارا تھا اور کلمے کی انگلی پتھر پر گھس گھس کر شیشے کی مانند سخت کرلی تھی۔ بس جہاں ان کی انگلی لگ جاتی تو قینچی کو پیچھے چھوڑ دیتی تھی۔ ایک صاحب کوئی باہر کے، خواجہ حسن نظامی کے ہاں آئے اور شکایت کی۔

''دہلی کے جیب کترے کی بڑی دھوم سنی تھی۔ آج ہمیں دہلی کے بازاروں میں پھرتے چار دن ہو گئے ہیں لیکن کسی کو مجال نہیں ہوئی کہ ہماری جیب کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ لیں۔''

خواجہ صاحب نے اس چٹکی باز کو بلوایا اور ان صاحب سے اس چٹکی باز کا آمنا سامنا کرایا۔ اس ہنرمند نے مسکرا کر کہا:

''خواجہ صاحب! میرے شاگردوں نے ان صاحب کا حلیہ بتایا تھا۔ چار دن سے انگرکھے کی اندر کی جیب میں پیتل کی آٹھ ماشیاں (آٹھ ماشا وزن کے سکے) ڈالے گھوم رہے ہیں اور وہ بھی گنتی کے چار۔ اب آپ ہی بتایئے کہ کون جعلی سکوں پر اپنی نیت خراب کرے گا۔''

ایک انگریز نے خواجہ حسن نظامی سے پوچھا:

''سارے انگریزوں کا رنگ ایک سا ہوتا ہے لیکن پتہ نہیں کیوں سارے ہندوستانیوں کا رنگ ایک سا نہیں ہوتا۔''

خواجہ حسن نظامی نے جواب دیا: ''گھوڑوں کے رنگ مختلف ہوتے ہیں لیکن سارے گدھوں کا رنگ ایک سا ہوتا ہے۔''

خواجہ حسن نظامی بعض اوقات بڑی دُور کی کوڑی لاتے تھے۔ سر تیج بہادر سپرو کے متعلق الٰہ آباد کے ایک ادبی اجتماع میں آپ نے فرمایا: ''آپ یوں تو سر تیج ہیں، مگر اُردو کے سرتاج ہیں اور اُردو آپ کو سپرو نہیں اپنا سپر سمجھتی ہے۔'' خواجہ صاحب کی تشریح صرف صنائی نہیں، واقعہ بھی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد خواجہ حسن نظامی کی معاشی حالت بہت کمزور ہوگئی۔ دوست احباب بھی وداع ہو کر پاکستان پہنچ گئے۔ دوست کم دشمن زیادہ ہوگئے۔ ہر قسم کی مصیبتیں ان پر نازل ہوگئیں لیکن پھر بھی ان سے ''سلطان جی کا آستانہ'' نہ چھوٹا۔ اکبر الٰہ آبادی نے اس موقعہ پر یہ شعر کہا:

حضرت ابوہریرہ سے بلی نہ چھٹ سکی
خواجہ حسن نظامی سے دلی نہ چھٹ سکی

خواجہ حسن نظامی کو خطابات دینے اور نام رکھنے کا عجیب سلیقہ تھا۔

علامہ راشد الخیری کو مصورِ غم کا خطاب دیا، میاں بشیر الدین احمد کو ''وارث الادب'' بیگم کو ''خواجہ بانو'' بیٹی کو ''حور بانو''، ضیاء الدین احمد کو ان کی تاریخی معلومات کی وجہ سے ''برنی'' ایک مصاحب کو ''ناسوتی نظامی'' دوسرے کو ''ابن العربی'' تیسرے کو ''ملنسار نظامی'' جیسے خطابات سے نوازا۔

ایک صاحب کو ''مستری عشق'' کا نام دیا۔ غرضیکہ کوئی جمالی تھا۔ کوئی غزالی تھا، اور کوئی ''قلندر نظامی'' تھا۔ اپنی بعض کتابوں کے نام بھی عجیب وغریب رکھے۔ مثلاً کم ٹو موت''، ''فرام قبلہ وشملہ''، ''طمانچہ بر رخسار یزید''، ''کانا باقی'' وغیرہ۔ ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا جس کا نام دی حسن نظامی ایسٹرن لٹریچر کمپنی لمیٹڈ رکھا۔ گھر کے صحن کا نام میدان عرفات، ایک جگہ کا نام وادی ایمن اور دوسری جگہ کا نام ایمان خانہ رکھا۔

خواجہ حسن نظامی اور مولانا محمد علی جوہر کی آپس میں خوب چل رہی تھی۔ مولانا روزانہ خواجہ صاحب کے خلاف پوسٹر چھپوا رہے تھے بلکہ انہوں نے خواجہ صاحب کا نام ہی ''قد آدم پوسٹر'' رکھ دیا تھا۔ ایک محفل میں غزل گائی جا رہی تھی جس کا ایک مصرعہ تھا۔

تمہاری بدگمانی چھپ گئی ہے اشتہاروں میں

اس پر تمام حاضرین ہنسنے لگ گئے۔ خواجہ صاحب اپنے خیال میں محو تھے۔ چونکے اور مسکرا کر کہا! کیا ہے؟ پھر کوئی نیا پوسٹر لگا ہے؟

اس پر ایک قہقہہ پڑا اور محفل پر رونق آ گئی۔

خواجہ حسن نظامی سے ایک صاحب نے عرض کیا کہ'' آپ کا روزنامچہ اپنی اور اپنے بچوں کی تعریفوں سے بھرا ہوتا ہے۔ یہ مکروہ ہے۔''

فرمایا،'' بچے ہو، بعد میں عقل آئے گی، اگر تم نے خود اپنی تعریف نہ کی تو دوسروں کو کیا غرض ہے کہ تمہاری تعریف کریں۔''

یگانہ چنگیزی

ولادت: ۱۷/اکتوبر ۱۸۸۴ء (عظیم آباد)

وفات: ۴/فروری ۱۹۵۶ء (لکھنؤ)

کپورتھلہ کے سالانہ مشاعرے میں ہندوستان کے اکثر مشاہیر شعرا شریک تھے۔ مشاعرے سے پہلے شام کے وقت منتظمِ مشاعرہ تاجور نجیب آبادی، سیماب اکبرآبادی، یاس یگانہ چنگیزی اور ساغر نظامی کو شہر کے قریب ہی ایک نہر کی سیر کرانے لے گئے۔ نہر کے کنارے دو کشتیاں تھیں ایک کشتی پر منتظم مشاعرہ کے ساتھ تاجور، سیماب اور ساغر سوار ہو گئے اور دوسری کشتی پر صرف یاس یگانہ۔ تاجور اور یاس کی باہمی چشمک ان دنوں زوروں پر تھی۔ تاجور نے یاس کو چھیڑنے کے لیے مسکراتے ہوئے کہا: ''صاحب! ہم تو سوشل آدمی ہیں۔ زندگی کے ہر شعبے میں جماعت کے قائل ہیں۔ یہاں تک کہ کشتی میں بھی بیٹھتے ہیں تو تین آدمیوں کے ساتھ لے کر۔'' یاس کے کانوں میں جب ان الفاظ کی بھنک پڑی تو انھوں نے تلملا کر اپنا ایک شعر پڑھ دیا:

خضرِ منزل اپنا ہوں اپنی راہ چلتا ہوں
میرے حال پر دنیا کیا سمجھ کے ہنستی ہے

شاہ دلگیر اور خادم علی خاں صاحب اخضر وغیرہ تشریف لے آئے۔ یہ ہمارے یہاں کے معمر اور بزرگ شعرا میں سے تھے اور مرزا یگانہ کے تقریباً ہم عمر بھی تھے۔ معلوم ہوا کہ دلگیر شاہ سے مرزا صاحب کی رسم قدیم ہے، اخضر صاحب سے البتہ اسی محفل میں تعارف ہوا اور اس کے ساتھ ہی لکھنوی شعرا کا ذکر چھڑ گیا۔ مرزا صاحب نے کہنا شروع کیا۔ ایک مشاعرے میں عزیز لکھنوی نے یہ شعر پڑھا جس پر انہیں بڑا ناز تھا۔

دل سمجھتا تھا کہ خلوت میں وہ تنہا ہوں گے
میں نے پردہ جو اٹھایا تو قیامت دیکھی

مگر صاحب میں نے اس طرح داد دی کہ عزیز کہنے لگے تم نے میرے شعر کا ناس کر دیا۔ سب سنتے رہے اور ہنستے رہے، اس کے بعد مشاعرہ شروع ہوا۔ پہلے ہم نومشقوں نے غزلیں سنائیں اس کے بعد دلگیر شاہ وغیرہ استاتذہ نے کلام سنایا۔ مرزا صاحب شائستگی اور وسیع القلبی سے داد دیتے رہے، آخر میں مرزا صاحب کی باری آئی انہوں نے غزل شروع کی، مطلع ارشاد فرمایا۔

پیامِ زیرِ لب ایسا کہ کچھ سُنا نہ گیا
اشارہ پاتے ہی انگڑائی لی رہا نہ گیا

شاہ دلگیر نے اپنی بلند آواز میں کہا۔ کیا کہہ دیا ہے مرزا صاحب سبحان اللہ۔ اور اسی کے ساتھ ایک فرمائشی قہقہہ بھی۔ خادم علی خاں صاحب (اخضر) نے ہاتھ اٹھ کر کہا۔ مرزا صاحب جواب نہیں ہوسکتا، سارا کوک شاستر ایک شعر میں نظر فرما دیا ہے آپ نے۔
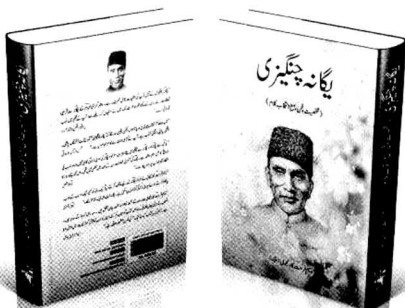
مولانا ابوالکلام آزاد

ولادت: ۱۱رنومبر ۱۸۸۸ء (مکہ مکرمہ)

وفات: ۲۲رفروری ۱۹۵۸ء (دہلی)

ایک دفعہ مولانا آزاد سے نہرو نے پوچھا: ''جب میں سر کے بل کھڑا ہوتا ہوں تو خون سر کی طرف جمع ہو جاتا ہے مگر جب پاؤں کے بل کھڑا ہوں تو ایسا نہیں ہوتا۔''

مولانا نے جواب دیا: ''جو چیز خالی ہو گی خون اسی طرف جائے گا۔''

مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں ایک دفعہ میں نے ایک جنتری خریدی جس میں لمبے بحر کی ایک پنجابی نظم تھی۔ شاعر کا نام یاد نہیں رہا اور نظم کا بھی صرف ایک ہی مصرعہ یاد رہ گیا:

''تپ تلی دی بیماری، ہوئی سخت جو بھاری پنڈوں کیتی میں تیاری شہر انبر سرنوں''

سالک لکھتے ہیں پھر انہوں نے مجھ سے ہنستے ہنستے سوال کیا۔ سالک صاحب آپ بھی تو پنجاب کے رہنے والے ہیں، آپ کو معلوم ہو گا یہ کس شاعر شیریں سخن کا کلام بلاغت نظام ہے۔ میں نے عرض کیا یہ اشعار مولوی میاں جان کے ہیں۔ مولوی صاحب اسی طرح لمبی بحر میں اشعار لکھا کرتے تھے۔ مولوی صاحب نومسلم تھے۔ چنانچہ ان کا ایک مصرعی اس کا شاہد ہے:

''سن میاں جاں۔ تیرا پیو بے ایمان۔ تینوں رب دِتا ایمان۔ تیرا جنت مقام اے۔''

اس پر مولانا بے حد محظوظ ہوئے اور کہنے لگے! آپ مولوی صاحب کے متعلق بے شک علمی و تاریخی تحقیق کرتے رہیں۔ ہمیں تو ان کے اس ارشاد کی بے ساختگی مزا دے گئی کہ

سن میاں جاں تیرا پیو بے ایمان

کھانے کا تذکرہ نکل آیا ہے تو مولانا کے بعض باورچیوں کا بھی ذکر ہو جائے۔ ایک باورچی صاحب رکھے گئے تو بڑے بقراط نکلے۔ جو ترکاری ایک دن لے آتے تو پھر روز وہی لاتے اور دونوں وقت وہی پکاتے۔ مثلاً آلو لے آئے۔ اعتراض کیجیے تو جواب میں لمبی تقریر کہ حضور! آلو معدے کو تقویت پہنچاتا ہے۔ خون صاف کرتا ہے۔ اِشتہا بڑھاتا

ہے۔ اَروی پر اُتر آئے تو اَروی کے فوائد سُن لیجیے! ''حضور، اَروی سب ترکاریوں کی ملکہ ہے۔ آدمی روز اَروی کھائے تو کبھی بوڑھا نہ ہو!''

ایک دفعہ کالے بینگن روز آنے لگے۔ میں نے ٹوکا تو بڑی سنجیدگی سے فرمانے لگے ''حضور، غور فرمائیں گے تو بہت خوش ہوں گے کہ یہ غلام بینگن کھلا رہا ہے۔ بینگن اعلیٰ درجے کا مصفّی خون ہے۔ کچھ بادی تو ضرور ہے مگر یہ بادی پن ہی بینگن کا سب سے بڑا گن ہے۔ پیٹ میں ریاح پیدا کرتا رہتا ہے۔ آنتوں میں سُدّے ہوں تو بخارات سے گرم ہو کر نرم پڑ جاتے ہیں اور آسانی سے دفع ہو جاتے ہیں اور پھر حضور، بینگن کا رنگ تو دیکھیے، سبحان اللہ! ماشاء اللہ! آدمی عمر بھر بینگن کھائے تو اُس کے رنگ میں بھی بینگن ہی جیسی چمک دمک پیدا ہو جائے۔''

ایک اور باورچی صاحب اپنی آپ ہی مثال تھے۔ ارسطو بھی ان سے بحث نہیں کر سکتا تھا۔ کھانے میں یا تو نمک ہی نمک ہوگا یا بالکل ڈالیں گے نہیں۔ ان کے ہاتھ کا پہلا پکوان سامنے آیا تو نمک ندارد۔ کہا گیا، کھانے میں نمک نہیں ہے۔ فرمانے لگے ''جی یہی تو میں بھی کہتا ہوں!'' ارے بھئی، نمک کا خیال رکھئے۔ پھیکا سیٹا کھانا کس کام کا؟ ''جی یہی تو میں بھی کہتا ہوں!'' دوسرے وقت کھانے میں نمک ہی نمک اور جواب وہی مرغے کی ایک ٹانگ ''جی یہی تو میں بھی کہتا ہوں۔''

ایک دفعہ مولانا کے ہاں کوئی باورچی نہ تھا۔ مجھ سے فرمایا تلاش کرو۔ میں نے مولانا عثمان مرحوم سے تذکرہ کیا، کہنے لگے، میرے وطن مونگیر میں ایک بہترین باورچی موجود ہے۔ بوڑھا ہے۔ کم تنخواہ پر آجائے گا۔ مولانا نے سنتے ہی تار۔۔۔ بھیج دیا اور باورچی صاحب تشریف لے آئے مگر خود مولانا عثمان کے قد اور جثے کے نکلے۔ ننھا سا ڈیل۔ چھوٹے چھوٹے پتلے پتلے ہاتھ پاؤں۔ مولانا دیکھ کر مسکرائے اور مولانا عثمان کے انتخاب کی داد دی!

حضرت کھانا پکانا ہی نہیں جانتے تھے۔ برتن تک ٹھیک سے دھو نہ سکتے تھے۔ گم صُم، کسی خیال میں ڈوبے بیٹھے رہتے اور نگاہیں دیوار پر جمی رہتیں۔ ایک دن مولانا کی خدمت میں رقعہ بھیجنا تھا۔ میں نے پکارنا شروع کیا، کوئی ہے؟ جواب نہ ملا۔ اوپر کا کام کرنے والا لڑکا موجود نہیں تھا۔ میں دیر تک چیختا رہا۔ آخر اُٹھ کر باورچی خانے پہنچا تو وہ حضرت

چار پائی پر مصروفِ مراقبہ تھے۔ عرض کیا، اتنی دیر سے پکار رہا ہوں۔ آپ بولے بھی نہیں۔
فرمایا: ''یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے، جو بولتا!''

مولانا ابوالکلام آزاد نینی جیل الہ آباد میں قید تھے، اس زمانے کا ایک مزیدار لطیفہ انہی کی زبانی سنیئے ''جیل میں میری کوٹھڑی کے عین سامنے ایک دوسری کوٹھڑی کے عین سامنے ایک دوسری کوٹھڑی میں کوئی چینی قیدی رہتا تھا مگر زبان کی بیگانگی کے باعث ہم دونوں آپس میں بات چیت نہیں کر سکتے تھے، ایک دوسرے کا منہ تک کر رہ جاتے۔

زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم

اس چینی کو یہ معلوم نہ تھا کہ میں کس جرم میں ماخوذ ہوں، غالباً سوچتا رہتا ہوگا، آخر ایک دن اس سے نہ رہا گیا، میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور اپنا ہاتھ لہرانے لگا، یعنی یہاں کیسے آئے ہو؟ میں کیا جواب دیتا، خاموش رہا، تو اس نے پوچھا ''اوپیم؟'' ''یعنی کیا افیم کے معاملے میں پکڑے گئے ہو؟'' میں نے نفی میں سر ہلایا تو اس نے اپنے ہاتھ کو اپنے گلے پر چھری کی طرح پھیرا یعنی کسی کو قتل کیا ہے؟ میں نے پھر سر ہلایا، تو آخر اس نے پوچھا ''گاندھی۔'' اس پر میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بالکل مطمئن ہو گیا، گویا اس کے نزدیک گاندھی بھی ناجائز افیون اور قتل کی طرح جرائم میں داخل ہے۔''

مولانا ابوالکلام آزاد کی نگرانی میں ساہتیہ اکادمی نے اردو ادب کی ایک مبسوط تاریخ مرتب کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس سلسلے میں اردو شاعروں کی جو فہرست تیار کی گئی اس میں اختر الایمان کا نام بھی شامل تھا۔ مولانا آزاد نے اختر الایمان کا نام حذف کر دیا اور کہا:

''جس شاعر نے اپنا نام غلط رکھا ہو وہ صحیح شعر کیا کہے گا۔''

جگر مرادآبادی

ولادت: ۶/اپریل ۱۸۹۰ء (مرادآباد، یوپی)

وفات: ۹/ستمبر ۱۹۶۰ء (گونڈہ)

ایک بار مشاعرہ ہو رہا تھا، ایک استاد اٹھے اور انہوں نے ایک طرح کا مصرعہ دیا۔

آ رہی ہے چمن سے بوئے کباب

بڑے بڑے شاعروں نے طبع آزمائی کی لیکن کوئی گرہ نہ لگا سکا، ان میں سے ایک شاعر نے قسم کھالی کہ جب تک گرہ نہ لگائیں گے چین سے نہیں بیٹھیں گے، چنانچہ وہ ہر صبح دریا کے کنارے نکل جاتے اونچی آواز سے الاپتے۔

آ رہی ہے چمن سے بوئے کباب

ایک روز وہ دریا کے کنارے یہی مصرعہ الاپ رہے تھے کہ ادھر سے ایک کمسن لڑکا گزرا جونہی شاعر نے یہ مصرعہ پڑھا، وہ لڑکا بول اٹھا۔

کسی بلبل کا دل جلا ہو گا

شاعر نے بھاگ کر اس لڑکے کو سینے سے لگایا۔ یہی لڑکا بڑا ہو کر جگر مراد آبادی کے نام سے مسلم الثبوت استاد بنا۔

آ رہی ہے چمن سے بوئے کباب
کسی بلبل کا دل جلا ہو گا

جگر مراد آبادی کے ایک شعر کی تعریف کرتے ہوئے ایک زندہ دل نے ان سے کہا: ''حضرت آپ کی غزل کے فلاں شعر کو لڑکیوں کی ایک محفل میں پڑھنے کے بعد بڑی مشکل سے میں پٹنے سے بچا ہوں۔''

جگر صاحب ہنس کر بولے: ''عزیزم، میرا خیال ہے کہ اس شعر میں کوئی خامی رہ گئی ہوگی، ورنہ یہ کس طرح ممکن تھا کہ آپ پٹنے سے بچ جاتے۔''

ایک بار جوش صاحب اور جگر مراد آبادی ٹانگے میں سفر کر رہے تھے۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد جگر نے کہا:

''یا اللہ!'' جوش شوخی سے بولے کیا آپ نے مجھ سے کچھ کہا۔۔۔؟

جگر نے برجستہ کہا: ''لاحول ولا! خدا کو یاد کیا، شیطان بیچ میں آ گیا۔''

سیّد بدرِ عالم بھی بابائے اُردو کے ایک رتن تھے، اُن کے خادم خاص۔ بابائے اُردو کی طرح اُنہوں نے بھی گھر بار کا جنجال نہیں پالا تھا۔

خواجہ صاحب کے بہ قول اُن کے دو شوق تھے۔ اخباروں سے فلم ایکٹریسوں کی تصویریں کاٹ کر ایک رجسٹر میں چپکانا اور اگر کوئی شخص گفت گو میں کوئی نیا لفظ استعمال کرے تو اُسے یاد کر لینا اور اپنی گفت گو میں استعمال کرنا۔ ایک دن اُن کی موجودگی میں کسی صاحب نے ''ہیچ و پوچ'' کے الفاظ استعمال کیے، سیّد صاحب کو یہ الفاظ بڑے بھلے معلوم ہوئے اور انہوں نے یاد کر لیے استعمال کے منتظر رہے۔

اتفاق یہ کہ دو تین دن کے بعد جگر صاحب انجمن آئے۔ کراچی آئے ہوئے تھے،

مولوی صاحب سے ملنے آگئے۔ مولوی صاحب نے اُنہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ جگر صاحب اطمینان سے بیٹھے تو شعر خوانی کا آغاز ہوا۔ جگر صاحب کا لحن اور کلام کی رعنائی، سیّد صاحب مسحور ہو گئے۔ بے اختیار ہو کر بولے:

''ایسا ہیچ و پوچ کلام تو آج تک نہیں سُنا۔''

جگر صاحب سناٹے میں آگئے۔ مولوی صاحب نے ڈانٹا:

''کیا کہہ رہے ہیں؟''

مگر سیّد صاحب بھی اپنی وضع کے ایک ہی تھے۔ کہنے لگے:

''چاہے مار ڈالو، مگر کلام بڑا ہیچ و پوچ ہے۔''

مولوی صاحب نے چھڑی سنبھالی، مگر کچھ سوچ کر ٹھہرے۔ پوچھا:

''کچھ سمجھتے بھی ہیں کہ کیا کہہ رہے ہیں؟''

سیّد صاحب نے کہا: ''سمجھتا کیوں نہیں۔ بڑا اعلا درجے کا کلام ہے۔''

مولوی صاحب ہنس پڑے پوچھا:

''یہ الفاظ آپ کو کس نے سکھائے؟''

سیّد صاحب نے بتایا:

''فلاں صاحب اُس دن آئے تھے اُنہوں نے یہ الفاظ کہے تھے۔ مجھے اچھے لگے۔ میں نے یاد کر لیے۔''

جگر صاحب یہ سن کر مسکرائے اور سیّد صاحب کی گلوخلاصی ہوئی۔

لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں جگر مراد آبادی غزل پڑھ رہے تھے۔ ان کے ایک قریبی دوست جب ان کی تصویر کھینچنے لگے تو جگر صاحب بولے: ''میری تصویر ایسی نہیں آتی کہ تم گھر میں سجا سکو۔'' (جگر صاحب بہت کالے تھے) ان کے دوست نے کہا: ''تصویر سجانے کے لیے نہیں، بچوں کو ڈرانے کے لیے لے جا رہا ہوں۔''

شکیل بدایونی جگر مراد آبادی کے شاگرد تھے اور ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ایک بار راندیر (سورت) میں شکیل کی صدارت میں مشاعرہ تھا۔ بیرونی شعرا میں حضرت جگر مراد آبادی بھی تشریف لائے۔ مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے شکیل نے مائک پر آ کر کہا: ''چونکہ جگر صاحب میرے بزرگ ہیں اس لئے میں اس مشاعرے کی صدارت کرنے کی گستاخی نہیں کر سکتا۔'' جگر صاحب نے فوراً مائک ہاتھ میں لیا اور کہا: ''اگر شکیل مجھے اپنا بزرگ تسلیم کرتے ہیں تو بحیثیت بزرگ میں انہیں حکم دیتا ہوں کہ وہ مشاعرے کی صدارت کریں۔'' شکیل مجبور ہو گئے۔ تمام شاعر جب کلام پڑھ چکے اور صرف دو شاعر باقی رہ گئے یعنی جگر صاحب اور خود شکیل جو صدر تھے۔ اس لئے آخری شاعر کے بعد فوراً شکیل مائک پر اپنا کلام سنانے آ گئے تا کہ جگر صاحب سب سے آخر میں کلام سنائیں۔ لیکن جگر صاحب اٹھ کر مائک پر آ گئے اور کہنے لگے: ''آپ صدر ہیں آپ سب سے آخر میں اپنا کلام سنایئے گا۔'' اس پر شکیل برجستہ بولے: ''جگر صاحب اگر آپ مجھے صدر مانتے ہیں تو میں بحیثیت صدر آپ کو حکم دیتا ہوں کہ آپ سب سے آخر میں کلام سنائیں گے۔'' محفل میں قہقہے بلند ہوئے اور جگر صاحب کو شکیل کی بات ماننی پڑی۔

ایک بار جگر، شوکت تھانوی اور مجروح سلطان پوری دوپہر کے وقت کہیں کام کے لیے باہر نکلنے تھے تو ارادہ کیا گیا کہ نماز ادا کی جائے۔ شوکت صاحب ایک کام کے لیے چلے گئے۔ جگر صاحب مسجد کی بجائے ایک ریسٹورنٹ میں جا گھسے۔ مجروح نے کہا۔ ''جگر صاحب! یہ مسجد نہیں ریسٹورنٹ ہے۔'' جگر نے جواب دیا ''مجھے معلوم ہے سوچا کہ وقت تنگ ہے۔ اللہ کو تو خوش کر نہیں سکتا۔ اس کے بندوں کو ہی خوش کر لوں، آیئے۔''

ایک بار جوش ملیح آبادی نے جگر صاحب کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ ''کیا عبرت ناک حالت ہے آپ کی، شراب نے آپ کو رند سے مولوی بنا دیا اور آپ اپنے مقام کو بھول بیٹھے، مجھے دیکھیے کہ میں ریل کے کھمبے کی طرح اپنے مقام پر آج بھی وہاں اٹل کھڑا ہوں، جہاں آج سے کئی سال پہلے تھا۔'' جگر صاحب نے جواب دیا ''بلاشبہ آپ ریل کے کھمبے ہیں اور میری زندگی ریل گاڑی کی طرح ہے جو آپ جیسے ہر کھمبے کو پیچھے چھوڑتی ہوئی ہر مقام سے آگے اپنا مقام بناتی جا رہی ہے۔''

دہلی میں محمود علی خاں نے جگر صاحب کے اعزاز میں ایک دعوت دی تمام مہمان تقریباً ایک دائرہ کی شکل میں اپنی اپنی کرسیوں پر تشریف فرما تھے کہ ایک صاحب بہت دیر سے تشریف لائے اور چپکے سے ایک کرسی کے پیچھے کرسی رکھ کر اس پر بیٹھ گئے۔ جگر صاحب نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے انہیں دیکھا اور کہنے لگے۔ ''ارے بھائی برابر آ جاؤ، اس طرح کیوں بیٹھ گئے، جیسے ہندوستان کے نقشے میں سیلون۔''

ایک بار آزاد ہند ہوٹل دہلی میں ایک مخصوص شعری نشست تھی۔ جگر اور جوش بھی اس میں شریک تھے۔ جگر نے جیسے ہی غزل پڑھنی شروع کی، جوش نے ان کا مذاق اڑانا شروع کر دیا اور اس طرح کے ایک شعر پر باریک آواز سے ''اوئی'' کہا، دوسرے شعر پر ''اوئی اللہ'' اور تیسرے شعر پر نسوانی آواز میں ''اللہ میں مرگئی'' یہ دراصل طنز تھا غزل کے نسوانی انداز پر۔ جگر برداشت کرتے ہوئے خاموش رہے لیکن جب جوش کسی طرح خاموش نہ ہوئے تو مجبوراً جوش کی طرف مڑے اور مسکرا کر فرمایا: ''ماشا اللہ! خوب ترقی کی ہے۔'' یہ جوش کی ترقی پسندی کی طرف بھی اشارہ تھا۔ جوش سن کر بڑے خفیف ہوئے اور پوری محفل قہقہہ زار بن گئی۔

بھوپال میں جگر مراد آبادی کے اعزاز میں ایک مخصوص محفلِ مشاعرہ منعقد ہوئی جس میں شعرائے بھوپال اور دوسرے نامور کہنہ مشق شعرا کے علاوہ بعض گمنام اور نوآموز شعرا نے اپنا کلام سنایا، اتفاق سے اس مشاعرے میں ایک دو مشہور شعرا کے بعض اشعار بہت ناقص تھے اور ایک مبتدی شاعر کی غزل کا ایک شعر جگر صاحب کو غیر معمولی طور پر پسند آیا۔

اگلے روز جب جگر صاحب کے کسی بے تکلف دوست نے مشاعرہ کے متعلق ان کا تاثر دریافت کیا تو جگر صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا:

''صاحب! قدرت کی طرف سے کسی اچھے شاعر کو سزا ملتی ہے تو اس پر کوئی گھٹیا شعر نازل ہو جاتا ہے اور جب کسی اچھے شعر کو سزا ملتی ہیں تو وہ کسی گھٹیا شاعر پر نازل کر دیا جاتا ہے۔''

ماہر القادری کے ہاں جگر صاحب کے اعزاز میں دعوت تھی۔ بے تکلف احباب کا جمگھٹا تھا۔

انہوں نے اپنی تازہ غزل سنائی، جس کا مطلع ہے:

آدمی آدمی سے ملتا ہے
دل، مگر کم کسی سے ملتا ہے

جب وہ غزل سنا چکے تو ماہر القادری نے کہا: ''اس غزل کا ایک شعر تو چھوٹ ہی گیا۔'' اور فی البدیہہ یہ شعر پڑھا:

جو جگر سے کبھی نہیں ملتا
ماہر القادری سے ملتا ہے

اس پر بڑا قہقہہ پڑا اور جگر صاحب نے خاص طور پر لطف لیا۔

گونڈہ کے ایک مشاعرہ میں جگر مراد آبادی کے ساتھ اسٹیج پر اور بہت سے شاعر بیٹھے ہوئے تھے۔ جگر صاحب کے نئے مجموعہ ''شعلۂ طور'' کا موازنہ ان کے پہلے مجموعہ ''آتش گل'' سے کیا جا رہا تھا۔ ایک مقامی شاعر جو جگر صاحب سے بغض رکھتے تھے اس ذکر سے کافی پریشان تھے۔ جب ان کے پڑھنے کا وقت آیا تو اتفاق سے ان کے سامنے لٹکتا ہوا گیس میں شعلہ سا آ گیا اور اس میں سے سرخ رنگ کی لپیٹیں نکلنے لگیں۔ اس پر وہ شاعر بولے کہ ذرا اس ''آتش'' کو میرے سامنے سے ہٹاؤ۔ میری آنکھوں کے لیے اس کی روشنی کافی ہے۔ جگر صاحب اس جملے میں چھپے ہوئے طنز کو سمجھ گئے لیکن خاموش رہے۔ منتظمین نے جب نیا گیس لا کر سامنے رکھا تو جگر صاحب بولے: ''لیجیے جناب! اب تو آپ کے سامنے ''شعلۂ طور'' لا کر رکھا دیا ہے۔ اس سے آپ کی نگاہیں ضرور خیرہ ہو جائیں گی۔''

ایک بار جوشؔ، وصلؔ اور جگرؔ ریل میں سفر کر رہے تھے۔ ایک پرانی وضع کے بڑے میاں، ان کے چٹکلوں اور لطیفوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ وصلؔ صاحب نے کہا: ''ارے جگر صاحب، ایک پان تو بنا دیجیے۔'' جگر کا نام سن کر وہ پرانی وضع کے بڑے میاں اُچھل سے گئے اور پھر کچھ سوچنے سے لگے۔ جب اُن سے ضبط نہ ہو سکا تو وہ جگر صاحب کے قریب آ گئے اور اُن کو گھورنے لگے۔ جگر صاحب نے پوچھا: ''جناب والا! کیا بات ہے؟'' انہوں نے پوچھا: ''جگر صاحب! مراد آبادی آپ ہی ہیں۔'' اُنہوں نے کہا: ''جی ہاں، فرمایئے۔'' بڑے میاں نے اُن کو پھر غور سے دیکھا اور آنکھیں جھکا کر کہا: ''میاں کچھ جنچے نہیں!'' جوشؔ سمیت سب نے اُن کے اس فقرے پر زور سے قہقہہ لگایا اور جگر صاحب کی آنکھوں میں خون اُتر آیا...... اُس دن سے ''میاں کچھ جنچے نہیں'' اُن کی چڑھ بن گئی۔

دیوان سنگھ مفتون

ولادت: ۱۸۹۰ء

وفات: ۱۹۷۵ء

ایک روز شام ایک ریاست کے وزیر اعظم جوشؔ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ دیوان سنگھ مفتون آ گئے۔ انہیں دیکھتے ہی وزیر اعظم صاحب کا رنگ فق ہو گیا اور جب گلاس بھر کر جوش صاحب نے ان کے سامنے رکھا تو انہوں نے دیوان سنگھ کی جانب اشارہ کیا کہ ان کے سامنے نہیں پیوں گا۔ دیوان سنگھ نے ان کو اشارہ کرتے دیکھ کر جوش صاحب سے کہا:

''جوش صاحب! پرائم منسٹر صاحب سے کہہ دیجیے، وہ شوق سے پئیں، میں ان کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں لکھوں گا۔ یہ والیٔ ملک نہیں ہیں، میں تو فقط والیان ملک پر حملہ آور ہوتا ہوں یعنی میں انسان کا نہیں سُوٴر کا شکار کھیلتا ہوں۔''

اسرار الحق مجاز ایک شام دیوان سنگھ مفتون سے ملنے کے لیے گئے تو انہوں نے فوراً ملازم سے چار درجن سوڈے کی بوتلیں لانے کے لیے کہا۔ ملازم چار درجن سوڈے کی بوتلیں لے آیا تو مجاز نے پوچھا:

''بھئی ہم تو صرف دو آدمی ہیں، پھر اتنا سوڈا کس لیے؟''

اس پر مفتون نے جواب دیا:

''دیکھتے جاؤ!'' اور فوراً ملازم سے کہا کہ ایک درجن سوڈے کی بوتلیں رکھ کر باقی تین درجن بوتلیں ساتھ والے دوکاندار کو بیچ کر جو پیسے ملیں اس سے ایک بوتل شراب اور کچھ نمکین لے آؤ۔''

سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ''ریاست'' کو کسی ریاست کے مہاراجہ نے وسکی سیٹ تحفتاً بھجوایا۔ صراحی اور چھے گلاس۔ اس پر جو نقاشی کی گئی تھی وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ سردار صاحب نے ایک دن ہنزے تھری اسٹار برانڈی کی بوتل منگوائی، اس صراحی میں ڈال کر ابھی آدھا پیک ہی انڈیلا تھا کہ بابائے اُردو مولانا عبدالحق کے بھائی شیخ ضیاء الحق تشریف لے آئے۔ سردار صاحب نے فوراً دوسرا گلاس منگوایا اور مولانا کو پیگ بنا کر پیش کیا۔ مولانا کے دوسرے پیگ کے ساتھ سردار صاحب نے بھی چھوٹے پیگ سے ساتھ دیا۔ مولانا نے پانچ بڑے پیگ پینے کے بعد صراحی، جس میں ابھی نصف بوتل براڈی موجود تھی، اٹھائی اور اپنے تھیلے میں ڈال کر کرسی سے اُٹھے اور فرمانے لگے: ''اچھا سردار صاحب! آداب، اجازت دیجیے۔''

میر تقی میر کی خودنوشت ''ذکرِ میر'' کا اُردو ترجمہ

میرؔ کی آپ بیتی

مرتب و مترجم: نثار احمد فاروقی

میرؔ اُردو شاعری کے ''پیمبر'' نہیں، خدا ہیں اور اُن کی ''خدائی'' کے حضور ایسے ایسے سرکشوں نے اپنی ''بندگی'' کا اظہار کیا ہے، جن کا مسلک ایک دوسرے سے مختلف ہی نہیں، بلکہ متضاد ہے۔ بھلا ناسخؔ اور غالبؔ اور ذوقؔ میں کوئی وجہ مشترک خیال میں آ سکتی ہے؟ لیکن اِس کے باوجود اِن تینوں نے میرؔ کی برتری اور اُستادی کا اعتراف کیا ہے۔ کس کا جی نہیں چاہے گا کہ اِس خدائے سخن کے حالات تفصیل سے معلوم کرے۔ ہماری خوش قسمتی کہ میرؔ نے خود اپنے حالات ''ذکرِ میرؔ'' کے عنوان سے فارسی میں رکھ دیئے تھے اور حُسنِ اتفاق سے یہ کتاب دست بردِ زمانہ سے محفوظ رہ گئی۔ زیرِ نظر کتاب اُسی خودنوشت سوانح عمری کا اردو ترجمہ ہے۔ چونکہ اصل فارسی نسخہ بھی اب دستیاب ہے، اِس لیے اُردو دُنیا کو مترجم کا شکرگزار ہونا چاہیے کہ اُنھوں نے اِسے اُردو میں منتقل کر کے اس سے استفادے کا حلقہ وسیع تر کر دیا۔ اِس کتاب کی اہمیت دوگنا ہے۔ میرؔ 1196ھ میں دہلی سے لکھنؤ گئے۔ اُن کی پیدائش غالباً 1136ھ میں ہوئی تھی۔ گویا سفرِ لکھنؤ کے زمانے میں اُن کی عمر ساٹھ برس کے لگ بھگ ہوگی۔ ہمارے پاس اِن ساٹھ برس کے حالات کا ''ذکرِ میرؔ'' سے زیادہ مستند اور کوئی ماخذ نہیں۔ (مالک رام)

رشید احمد صدیقی

ولادت: ۲۴ر دسمبر ۱۸۹۲ء (جونپور، یوپی)

وفات: ۱۵ر جنوری ۱۹۷۷ء (علی گڑھ)

پروفیسر محمد حسن نے ایک دفعہ رشید احمد صدیقی سے پوچھا: ''بڑے شاعر کی پہچان کیا ہے؟'' اس پر رشید احمد صدیقی نے جواب دیا: ''جو شاعر عورت سے جتنا زیادہ محتاط اور خدا سے جتنا گستاخ ہو، وہی بڑا شاعر کہلاتا ہے۔''

حکیم عبداللطیف اور رشید صاحب نینی تال میں تھے۔ شام کے وقت سیر کو نکلے تو کچھ دیر سستانے کو ایک جگہ ٹھہر گئے۔ ان سے بلندی پر کچھ خواتین بیٹھی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ان کی طرف سے دو چار کنکر لڑھک کر نیچے آئے اور ان میں سے ایک رشید صاحب کے چشمے پر لگا۔ رشید صاحب نے حکیم صاحب کو مخاطب کر کے کہا: ''حکیم صاحب آپ نے کچھ کیا ہو تو کیا ہو، لیکن سنگسار میں کیا جا رہا ہوں۔

ایک دن ممتاز حیدر صاحبہ (پرنسپل گرلز کالج، علی گڑھ) نے رشید صاحب کو خط لکھی کہ گرلز کالج کی میٹنگ کے لیے تاریخ مقرر کر دیں۔ رشید صاحب نے جواب میں لکھا: ''تاریخ تو لڑکی والوں کی طرف سے مقرر کی جاتی ہے، آپ مجھ سے تاریخ کے تعین کا اصرار کر رہی ہیں۔''

عصمت چغتائی جب پہلی بار رشید صاحب سے ملنے آئیں تو رشید صاحب کھرپی لیے گلاب کے پودوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ وہ سمجھیں، کوئی مالی ہے۔ ان سے کہا! رشید صاحب سے ملنا ہے انہیں اطلاع کر دو۔ رشید صاحب اسی طرح کھڑے رہے۔ ان کو خیال ہوا کہ یہ سمجھے نہیں بولیں۔ ''شاید ابھی نئے آئے ہو۔'' رشید صاحب نے کہا! ''یوں تو اس گھر میں سب سے پرانا میں ہی ہوں۔''

عرفانی صاحب ایک روز رشید صاحب سے ملنے گئے۔ قبل اس کے کہ رشید صاحب برآمد ہوں وہ بڑے انہماک سے گلاب کے پودے دیکھنے اور سوچنے لگے کہ گلابوں کی تعریف میں کوئی ایسا جملہ کہوں جو رشید صاحب کو محظوظ کر سکے۔ اچانک رشید صاحب برآمدے سے باہر آئے اور عرفانی اس قدر غور سے کیا دیکھا جا رہا ہے؟ عرفانی صاحب نے جواب دیا ''پھولوں کی اس خوبصورتی کو دیکھ کر بس جی چاہتا ہے کہ ابھی جان دے دوں اور انہیں گلابوں کے نیچے میری قبر ہو۔''

رشید صاحب معنی خیز انداز سے مسکرائے اور کہنے لگے:

''صاحب! آگرہ سے دہلی تک بہت سی جگہیں تھیں، یہ قبرستان بنانے کے لیے میرے ہی گھر کا انتخاب کیوں کیا۔''

ایک خاتون جو رشید صاحب کی بہت مداح تھیں، اپنے شوہر کے ساتھ ان سے ملاقات کو آئیں۔ دوران گفتگو کہنے لگیں: ''میں آپ کو اس وقت سے جانتی ہوں اور جب ہی سے پسند بھی کرتی ہوں، جب میری شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ رشید صاحب نے فوراً جواب دیا۔ غضب کیا آپ نے کہ مجھے جانتی تو آپ شادی سے قبل سے ہیں اور ملاقات کو اب اس وقت آئیں جب آپ کی شادی ہو چکی ہے۔

ڈاکٹر آمنہ خاتون علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں انشا پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے کام کررہی تھیں۔ ان دنوں پروفیسر رشید احمد صدیقی وہاں صدر شعبہ تھے۔ اسی دوران آمنہ خاتون کے یہاں بچے کی ولادت کا وقت قریب آ گیا تو انہوں نے چھٹی کے لیے درخواست دی۔ درخواست جب رشید صاحب کے یہاں پہنچی تو انہوں نے چھٹی لینے کی وجہ دریافت کی جب رشید صاحب کو معلوم ہوا کہ یہ ماں بننے والی ہیں تو انہوں نے فرمایا ''ہم نے تو انہیں تحقیق کے لیے بلوایا تھا، لیکن انہوں نے یہ تخلیق شروع کردی۔''

علی گڑھ میں ایک ناخواندہ مگر پڑھے لکھوں کی صحبت اٹھانے والے ایک صاحب استاد چھوہارا ہوا کرتے تھے۔ وہ ہر ایک ادبی محفل میں جا پہنچتے۔ ایک مرتبہ پروفیسر رشید احمد صدیقی صدارت کررہے تھے۔ جب سب لوگ موضوع پر اظہارِ خیال کر چکے تو رشید صاحب نے استاد چھوہارا کو مخاطب کر کے کہا: ''استاذ' آپ بھی کچھ کہیے۔'' استاد نے دونوں ہاتھ باندھ کر عرض کیا۔ ''حضور! میں جاہل آدمی بھلا اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' رشید صاحب نے کہا ''نہیں استاد! کبھی کبھی جاہل آدمی بھی بڑے پتے کی بات کہہ جاتا ہے۔'' استاد چھوہارا نے برجستہ کہا: ''کیا پتے کی بات کہی ہے آپ نے۔''

مولانا عبدالمجید سالک

ولادت: ۱۲؍دسمبر ۱۸۹۳ء (بٹالہ، ضلع گورداس پور)

وفات: ۲۷؍ستمبر ۱۹۵۹ء (لاہور)

فیروز خان نون کی پہلی بیوی بیگم نون کے نام سے موسوم تھیں۔ جب فیروز خان نون نے دوسری شادی کر لی تو ان کی ایک شناسا نے مولانا سالک سے بطور مشورہ پوچھا: ''اب دوسری بیوی کو کیا کہا جائے گا؟''

مولانا نے بے ساختہ جواب دیا: ''آفٹرنون۔''

ایک بار پانی کی قلت سے مولانا عبدالحمید سالک بہت پریشان تھے۔ پطرس بخاری کو جب ان کی پریشانی کا علم ہوا تو وہ پانی کی کئی بالٹیاں اپنی کار میں رکھ کر مولانا کی کوٹھی پر لے گئے اور مولانا سے کہنے لگے: ''دیکھئے حضور آپ کو پانی پانی کرنے کے لیے حاضر ہو گیا ہوں۔''

سالک صاحب نے فوراً جواب دیا: ''پطرس صاحب، آپ تو کیا، یہاں بڑے بڑے پانی بھرتے نظر آتے ہیں۔''

سالک صاحب نے بڑی نکتہ رس طبیعت پائی تھی۔ ایک بار پنڈت ہری چند اختر سے فرمانے لگے...... پنڈت جی آپ کا نام کیا ہوا، مسلم لیگ کا جھنڈا ہو گیا۔ پنڈت جی پوچھنے ہی والے تھے کہ سالک صاحب نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے وضاحت کی، ''دیکھیے نا، یہ جھنڈے کا رنگ ہے سبز یعنی ''ہری'' اور اس پر چاند اور تارے کا نشان یعنی ہری چند اختر۔

سالک مرحوم لکھتے ہیں کہ خواجہ حسن نظامی نے مجھ سے پوچھا کہ آپ بڑے سمجھدار آدمی ہیں بھلا یہ تو بتایئے انسان میں متانت کس عمر میں آتی ہے؟

میں سمجھ گیا کہ مجھ پر چوٹ ہے کہ 37 برس کے ہو گئے ابھی تک غیر سنجیدہ ہو۔ میں نے نہایت سُوکھا منہ بنا کر جواب دیا: ''حضرت بات یہ ہے کہ متانت اور عمر کا تعلق کچھ اعتبار سا ہے۔ بعض لوگ پیدائشی متین ہوتے ہیں لیکن بعض صوفیائے کرام کو دیکھا ہے کہ پچاس پچاس برس کے ہو گئے لیکن رہے وہی مسخرے کے مسخرے۔''

سالک صاحب ہند و پاک مشاعرے میں شرکت کے لیے دہلی آئے ہوئے تھے۔ موتی محل ہوٹل میں قیام تھا۔ مجمع احباب میں گھرے بیٹھے تھے کہ صاحبِ ذوق نے اپنے یہاں کھانے پر تشریف لانے کی درخواست کی۔ سالک صاحب نے عذر پیش کیا تو خوشتر گرامی نے کہا: کہ مولانا ان کی دل شکنی نہ کیجیے، دعوت قبول کر لیجیے۔ سالک صاحب اپنے روایتی تبسم کے ساتھ فرمایا: ''مرغ و ماہی کی اس دعوت کو قبول کرنے میں کوئی عذر نہیں لیکن خطرہ یہ ہے کہ مرغ و ماہی کے پیٹ میں مشاعرہ بھی چھپا ہوا ہے۔'' ان کے اس جملہ پر محفلِ احباب قہقہہ زار بن گئی۔

سالک صاحب روزنامہ ''زمیندار'' میں فکاہیہ کالم ''افکار و حوادث'' لکھا کرتے تھے۔ ایک زمانے میں وہ ایک بار دہلی آئے تو خواجہ حسن نظامی سے ملنے کے لیے بستی نظام الدین گئے۔ خواجہ صاحب بڑے تپاک سے پیش آئے اور درگاہ دکھانے کے لیے ان کو ساتھ لے کر چلے۔ ایک معمولی سے مکان کی طرف اشارا کر کے فرمایا: یہ ''ایمان خانہ'' ہے۔ سالک صاحب نے کہا: اس پر کیا موقف ہے، اس نواح کے تو سبھی مکان ایمان خانے ہیں۔ اور ہم جہاں سے اٹھ کر آئے ہیں کیا وہ ''بے ایمان خانہ'' ہے۔ خواجہ صاحب اس نکتہ سنجی پر خوب ہنسے اور فرمایا: آپ افکار لکھتے ہی نہیں بولتے بھی ہیں۔

لارڈ ارون ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہوئے، ان کا دایاں ہاتھ جنگ میں کٹ چکا تھا۔ مختلف اخبارات نے اس تقرری پر مخالفانہ انداز میں لکھا لیکن مولانا سالک نے ''افکار وحوادث'' میں جس طریقے سے لکھا وہ قابلِ تعریف ہے۔ لکھتے ہیں: ''ہندوستان پر حکومت کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔''

ایک زمانہ میں ان کی مولانا تاجور سے شکر رنجی ہوگئی۔ ایک محفل میں ادیب شاعر جمع تھے کسی نے سالک صاحب سے پوچھا: تاجور اور تاجدار میں کیا فرق ہے؟

سالک صاحب نے جواب دیا: ''وہی جو جانور اور جاندار میں ہے۔''

مولانا عبدالمجید سالک ہشاش و بشاش رہنے کے عادی تھے اور جب تک دفتر میں رہتے، دفتر قہقہہ زار رہتا۔ ان کی تحریروں میں بھی ان کی طبیعت کی طرح شگفتگی ہوتی تھی۔ جب لارڈ ویول ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہوئے تو سالک نے انوکھے ڈھنگ سے بتایا کہ وہ ایک آنکھ سے محروم ہیں چنانچہ مولانا سالک نے انقلاب کے مزاحیہ کالم ''افکاروحوادث'' میں لکھا کہ ''لارڈ ویول کے وائسرائے مقرر ہونے کا یہ فائدہ ہے کہ وہ سب کو ایک آنکھ سے دیکھیں گے۔''

عبدالمجید سالک کو ایک بار کسی دل جلے نے لکھا: ''آپ اپنے روزنامہ میں گمراہ کن خبریں چھاپتے ہیں اور عام لوگوں کو بے وقوف بنا کر اپنا اُلو سیدھا کرتے ہیں۔'' سالک صاحب نے نہایت حلیمی سے جواب دیتے ہوئے لکھا: ''ہم تو جو کچھ لکھتے ہیں ملک وقوم کی

بہبودی کے جذبہ کے زیرِ اثر لکھتے ہیں اور اگر ہزاروں قارئین میں آپ جیسا ایک آدمی بھی ہمارے کسی مضمون سے متاثر ہوکر نیک راہ اختیار کرلے،تو ہم سمجھیں گے ہمارا اُلو سیدھا ہوگیا۔''

گرمی کے موسم میں کوئی نوعمر ادیب عبدالسالک سے ملنے آئے۔ سالکؔ صاحب کے کمرے میں بجلی کا پنکھا چل رہا تھا جس کی بھینی بھینی خوشبو پھیل رہی تھی اندر ہر چیز قرینے سے نفاست سے رکھی ہوئی تھی۔ وہ ادیب کمرے کی شاداب فضا سے متاثر ہوکر کہنے لگا: ''سالکؔ صاحب آپ نے تو اپنے کمرے کو بالکل جنت بنا رکھا ہے۔'' سالک صاحب نے فوراً جواب دیا: ''نہیں صاحب! آپ کے آنے سے پہلے اس جنت میں غلمان کی کمی تھی۔''

سالک صاحب اور مولانا تاجور دونوں کے درمیان کشیدگی رہتی تھی۔ ایک مرتبہ سالکؔ کے ایک دوست نے کہا کہ آپ کے درمیان یہ کشمکش ٹھیک نہیں، صلح ہوجانی چاہیے۔ سالک بولے: ''حضور ہماری طرف سے تو ''کش'' ہے۔ ''مکش'' تو تاجور صاحب کرتے ہیں۔ آپ کی نصیحت تو ان سے ہونی چاہیے۔''

حضرتِ سیماب اکبر آبادی اپنے چہیتے شاگرد ساغر نظامی کے ساتھ لاہور وارد ہوئے اور یہاں ٹکنا چاہا، مشاعروں میں جھڑپیں ہوئیں جس سے محاذ کھل گیا، وجہ نزاع ساغر نظامی بھی تھے جو بلا کے خوش آواز تھے۔ سرخ و سپید رنگ، بونا سا قد، سرتا قدم ادا ہی ادا، مشاعرہ پڑھتے تو سامعین کو بہالے جاتے''نیاز مندانِ لاہور'' کے واحد شاعر ابوالاثر حفیظ جالندھری تھے۔ گلا انہوں نے بھی نورانی پایا تھا ایک نیام میں دو تلواریں سما سکتی ہیں نہ ایک مشاعرے میں دو گلے.... نتیجہ یہ کہ آپس میں ٹھن گئی۔

سر شیخ عبدالقادر کی صدارت میں ایک طرحی مشاعرہ تھا۔ قافیہ سیلاب تھا۔ ردیف تھی "رہ گیا"۔ ساغر نظامی نے مقطع میں حفیظ جالندھری پر طنز کیا:

ساغر کے زمزموں کی تب وتاب الاماں — ہر معرکے میں شاعر پنجاب رہ گیا

"نیازمندان" لاہور کے سرکردہ رکن مولانا عبدالمجید سالک، پھریری لے کر اٹھے:

میاں صاحبزادے! وہ دوسرا مقطع بھول گئے؟

پیرِ مُغاں کی بادہ گُساروں سے ٹھن گئی — ساغر کی تہہ میں قطرۂ سیماب رہ گیا

مشاعرہ لوٹ پوٹ ہوگیا۔ سیماب اکبرآبادی کٹ کے رہ گئے ساغر نظامی کا رنگ اڑ گیا۔

مولانا عبدالمجید سالک روزنامہ ''زمیندار'' کے ایڈیٹر تھے۔ ترک موالات کی تحریک میں برطانیہ کے خلاف مضامین لکھنے کی پاداش میں گرفتار ہوئے اور ایک سال قید بامشقت کی سزا پائی۔ اس کے بعد ''زمیندار'' کے بہت سے ایڈیٹر گرفتار ہوئے۔ ہوم ممبر سرجان مینارڈ جیل کے معائنے کے لیے تشریف لائے تو سالک صاحب سے پوچھا کہ ''زمیندار'' کا اصل ایڈیٹر کون ہے؟'' سالک صاحب نے جواب دیا: ''کم ازکم میں تو اصلی ہوں۔'' سرجان مینارڈ نے ہنس کر کہا: ''یہ تو ہم جانتے ہیں لیکن آج کل جس کا نام ''زمیندار'' میں ایڈیٹر کے طور پر لکھا جارہا ہے وہ تو کوئی پان فروش ہے۔'' سالک صاحب نے جواب دیا: ''جب اصل ایڈیٹروں کو اس تیزی سے گرفتار کرتے جائیں گے تو کسی پان فروش کو ہی آگے آنا پڑے گا۔''

مولانا سالک کا خط بہت اچھا تھا۔ ایک بار انہوں نے رسا رام پوری کو اپنی غزل بھیجی اور رائے چاہی۔ رسا رام پوری نے جواباً لکھا: ''آپ کا خط بہت خوبصورت ہے۔''

فراق گورکھپوری

ولادت: ۲۸/اگست ۱۸۹۶ء (گورکھپور، یوپی)

وفات: ۳/مارچ ۱۹۸۲ء (نئی دہلی)

فراق صاحب لال قلعے کے مشاعرے میں شرکت کے لیے دہلی تشریف لے گئے۔ مشاعرے سے قبل مرکزی وزیر رفیع احمد قدوائی کے گھر پر دعوت تھی۔ فراق صاحب ذرا پہلے پہنچ گئے، وہ دروازے پر اپنی چھڑی لیے ہوئے ٹہل رہے تھے کہ مجروح سلطان پوری، سردار جعفری اور ساحر لدھیانوی ایک ساتھ کار سے اترے اور لپک کر فراق صاحب سے ملے۔ فراق صاحب نے بھی پوری گرمجوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا: ''ارے مجروح!'' پھر سردار جعفری کی جانب مڑے اور ان کی بھی خیر و عافیت پوچھی اس کے بعد ساحر کی جانب آئے اور کہا: ''ارے ساحر! آج کل تو تم آثارِ قدیمہ کی بہت اچھی شاعری کر رہے ہو۔ تاج محل پر کیا خوب لکھا ہے:

اک شہنشاہ نے دولت کا سہا را لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق
میرے محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے

ایسا کرو کہ اب جامع مسجد پر بھی لکھ ڈالو:

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی عبادت کا اڑایا ہے مذاق
میرے اللہ کہیں اور ملا کر مجھ سے

اس کے بعد سب ہنسنے لگے۔

شعرا کی ایک دعوت میں فراق گورکھپوری اور جگن ناتھ آزاد پاس پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ جب کھانا ان کے سامنے آیا تو فراقؔ نے آزادؔ سے مخاطب ہو کر کہا: ''کھایئے آزاد صاحب، نہایت لذیذ گوشت ہے۔''

آزاد نے جواب میں ایک عام سا جملہ چست کیا: ''آپ کھایئے، ہم تو روز کھاتے ہیں۔''

فراقؔ نے برجستہ کہا: ''لیکن یہ خالص گھی کا پکا ہوا ہے۔''

ڈاکٹر اعجاز حسین الٰہ آباد یونیورسٹی میں غزل پڑھا رہے تھے۔ فراق صاحب بھی وہاں بیٹھے تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر اعجاز حسین سے پوچھا: ''ایسا کیوں کہا جاتا ہے کہ غزل گو شعراء عام طور سے بدکردار ہوتے ہیں۔''

اعجاز صاحب برجستہ بولے: ''ان کے سامنے آپ کی مثال رہتی ہے۔''

کلاس میں ایک زبردست قہقہہ پڑا اور فراق صاحب کی آواز قہقہوں میں دب گئی، جواب بھی کچھ کہنا چاہتے تھے۔

تقریباً ۱۹۴۴ء میں ایک بار جوش ملیح آبادی الٰہ آباد یونیورسٹی میں گئے۔ ادبی تقریب میں ڈائس پر جوش کے علاوہ فراق بھی موجود تھے۔ جوش نے اپنی طویل نظم ''حرفِ آخر'' کا ایک اقتباس پڑھا۔ اس میں تخلیقِ کائنات کی ابتداء میں شیطان کی زبانی کچھ شعر ہیں۔ جوش شیطان کے اقوال پر مشتمل کچھ اشعار سنانے والے تھے کہ فراق نے سامعین سے کہا:

''سنیے حضرات، شیطان کیا بولتا ہے؟''

اور اس کے بعد جوش کو بولنے کا اشارہ کیا۔

فراق گورکھپوری سے کسی نے پوچھا: ''بحیثیت شاعر آپ اور جوش صاحب میں کیا فرق ہے؟''

فراق نے اپنی بڑی بڑی وحشت ناک آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا: ''جوش موضوع سے متاثر ہوتا ہے اور میں موضوع کو متاثر کرتا ہوں۔''

فراقؔ کے پاس ایک نیا شاعر اصلاح کے لیے آیا اور اپنا تعارف کرواتے ہوئے بتایا کہ میری غزلیں پورے ہندوستان کے معروف رسالوں میں شائع ہوتی ہیں۔ آپ نے یقیناً پڑھی ہوں گی؟

فراق نے شاعر کے دعوے کی تردید کرتے ہوئے کہا: ''تمام رسالوں میں تو بواسیر کی دوائیوں کے اشتہار بھی شائع ہوتے ہیں۔ کیا تم توقع رکھتے ہو کہ میں انہیں بھی پڑھتا ہوں گا؟''

علی گڑھ کے ایک مشاعرے میں جب آل احمد سرور کا نام پکارا گیا تو فراق صاحب نے پہلو بدلا:

''اس شریف آدمی کو کہاں بلا لیا۔''

''آپ بھی تو ہیں۔'' سامعین میں سے کسی نے آواز کسی۔

''بھئی میرا شمار تو اوباشوں میں ہوتا ہے۔'' اور مشاعرہ قہقہوں سے گونج اُٹھا۔

علی گڑھ کے ایک مشاعرے میں جب فراق صاحب مائیک پر آنے لگے تو لڑکوں نے نعرہ کیا:

''ٹوپی پہنو، ٹوپی پہنو''

فراق صاحب تھوڑی دیر خاموش کھڑے رہے جب شور تھما تو انہوں نے بہت سمجھانے کے سے انداز میں کہا:

''---میاں ٹوپی اوڑھی جاتی ہے--- جوتا پہنا جاتا ہے۔''

مجمع قہقہوں سے گونج اُٹھا اور شور کرنے والے شرمندہ ہو کر رہ گئے۔

ایک صاحب نے باتوں باتوں میں ایک شعر پڑھا جس کا مفہوم کچھ یوں تھا:

''دیوارِ گلستان پہ میرا نام دیکھتے ہی دوشیزۂ بہار کا چہرہ اتر گیا۔''

شعر سنتے ہی فراق صاحب نے کہا: ''اس نے بھی سوچا ہوگا کہ کس منحوس کا نام ہے۔''

کسی مشاعرے میں ایک اجنبی نے فراق صاحب سے دریافت کیا: ''کیوں صاحب، شاعرِ اعظم کے بنیادی اوصاف کیا ہونے چاہئیں؟''

دفعتاً فراق صاحب کی نظر روش صدیقی صاحب پر پڑی جو قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے اور فراق نے ان کے ننھے منے قد پر مسکراتے ہوئے ایک نظر ڈال کر بڑی برجستگی سے کہا:

''سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ شاعرِ اعظم کو قد آدم ہونا چاہیے۔''

امرتسر کے ایک ہوٹل میں فراق صاحب چند شعرا کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان حضرات کا قیام بھی اسی ہوٹل میں تھا۔ اسی وقت ہوٹل کا منیجر ایک رجسٹر لے کر آیا اور ساحر ہوشیار پوری کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: ''آپ لوگ ذرا اس کی خانہ پری کر دیں۔''

ساحر صاحب نے اپنا نام اور پتہ تو لکھ دیا لیکن جب ''پیشے'' کے خانے پر نظر پڑی تو الجھ گئے اور فراق صاحب سے دریافت کیا: ''کیوں صاحب! میں اپنا پیشہ کیا لکھوں؟''

''معشوق لکھ دو۔'' فراق صاحب بولے۔

''ارے صاحب، اس عمر میں؟'' ساحر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آگے پنشن یافتہ بھی لکھ دینا۔'' فراق صاحب نے نہایت سادگی سے مشورہ دیا۔

علی گڑھ یونیورسٹی میں رات کو جب مشاعرے میں ان کو دعوت سخن دی گئی تو فراق صاحب بیٹھے بیٹھے ہی شعر سنانے لگے۔ حاضرین نے شور مچایا۔ حضرت کھڑے ہو کر پڑھیے۔ فراق صاحب فرمانے لگے: ''بھائیو! ازار بند ٹوٹ گیا ہے کہیے تو کھڑا ہو جاؤں؟''۔۔۔ قہقہے برسنے لگے۔

ایک بار لکھنؤ میں سیمینار میں بہت ہی گرما گرم بحث ہو رہی تھی۔ موضوع تھا ''ادب میں فحاشی''۔ فراق صاحب سب کی باتوں کو خاموشی سے سن رہے تھے کہ یکا یک انہوں نے سوال کر دیا: ''آخر یہ فحاشی ہے کیا؟'' اس پر کسی نے جواب دیا: ''فحاشی وہ کام ہے جو چھپ کر کیا جائے۔'' اس پر فراق صاحب نے بہت معصومیت سے سوال کیا: ''جیسے میں پیشاب کرتا ہوں؟'' ان کی معصومانہ بات پر سبھی ہنسنے لگے اور فضا کا بوجھل پن ختم ہو گیا۔

ایک بار کسی سبب سے ایک نوجوان شاعر کو فراق گورکھپوری کے پڑھنے کے بعد کلام پڑھنے کے لئے بلایا گیا۔ نوجوان پس وپیش میں تھا اور بار بار فراق صاحب کی طرف دیکھ رہا تھا کہ فراق جیسے سینئر شاعر کے بعد کیسے پڑھے۔ فراق صاحب نے نوجواں کی طرف مسکرا کر دیکھا اور بولے: ''میاں! جب تم میرے بعد پیدا ہو سکتے ہو تو میرے بعد کلام کیوں نہیں سنا سکتے۔''

کانپور کے ایک مشاعرے میں مقامی شاعر جناب نشتر صاحب (جو خاصا تن وتوش رکھتے تھے) کو دیکھتے ہی فراق بول اٹھے۔ اتنا موٹا نشتر، یہ تو ظلم ہے۔ حاضرین کے ساتھ نشتر بھی ہنسنے لگے۔ اس مشاعرے میں جب ایک شاعر اپنا کلام پڑھ رہے تھے تو نشور واحدی نے ٹوکا...... شعر میٹر سے بے نیاز ہیں۔ جواب فراق نے دیا۔ پڑھنے دو زمانہ میٹر کا نہیں کلو میٹر کا ہے۔

الہ آباد جنکشن اسٹیشن پر ایک پارسی نوجوان نے فراق صاحب کو پہچان لیا اور بڑی عقیدت کے ساتھ ان کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔

''فراق صاحب'' چند لمحوں بعد انہوں نے کہا ''میں علی گڑھ یونیورسٹی کا طالب علم رہا ہوں اور وہیں ایک مشاعرے میں آپ کو پہلی بار دیکھا تھا۔ میرا نام...... دارو والا ہے چاہتا ہوں کہ کسی دن شرف قدم بوسی حاصل کروں۔''

''میں چاہتا ہوں کہ آپ کا پتہ بھی جان لوں۔''

''میں بینک روڈ پر رہتا ہوں، وہاں پہنچ کر میرا گھر پوچھنے کی بجائے آپ کسی کو بھی اپنا نام مسٹر دارو والا بتا دیجیے گا۔ لوگ نام کی رعایت سے آپ کو میرے پاس پہنچا دیں گے۔''

''ایک صاحب نے کچھ دنوں کے لیے ڈاڑھی رکھی پھر صاف کرا دی۔ ایک دن کافی ہاؤس میں فراق صاحب کو دیکھ کر ان کی میز پر آ گئے اور بولے، فراق صاحب صبح پتا جی کمرے میں اپنی ڈاڑھی کے ساتھ آئے اور......''

اور ان کا جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی فراق صاحب نے ہنستے ہوئے کہا:

''اچھا، تو ایک ہی ڈاڑھی ہے جو کبھی بیٹے کے پاس رہتی ہے اور کبھی باپ کے پاس۔''

عرصہ پہلے کی بات ہے۔

فراق صاحب لکھنؤ میں حکیم مرحوم کے مطب میں بیٹھے ہوئے ان سے باتیں کر رہے تھے۔

اتنے میں حکیم صاحب نے ایک مریض کو دیکھا اور نسخہ لکھنے کے بعد پرہیز کی تاکید کرتے ہوئے بولے ''گرم چیزوں سے پرہیز کیجیے گا۔''

''گرم چیزیں'' مریض نے وضاحت طلب نظروں سے حکیم صاحب کی طرف دیکھا اور اس سے پہلے کہ حکیم صاحب کچھ کہتے، فراق صاحب نے جلدی سے مسکراتے ہوئے کہا ......''جی ہاں، گرم چیزیں مثلاً آگ۔''

''ایک صاحب جن کو اپنے بارے میں بڑی خوش فہمیاں تھیں اور جن کی ادبی زندگی کی عمر چند سالوں سے زیادہ نہ تھی۔ اپنے تخلیقی عمل کا ذکر بڑے شدومد سے کر رہے تھے اور وہ بھی فراق صاحب کے سامنے۔ بولے

''میں جب لکھنے بیٹھتا ہوں تب میرے سامنے کالی داس، شیکسپیئر، ملٹن، سب ایک لائن میں ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔'' فراق صاحب چپ چاپ سنتے رہے پھر بولے۔

''جہاں آپ بیٹھ کر لکھتے ہیں وہاں کی زمین کھدوا کر دیکھیے۔''

نوخیز فنکار بولے۔''کیوں''

''وہاں ضرور کوئی گدھا دفن ہوگا۔ تبھی آپ کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے۔''

فراق صاحب نے ان کے مرض کی تشخیص کر دی۔

ریل میں ایک شاعرہ ان کی ہم سفر ہوئیں۔ انہوں نے فراق صاحب سے اپنی شاعری کے بارے میں ان کی رائے جاننا چاہی۔ فراق صاحب بولے:

''شعر اچھا خاصا کہہ لیتی ہو...... قبول صورت بھی ہو'' اور اپنی نیک صلاح بھی دے ڈالی۔

''لیکن بھئی زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے تھوڑی بدچلنی ضروری ہے۔''

''ایک صاحب دہلی سے تشریف لائے جن کو دیکھ کر ہی فراق صاحب کے جسم میں چیونٹیاں کاٹنے لگتی تھیں۔ وہ آتے تو گھنٹوں کی خبر لیتے...... نہایت بور باتیں کرتے تھے۔ مگر نیاز مند قسم کے آدمی تھے فراق صاحب جھیل لیتے تھے۔ ان کو دیکھ کر فراق صاحب نے ناک بھوں چڑھائی مگر رسماً استقبال کیا۔ کافی دیر تک بے وقوفی کی باتیں کرنے کے بعد چپ ہوئے پھر کچھ وقفہ کے بعد سلسلہ کلام جاری رکھنے کے لیے بولے:

''اور سنایئے فراق صاحب''

فراق صاحب کو موقع مل گیا بولے کیا سناؤں صاحب ایسے ایسے لوگ آجاتے

ہیں۔ آج صبح ایک صاحب دہلی سے آئے تھے بے وقوفی کی باتیں کرتے رہے۔ ان پر چلایا۔ ان کو ڈانٹا، ان کو گالی دی، ان کو دھکا دیا مگر صاحب ...... وہ ایسے ہی بیٹھے رہے جیسے آپ بیٹھے ہیں۔"

"گیان پیٹھ انعام ملنے کے بعد ہندوستانی اکادمی کی ایک تقریب میں فراق صاحب شامل ہوئے وہاں ایک معزز خاتون بھی تھیں۔ انہوں نے فراق صاحب سے دلار میں کہا "فراق صاحب آپ کو انعام ملا اور آپ نے بہنوں کو یاد بھی نہ کیا کم سے کم ہم بہنیں مٹھائی کی حق دار تو تھیں ہی۔"

فراق صاحب جن کے والد کچی گرہستی چھوڑ کر فوت ہو گئے تھے اور بہنوں کی شادی بیاہ کی ذمہ داری کم سنی میں ان کے کاندھوں پر آن پڑی تھی۔ گھبرا گئے اور بولے۔

"مٹھائی جب چاہو کھا لو مگر میں اپنی ہی بہنوں سے پریشان تھا۔ مجھے اور بہنیں نہیں چاہئیں۔

الٰہ آباد یونیورسٹی کے مسلم بورڈنگ ہاؤس سے ایک صاحب وابستہ تھے جن کو لوگ بوگیاڈو Bogaido کہتے تھے۔ نہایت بھدی اور بے ہنگم آواز کے مالک تھے۔ آدمی بھی بہت بور تھے اور ایک دن فراق صاحب سے ملنے آئے اور باہر ہی سے آواز لگائی۔

"فراق صاحب گھر پر تشریف رکھتے ہیں۔"

فراق صاحب نے آواز سنی اور پہچان گئے ...... اندر ہی سے بولے۔

"آپ جو صاحب بھی ہیں۔ آپ کی آواز نہایت بے ہودہ اور تکلیف دہ ہے لیکن تشریف لایئے۔" ...... یہ کہتے ہوئے باہر آئے اور سلسلہ کلام جاری رکھا۔

"آیئے اور مجھے تباہ کیجیے۔ کم سے کم اتنی دیر دنیا تو آپ سے محفوظ رہے گی۔"

ایک دن مجمع شاگردوں میں ایک نووارد تھا اور اس نے میر کی شاعری پر اوٹ پٹانگ تبصرہ شروع کر دیا۔ فراق صاحب سے نہ رہا گیا فرمایا:
''تم کیلشیم کے اجزاء سے واقف ہو؟''
اس نے نفی میں جواب دیا۔ کہنے لگے ''جب تم کیلشیم کی پراپرٹیز نہیں جانتے تو تم میر کی شاعری کو کیسے سمجھ سکتے ہو۔'' نکل جاؤ اور اس کو بری طرح دوڑالیا۔

شعبہ انگریزی میں ایک پروفیسر بھگوت دیال تھے ...... تعلیم ان کی ولایت میں ہوئی تھی۔ انگریزوں کی طرح بولنے کی کوشش کرتے تھے۔ ایک دن اسٹاف روم میں فراق نے بھگوت دیال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ بھگوت دیال، اب تمہاری انگریزی سمجھ میں آنے لگی ہے۔ ایک بار پھر ولایت ہو آؤ۔''

''الٰہ آباد یونیورسٹی میں پنڈت جواہر لال نہرو تشریف فرما تھے۔ میور ہال میں ان کا لیکچر ہو رہا تھا۔ اپنی تقریر میں کسی تاریخی واقعہ کا بھی انہوں نے ذکر کیا۔ جب پنڈت جی اپنی تقریر ختم کر چکے تو ایک بزرگ پروفیسر نے اٹھ کر پنڈت نہرو سے کہا کہ آپ نے جس واقعہ کا ذکر کیا ہے وہ فلاں سن میں نہیں بلکہ فلاں سن میں ہوا تھا۔ فراق صاحب کو یہ بات اچھی نہ لگی وہ فوراً بول پڑے سٹ ڈاؤن پروفیسر

You are a Crammer of history, and he is a creator of history.

(تم رٹو طوطے ہو، وہ تاریخ ساز ہیں پنڈت جی کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔)

ایک مرتبہ دوسری جنگ عظیم کے دوران وہ (فراق امرناتھ جھا سے ملنے گے۔ اس دن ایک ہفتہ پہلے جاپانیوں نے مرتبان شہر پر قبضہ کرلیا تھا جھا صاحب نے پوچھا کہیے فراق صاحب کیا حال ہے۔آپ نے فرمایا حال بعد میں بتاؤں گا پہلے ایک لطیفہ سن لیجیے میں اعجاز صاحب کے یہاں گیا تھا ان سے میں نے کہا بھئی جاپان نے بڑے اہم شہر مرتبان پر قبضہ کرلیا اعجاز صاحب کو واقعہ معلوم تھا وہ بھی افسوس کرنے لگے مگر ان کی بیوی نے مرتبان کو برتن سمجھ کر کہا ''ارے کیا جھاڑو پیٹوں نے مرتبان بھی لے لیا۔ اب اچار کا ہے میں رکھا جائے گا۔''

یہ لطیفہ سن کر جھا صاحب مسکرا پڑے دوسرے دن میں (اعجاز صاحب) جھا صاحب سے ملنے گیا تو انہوں نے یہ لطیفہ سنایا۔ وہاں سے اٹھ کر میں سیدھے فراق صاحب کے پاس گیا کہ جناب نے ایک لطیفہ بلاوجہ میری بیوی سے منسوب کردیا...... میرے تیور دیکھ کر مسکرا پڑے۔کہا بھائی یہ لطیفہ راستے میں تیار ہوا تھا جلدی میں کوئی اور کردار نہیں ملا تمہاری بیوی کا نام لے لیا اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے جاؤ تم میری بیوی کا نام لے کر دو لطیفے سنا آؤ۔''

''جس زمانے میں فراق کانگریس کے انڈر سیکرٹری تھے۔ان کو اچھے نئے کپڑوں کا شوق ہوگیا۔انہوں نے ایک قمیص بنوائی جس میں رنگ برنگے بڑے چھوٹے پتے بنے ہوئے تھے...... جب وہ اس قمیص کو پہن کر آنند بھون گئے تو جواہر لال نے ان کو دیکھتے ہی کہا:

''اگر کسی جانور نے دیکھ لیا تو آپ کو چر جائے گا۔''

''جواہر لال نہرو فراق صاحب کو رگھوپتی کے نام سے جانتے تھے۔ اس وقت تک رگھوپتی سہائے، فراق نہیں ہوئے تھے عام لوگ انہیں سہائے صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ ایک بار جب وہ جواہر لال سے ملنے آنند بھون گئے تو انہوں نے نوکر سے کہا کہ اندر جا کر جواہر لال کو اطلاع کر دو۔ نوکر نے جا کر اندر کہا۔ آپ سے سہائے صاحب ملنے آئے ہیں۔''

''کون سہائے صاحب'' یہ کہتے ہوئے جواہر لال باہر نکلے آئے اور فراق صاحب کو دیکھ کر بولے: ''اچھا تو آپ ہیں سہائے صاحب۔ اگر یہی حال رہا تو کچھ دنوں میں آپ صرف ''ہائے'' رہ جائیں گے۔''

بستی کی ترقی پسند مصنّفین کانفرنس کی صدارت آل احمد سرور نے کی تھی۔ کانفرنس کے فوراً بعد ایک مشاعرے کا اہتمام تھا۔ سرور صاحب نے اتنا لمبا خطبہ صدارت پڑھا کہ مشاعرے میں تاخیر ہوگئی۔ مشاعرے کے فوراً بعد فراق صاحب نے سرور صاحب سے کہا:

''سرور صاحب! آپ نے اتنا لمبا خطبہ صدارت پڑھ دیا۔ اس عرصہ میں تو آپ سات آٹھ شعرا کو بھگتا سکتے تھے۔''

بھوپال کے ایک مشاعرے میں عمیق حنفی اپنی غزل سنا رہے تھے۔ مطلع تھا:

آوارگانِ شہر میں گردانتے تو ہیں
چلئے کسی طرح وہ ہمیں جانتے تو ہیں

جب یہ شعر پڑھا:

محفل میں اپنی بات پر ناراض ہی سہی
تنہائیوں میں اپنا کہا مانتے تو ہیں

فراق گورکھپوری کی آواز آئی: ''اچھا ہے، اچھا ہے مگر محفل میں سنانے کا نہیں''۔

عمیق حنفی نے برجستہ جواب دیا: "حضور! بزدلوں کی تقلید بری نہیں ہوتی، یہ آپ ہی کا انداز ہے"۔

فراق نے کہا: "لڑکا بد دماغ ہے، ضرور اچھا شاعر بنے گا۔"

فراقؔ بھوپال آئے ہوئے تھے۔ ایک شام جب شراب کا دور چل رہا تھا، بھوپال کے مشہور شاعر محمد علی تاج نے فراق سے کہا:

''آپ اتنے بڑے شاعر ہیں، آپ مر گئے تو یہ ہندو تو آپ کو جلا ڈالیں گے۔ آپ ایک وصیت لکھ دیجیے کہ آپ کے مرنے کے بعد آپ کو جلایا نہ جائے بلکہ دفن کیا جائے۔ ہم لوگ ہر سال آپ کا عرس منایا کریں گے اور پورے ہندوستان کے مشہور گویے اور طوائفیں آپ کی قبر پر آپ کا کلام گایا کریں گے۔''

فراقؔ موڈ میں تھے، کہنے لگے:

''بھائی! ہمیں منظور ہے، صبح ہم سے وصیت لکھوا لینا۔''

پطرس بخاری

ولادت : ۱/اکتوبر ۱۸۹۸ء (پشاور)

وفات :۵/دسمبر ۱۹۵۸ء (نیویارک)

پطرس بخاری اُردو کے عظیم مزاح نگار شمار ہوتے ہیں۔ کنہیا لال کپور بھی عمدہ طنز و مزاح کے لیے مشہور ہیں۔ وہ خاصے لمبے اور دُبلے آدمی تھے۔ پہلی بار وہ پطرس بخاری سے ملنے گئے تو پطرس نے انہیں اوپر سے نیچے تک غور سے دیکھا اور مسکرا کر بولے:

''بھئی تم واقعی اس قدر لمبے اور دبلے ہو یا آج کوئی خاص اہتمام کر کے آئے ہو؟''

ایک اعلیٰ عہدے دار پطرس بخاری سے ملاقات کے لیے آئے، پطرس نے کہا:

''تشریف رکھیے''

ان صاحب کو یوں محسوس ہوا کہ کچھ بے اعتنائی برتی جا رہی ہے، چنانچہ انہوں نے کہا: ''میں محکمہ برقیات کا ڈائریکٹر ہوں۔''

پطرس مسکرائے اور کہا: ''پھر آپ دو کرسیوں پر تشریف رکھیے۔''

پطرس بخاری ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر تھے، ایک مرتبہ مولانا ظفر علی خان صاحب کو تقریر کے لیے بلایا، تقریر کی ریکارڈنگ کے بعد مولانا، پطرس کے دفتر میں آ کر بیٹھ گئے۔ بات شروع کرنے کی غرض سے اچانک مولانا نے پوچھا:

'' پطرس! یہ تانپورے اور تنبورے میں کیا فرق ہوتا ہے۔''

پطرس نے ایک لمحہ سوچا اور پھر بولے۔ ''مولانا آپ کی عمر کیا ہوگی؟''

اس پر مولانا گڑبڑا گئے اور بولے ''بھئی، یہی کوئی پچھتر سال ہوگی۔''

پطرس کہنے لگے: ''مولانا جب آپ نے پچھتر سال یہ فرق جانے بغیر گزار دیے تو دو چار سال اور گزار لیجیے۔''

کرنل مجید نے ایک دفعہ پطرس بخاری سے کہا: ''اگر آپ اپنے مضامین کا مجموعہ چھپوائیں تو اس کا نام 'صحیح بخاری' رکھیں۔'' پطرس نے جواب دیا: ''اور اگر آپ اپنی نظموں کا مجموعہ چھپوائیں تو اس کا نام 'کلام مجید' رکھیں۔''

پطرس بخاری اپنی کتاب ''پطرس کے مضامین'' کے دیباچہ لکھتے ہیں:

''اگر یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے، اگر آپ نے کہیں سے چرائی ہے، تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں، اپنے پیسوں سے خریدی ہے تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ آپ اس کتاب کو اچھا سمجھ کر اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کریں۔

ان مضامین کے افراد سب خیالی ہیں، حتیٰ کہ جن کے لیے وقتاً فوقتاً واحد متکلم کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے وہ بھی ''ہر چند کہیں کہ ہیں نہیں ہیں'' آپ تو اس نکتے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں، لیکن کئی پڑھنے والے ایسے بھی ہیں جنہوں نے اس سے پہلے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ اُن کی غلط فہمی اگر دور ہوجائے تو کیا ہرج ہے۔

جو صاحب اس کتاب کو کسی غیر ملکی زبان میں ترجمہ کرنا چاہیں، وہ پہلے اُس ملک کے لوگوں سے اجازت حاصل کر لیں۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ پروفیسر احمد شاہ پطرس بخاری ایک انگریز افسر سے ملنے گئے۔ افسر کی سیکرٹری کوئی نک چڑھی خاتون تھی، اس کے اور پطرس کے درمیان جو مکالمات ہوئی وہ درج ذیل ہے:

''آپ کا نام؟''

''احمد شاہ پطرس بخاری۔''

''کیا کرتے ہیں؟''

''ریڈیو میں ڈائریکٹر جنرل ہوں۔''

''صاحب سے کبھی پہلے بھی ملے ہو؟''

''جی نہیں۔''

''اچھا کل آنا۔''

اور پطرس واپس لوٹ آئے، اگلے روز پھر من وعن وہی باتیں ہوئیں اور سیکرٹری صاحبہ نے کل آنے کا مشورہ دیا۔ تیسرے دن پطرس نے جاتے ہی کہا: ''میرا نام پطرس بخاری ہے، ریڈیو ڈائریکٹر جنرل ہوں، صاحب سے پہلے کبھی نہیں ملا اور اب میں کل آؤں گا۔'' سیکرٹری صاحبہ یہ سُن کر مسکرا دیں اور صاحب سے پطرس کی ملاقات کا بندوبست کرا دیا۔

کراچی میں APWA یعنی آل پاکستان وومنز ایسوایشن کے ایک مشاعرے کی صدارت کے فرائض بخاری صاحب کے ذمّے تھے اور شوکت تھانوی اس مشاعرے کے منتظم تھے۔ اپنی صدارتی تقریر میں بخاری صاحب نے کہا یہ APWA کا مشاعرہ ہے اور شوکت تھانوی اس مشاعرے کے منتظم ہیں۔ وہ میرے پاس یہ فرمائش لے کر آئے تھے کہ میں اس مشاعرے کی صدارت کروں۔ میں ان کی فرمائش ٹال نہ سکا اگرچہ مجھے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ شوکت صاحب کا تعلق کس تھانے سے ہے۔ لیکن اُن کا تعلق کسی بھی تھانے سے ہو۔ اے ماؤ، بہنو، بیٹیو! تھانے کی شوکت تم سے ہے سارا مشاعرہ قہقہہ زار بن گیا اور یہ سب کچھ نشر ہوا۔

سالکؔ صاحب جس مکان میں مقیم تھے وہ مکان دوسری منزل پر تھا اور پانی وہاں تک نہیں پہنچتا تھا۔ جگن ناتھ آزاد کے پوچھنے پر سالک صاحب نے بتایا کہ کسی وقت پانی آ جاتا ہے لیکن اتنا نہیں کہ گھر بھر کے ضرورت کے لیے مکتفی ہو سکے اور پھر ساتھ ہی انھوں نے بتایا کہ آج کل چند روز سے یہ تکلیف کم ہو گئی ہے کیونکہ بخاری صاحب کراچی آئے ہوئے ہیں۔ وہ ہر روز پانی سے بھرے ٹین اپنی موٹر میں رکھ کر میرے لیے لے آتے ہیں۔ کچھ ہی دیر بعد دو آدمیوں کے زینے پر چڑھنے کی آواز آئی۔ یہ بخاری صاحب اور ان کے ڈرائیور تھے جو ہاتھوں میں پانی کے برتن لیے مکان میں داخل ہوئے۔ آزاد نے احتراماً کھڑے ہو کے آداب عرض کیا اور بخاری صاحب پانی کا برتن رکھ کے ابھی آزاد کی طرف متوجہ ہوئے ہی تھے کہ سالکؔ صاحب نے کہا ''جگن ناتھ'' تم نے دیکھا کہ اردو کے کتنے بڑے ادیب اور یو۔این۔او کے کتنے بڑے افسر ہمارے سامنے پانی بھرتے ہیں۔'' بخاری صاحب نے فوراً آزاد سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ'' آزاد! ان کی تہذیب بھی دیکھ لو کہ اس کے باوجود یہ شرم سے پانی پانی نہیں ہوتے۔''

سیّد احمد شاہ پطرس بخاری کے کسی دوست نے ان کا تعارف ایک زندہ دل بزرگ سے کرایا۔ وہ صاحب ان کے چھوٹے بھائی سیّد ذوالفقار علی شاہ بخاری کو جانتے تھے۔ چنانچہ یہ کہہ کر ملاقات کرائی کہ یہ ذوالفقار علی شاہ بخاری کے بڑے بھائی سیّد احمد شاہ بخاری ہیں۔

یہ سن کر وہ بزرگ بولے: ''تو یوں کہیے کہ یہ ''صحیح بخاری'' ہیں۔''

ایک محفل کے خاتمے پر احمد شاہ پطرس بخاری کا مولانا گرامی سے تعارف کرایا گیا۔ مولانا گرامی کہنے لگے: ''اچھا تو یہ بخارا کے رہنے والے ہیں۔ پھر تو یہ ہماری غلطیاں نکالتے ہوں گے۔''

حفیظ جالندھری لندن سے انگریز میم کو بیگم بنا کر لائے۔ پطرس بخاری سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے حفیظ صاحب کو مبارک باد دیتے ہوئے برجستہ کہا، ''حفیظ! اچھا ہوا، اب انگریزی تمہاری مادری زبان ہوگئی۔''

پطرس بخاری گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل تھے۔ وہاں ایک چوکیدار اِن کے خلاف بہت بولتا تھا۔ ایک بار کسی اُستاد نے اس کی بدزبانی کی شکایت کی کہ "پطرس صاحب! فلاں چوکیدار آپ کے خلاف باتیں کرتا رہتا ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ پطرس صاحب میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔" پطرس بخاری نے کہا۔ "وہ ٹھیک کہتا ہے کہ مَیں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا کیونکہ اس کے پاس دولت ہے نہ عزت، شہرت ہے نہ عہدہ، میں اس کا کیا بگاڑوں؟"

پطرس بخاری کے کسی عزیز کا نکاح تھا۔ اس کے لیے مولوی درکار تھا۔ تلاش بسیار کے بعد ایک شخص ڈھونڈ کر لایا گیا۔ جو بہت دُبلا پتلا تھا۔ پطرس صاحب دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور بولے، ''نکاح کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ نکاح خواں کی اور چھوارے کی۔ ماشاء اللہ ان میں دونوں صفات موجود ہیں۔''

خطبہ نکاح کے بعد بخاری صاحب نے دُور سے ایک چھوارا اُن مولوی صاحب کو دکھاتے ہوئے کہا، ''مولانا چھوارا۔'' اور مولانا نے اپنا پوپلا منہ چلاتے ہوئے کہا، ''جی بسم اللہ!'' بخاری صاحب نے ''جزاک اللہ'' کہا اور چھوارا کھا گئے۔

جوش ملیح آبادی

ولادت: ۵ر دسمبر ۱۸۹۸ء (لکھنؤ)

وفات: ۲۲ر فروری ۱۹۸۲ء (اسلام آباد، پاکستان)

ایک دفعہ برطانیہ کا ایک سفارت کار پاکستان آیا۔ ان کے اعزاز میں ایوان صدر میں ڈنر تھا۔ سابق صدر سکندر مرزا مہمان کے ساتھ چلتے چلتے جوش ملیح آبادی کے قریب آئے اور مہمان سے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا:

''ان سے ملئے، یہ اُردو کے بہت بڑے شاعر ہیں۔''

وہ بھی ایک عجوبہ تھا ہاتھ بڑھا کر بولا:

''آہ میں سمجھ گیا آپ ہی مسٹر ''غالب'' ہیں۔''

جوش ملیح آبادی کے صاحبزادے سجاد کی شادی کی خوشی میں ایک بے تکلف محفل منعقد ہوئی جس میں جوش صاحب کے دیگر دوستوں کے ساتھ ساتھ ان کے جگری دوست ابن الحسن فکر بھی موجود تھے۔

ایک طوائف نے جب بڑے سُریلے انداز میں جوش صاحب کی ہی ایک غزل گانی شروع کی تو فکر صاحب بولے:

''اب غزل تو یہ گائیں گی اور جب داد ملے گی تو سلام جوش صاحب کریں گے۔''

عبدالحمید عدم کو کسی صاحب نے ایک بار جوش سے ملایا اور کہا: ''آپ عدم ہیں۔''

عدم کافی تن وتوش کے آدمی تھے۔ جوش نے ان کے ڈیل ڈول کو بغور دیکھا اور کہنے لگے: ''عدم یہ ہے تو وجود کیا ہوگا؟''

جوش نے پاکستان میں ایک بہت بڑے وزیر کو اُردو میں خط لکھا۔ لیکن اس کا جواب انہوں نے انگریزی میں دیا۔ جواب میں جوش نے انہیں لکھا: ''جنابِ والا، میں نے تو آپ کو اپنی مادری زبان میں خط لکھا تھا۔ لیکن آپ نے اس کا جواب اپنی پدری زبان میں تحریر فرمایا ہے۔''

''آتش و ناسخ میں آپ کس کو اچھا شاعر سمجھتے ہیں، مضبوط دلائل کے ساتھ ایک پر دوسرے کو ترجیح دیجیے۔''

یہ نواب (مہندی یار جنگ) کی خاص عادت تھی۔ جسے ٹالنا مقصود ہوتا تھا، اُس سے یہ سوال ضرور کرتے تھے۔ اُس کے بعد ہی معاً دوسرا سوال یہ کرتے تھے: ''اچھا طباطبائی صاحب کی شاعری کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟''

ایک دفعہ میں اور جوش ساتھ ساتھ نواب صاحب کی ملاقات کو گئے اور کسی خاص ہی ضرورت سے گئے تھے۔ نواب صاحب کام سے گریز کرنا چاہتے تھے، جوش کو مطلب کی طرف آتا دیکھ کر کہنے لگے: ''جوش صاحب! آتش و ناسخ میں آپ کسے اچھا شاعر سمجھتے ہیں؟''

مرتا کیا نہ کرتا، بے چارے جوش نے اپنا کام بنانے کی خاطر وہی پرانا سبق جسے پچاس بار سنا چکے تھے، ازسرِ نو پھر سنا ڈالا۔ نواب مزے لے لے کر سنتے رہے، گویا پہلی بار یہ مضمون جوش کی زبان سے سن رہے ہوں اور خود بھی سمجھنے کی کوشش میں ہوں۔ جوش جب اپنے نزدیک اپنے بیان سے نواب کی تشفی کر چکے تو اُنھوں نے بلا تاخیر اپنا دوسرا سوال بھی کر ڈالا: ''اچھا تو جوش صاحب طباطبائی صاحب کی شاعری کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟''

مطلب سے ایسا صاف اور واضح گریز سے دیکھ کر جوش جھلا گئے۔ پٹھان ہی تو تھے، غصے میں اپنی ضرورت کا بھی خیال نہ رہا، کہنے لگے: ''اُس مسخرے کو شاعری سے کیا

تعلق؟ دُنیا میں اَور ہزار کام ہیں، جوتا گانٹھے، پٹاخے بنائے، قلعی کر لے، یہ کیا ضروری ہے کہ شعر ہی کہے۔"

نواب اس جوشیلی تقریر کی تاب نہ لا سکے، کھڑے ہوکر فرمایا: "اچھا جوش صاحب! پھر ملاقات ہوگی۔ اِس وقت میں بہت مصروف ہوں۔"

ہم لوگ سلام کر کے باہر نکل آئے۔ مطلب غتر بود ہوا۔ یہی نواب کا منشا تھا۔

جب موٹر پر بیٹھے تو میں نے جوش کی توجہ دلائی.......... جوش برہمی سے بولے: "لعنت بھیجو ہمارا کام تو بے شک چوپٹ ہوا، مگر آج کے بعد نواب صاحب مجھ سے یہ سوال نہ کریں گے۔"

ایک مولانا کے جوش صاحب کے ساتھ بہت اچھے تعلقات تھے۔ کئی روز کی غیر حاضری کے بعد ملنے آئے تو جوش صاحب نے وجہ پوچھی۔ کہنے لگے: "کیا بتاؤں جوش صاحب، پہلے ایک گردے میں پتھری تھی اس کا آپریشن ہوا۔ اب دوسرے گردے میں پتھری ہے۔" میں سمجھ گیا۔ (جوش صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا)۔ "اللہ تعالیٰ آپ کو اندر سے سنگسار کر رہا ہے۔"

کسی مشاعرے میں ایک نومشق شاعر اپنا غیر موزوں کلام پڑھ رہے تھے۔ اکثر شعراء آدابِ محفل کو ملحوظ رکھتے ہوئے خاموش تھے لیکن جوش صاحب پورے جوش و خروش سے ایک ایک مصرعے پر داد و تحسین کی بارش کیے جا رہے تھے۔ گوپی ناتھ امن نے ٹوکتے ہوئے پوچھا: "قبلہ، یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

جوش صاحب نے بہت سنجیدگی سے جواب دیا: "منافقت!" اور پھر داد دینے میں مصروف ہو گئے۔

ایک مرتبہ جوش ملیح آبادی اپنے چند بے تکلف دوستوں میں بیٹھے جوانی کی محبوباؤں کا تذکرہ کر رہے تھے کہ فرط جذبات سے ان کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ اسی اثنا میں ان کی بیگم کمرے میں داخل ہوئیں اور رونے کا سبب پوچھا، انہوں نے جواب دیا: ''بس اماں مرحومہ یاد آگئیں تھیں۔''

جوش ملیح آبادی شام کے وقت شغل مئے نوشی میں مصروف تھے کہ نوکر نے آکر اطلاع دی کہ ایک صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں جو نقاد ہیں۔ جوش صاحب نے پوچھا اکیلے ہیں کیا؟

''نہیں تین چار دوست ان کے ساتھ ہیں۔'' نوکر نے کہا۔

''وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔'' جوش صاحب نے جوش میں آکر کہا۔

ساتھ بیٹھے دوست نے پوچھا: ''آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟''

''جس کے چار دوست ہوں وہ نقاد ہو ہی نہیں سکتا۔'' جوش نے جواب دیا۔

ایک محفل میں جوش ملیح آبادی اپنی نظم سنا رہے تھے تو کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے حاضرین سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا: ''دیکھیے کم بخت پٹھان ہو کر کیسے عمدہ شعر پڑھ رہا ہے۔''

جوش صاحب نے فوراً جواب دیا۔

''اور دیکھو، ظالم سکھ ہو کر کیسی اچھی داد دے رہا ہے۔''

جوش ملیح آبادی کو روزانہ شراب پینے کی عادت تھی۔ لہٰذا شام ہوتے ہی ان کی بیگم اندر سے پیگ بنا بنا کر بھجواتیں جنھیں وہ چار گھنٹے میں ختم کر دیتے اور پھر کھانا کھاتے۔ ایک شام آزاد انصاری بھی ان کے ساتھ تھے، بیگم جوشؔ کو آزاد سے حد درجہ کراہت تھی، ان کی موجودگی سے وہ سخت آزردہ خاطر ہو رہی تھیں۔ جوشؔ کے تقاضوں کے بعد بیگم نے اندر سے پوری بوتل باہر بھجوادی، جوشؔ سوڈا آنے کے منتظر رہے۔ آدھ گھنٹے بعد بھی جب سوڈا نہ ملا تو بیگم کو باہر طلب کر کے جوشؔ نے نرمی سے یہ شعر پڑھا:

کشتیٔ مے کو حکم روانی بھی بھیج دو — جب آگ بھیج دی ہے تو پانی بھی بھیج دو

ممبئی کی ایک معروف ادب پرور اور بوڑھی مغنیہ کے یہاں محفلِ مشاعرہ منعقد ہو رہا تھی، جس میں جوشؔ ملیح آبادی، جگر مراد آبادی، حفیظ جالندھری اور ساغر نظامی بھی شریک تھے۔ مشاعرے کے اختتام پر ایک دبلی پتلی سی لڑکی، جس کی کم سن آنکھیں بجائے خود کسی غزل کے نمناک شعروں کی طرح حسین تھیں، آٹو گراف بک میں دستخط لینے لگی۔

اس جہاندیدہ مغنیہ کی موجودگی میں یہ نوعمر حسینہ زندگی کے ایک تضاد کو نہایت واضح انداز میں پیش کر رہی تھی۔ چنانچہ جگر مراد آبادی نے آٹو گراف بک میں لکھا۔

ازل ہی سے چمن بند محبت
یہی نیرنگیاں دکھلا رہا ہے
کلی کوئی جہاں پہ کِھل رہی ہے
وہیں ایک پھول بھی مرجھا رہا ہے

حفیظ صاحب کی باری آئی تو انہوں نے معصوم لڑکی کے چہرے پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے لکھا:

معصوم امنگیں جھول رہی ہیں دلداری کے جھولے میں
یہ کچی کلیاں کیا جانیں، کب کِھلنا کب مرجھانا ہے

اس کے بعد آٹو گراف بک دوسرے شاعروں کے پاس سے ہوتی ہوئی جوشؔ صاحب کے سامنے آئی تو انہوں نے لکھا: ''آٹو گراف بک ایک ایسا اصطبل ہے جس میں گدھے اور گھوڑے ایک ساتھ باندھے جاتے ہیں۔''

دراصل جہاں جگر اور حفیظ کے برمحل شعروں نے ان کے احساسِ جمال کو تازگی اور شگفتگی بخشی، وہیں دوسرے کئی شاعروں کی اُوٹ پٹانگ شعر انہیں ناگوار گزرے تھے۔

یونس سلیم نے جوشؔ ملیح آبادی سے پوچھا کہ کیا بات ہے، آپ آج کل غزل لکھ تو نہیں رہے بلکہ اس کی مخالفت کر رہے ہیں حالانکہ ابتدا میں آپ خود بہترین غزلیں کہتے رہے ہیں۔ جوشؔ نے جواب دیا کہ ''بچپن میں تو میں ننگا پھرا کرتا تھا، کیا سمجھ آنے کے بعد بھی ننگا پھرا کروں؟''

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ فیض احمد فیضؔ کی آواز میں نسوانیت تھی اور جوشؔ ملیح آبادی کی آواز میں کھنک تھی۔ جشن لائل پور کے مشاعرے میں جوشؔ ملیح آبادی اور فیض احمد فیضؔ الگ الگ گروپوں میں بیٹھے تھے۔ قتیلؔ شفائی مشاعرے میں شرکت کے لیے آئے تو فیضؔ صاحب کی طرف جانے لگے، جوشؔ صاحب نے آواز دی۔ ''قتیلؔ وہاں کہاں جا رہے ہو۔ سیدھے مردانے میں چلے آؤ۔''

بمبئی (ممبئی) میں جوشؔ صاحب ایک ایسے مکان میں ٹھہرے، جس میں اوپر کی منزل پر ایک اداکارہ رہتی تھی لیکن مکان کی ساخت کچھ ایسی تھی کہ انہیں دیدار نہ ہو سکتا تھا، لہٰذا انہوں نے یہ رباعی لکھی:

میرے کمرے کی چھت پہ اُس بُت کا مکان
جلوے کا نہیں ہے پھر بھی کوئی امکان
گویا اے جوش میں ہوں ایسا مزدور
جو بھوک میں ہو سر پہ اُٹھائے ہوئے خوان

جوش صاحب پل بنگش میں جس محلہ میں آ کر رہے اس کا نام تقسیم وطن کے بعد سے ''نیا محلہ'' پڑ گیا تھا۔ وہاں سکونت اختیار کرنے کے بعد جوش صاحب کو معلوم ہوا کہ پہلے اس کا نام ''رنڈی والا باغ'' تھا۔ بڑی اُداسی سے کہنے لگے:

''کیا بدمذاق لوگ ہیں، کتنا اچھا نام بدل کر رکھ دیا ہے۔''

مالک رام پہلی دفعہ جوش ملیح آبادی صاحب سے ملنے گئے تو جاڑوں کا موسم تھا۔ شام کے تقریباً چھے بجے تھے۔ اتنے میں قریب کی مسجد سے اذان کی آواز آئی تو جوش صاحب نے اپنے بیٹے سجاد کو آواز دی کہ بیٹے میرا مصلاّ لانا۔ مالک رام صاحب حیران ہوئے کہ جوش صاحب اور نماز؟ اتنے میں سجاد ایک بڑے ٹرے میں شراب کی بوتل، دو گلاس، برف اور پانی لے آیا۔ جوش صاحب نے مالک رام کو پیگ پیش کیا تو انہوں نے معذرت کی کہ میں شراب نہیں پیتا۔ اس پر جوش صاحب نے پوچھا کہ آپ کیا پیتے ہیں؟ اس پر مالک رام صاحب نے فرمایا کہ اللہ کی بنائی ہوئی نعمت پانی پر اکتفا کرتا ہوں۔

پھر جوش صاحب سے پوچھا کہ آپ پانی کا کیا کرتے ہیں تو جوش صاحب نے فرمایا کہ ''پانی سے ہم تو صرف استنجا کرتے ہیں۔''

شاہدرہ کے ایک مصور کی دعوت میں دیگر شعرا کے علاوہ جوش ملیح آبادی اور جگن ناتھ آزاد نے بھی شرکت کی۔ دو تین پیگ ہی ہوئے تھے کہ صاحب خانہ کی فرمائش پر جوش صاحب دوسرے شعرا کے ساتھ ان کی آرٹ گیلری میں تشریف لے گئے۔ پہلی تصویر دیکھ کر فرمایا: ''سبحان اللہ، کیا تصویر بنائی ہے۔'' ایک قدم آگے بڑھے تو دوسری تصویر کی تعریف کی۔ اتنے میں ان کی نظر ایک بزرگ کی تصویر پر پڑی تو پوچھا: ''یہ کون جانور بیٹھا ہے؟''

''میرے والد صاحب ہیں۔'' مصور نے جواب دیا۔

یہ سن کر جوش صاحب کی حالت غیر ہوگئی۔ فوراً باتھ روم کے بہانے کھسک کر واپس پہنچ گئے۔ صبح آزاد صاحب نے جوش صاحب سے بغیر بتائے چلے آنے کی شکایت کی تو وہ بولے: ''بھئی کیا کرتا۔ ان کے والد کو جانور جو کہہ دیا تھا۔ اس شرمندگی کے ساتھ کیسے رُک سکتا تھا۔''

غالباً ۱۹۴۸ء کی بات ہے۔ ۹ مارچ کو ریلوے مزدور یونین نے ہڑتال کا نعرہ دیا تھا۔ ہنس راج رہبر نے ایک گیت عوامی زبان میں اس موقع پر سنایا تھا۔ ہر جگہ وہی سناتے تھے۔ ایک دن جوش کو اپنا گیت سنانے لگے:

نو مارچ کو یاد ہے ساتھی
ریل کا پہیا جام کریں گے

اول تو جوش مارچ پر ہی چونکے، اور جب پورا مصرعہ سن لیا تو کہنے لگے:
''جب پہیے کو جام ہی کرنا ہے تو ساتھی کے بجائے ساقی کر دو۔''

تقسیم ہند سے پہلے کی بات ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کانگریس اور مسلم لیگ ہی ہر محفل میں موضوعِ سخن بنی ہوئی تھیں اور اِنہیں کی سرگرمیوں پر گرما گرم بحثیں چھڑی رہتی تھیں۔

ایک شام بمبئی میں جوش صاحب سے ملنے کے لیے، جو پونا سے آئے ہوئے تھے، جاں نثار اختر، سجاد ظہیر، سردار جعفری، سبط حسن، مجاز سبھی پہنچ گئے۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے سیاسی جھگڑے پر مباحثہ شروع ہو گیا۔ سب لوگ آپس میں الجھتے رہے۔ لیکن جوش ایک لفظ نہ بولے۔ رات کے نو بجنے کو آگئے۔ آخر میں بنّے بھائی (سجاد ظہیر) نے کہا: ''تم لوگ یہ بتا سکتے ہو کہ اگر کانگریس اور مسلم لیگ میں سمجھوتہ نہ ہوا تو کیا نتیجہ ہوگا؟''

قبل اس کے سب میں سے کوئی جواب دے، جوش صاحب، جو ابھی تک زہر کا گھونٹ پیے بیٹھے تھے، یک لخت بول پڑے کہ

''میں بتاتا ہوں، ہوگا یہ کہ تم لوگوں کی بحث میں نو بج جائیں گے اور شراب کی دوکانیں بند ہو جائیں گی اور ہم مر جائیں گے۔''

پنڈت ہری چند اختر صوفی منش ہونے کے باوجود اہل خرابات کی رفاقت کا دم بھرتے تھے۔ ایک رات جوش ملیح آبادی کی قیادت میں دوسرے شاعروں کے ساتھ آپ بھی ایک شراب خانے میں چلے گئے۔ ان کے علاوہ باقی سب حضرات پینے پلانے میں مصروف ہو گئے تو جوش صاحب نے یک دم حیران ہو کر اختر صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا:

''پنڈت جی! آپ یہ کیا پڑھ رہے ہیں؟''

''بار کا مینو دیکھ رہا ہوں صاحب!'' اختر صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''کم سے کم شراب کی قسموں اور ان کی قیمتوں سے تو واقف ہو جاؤں۔''

''ہوں۔۔۔'' جوش صاحب نے وسکی کے گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے کہا:

''بار کا مینو پڑھتے ہوئے آپ ایسے معلوم ہو رہے ہیں جیسے کوئی ہجوہ کوک شاستر پڑھ رہا ہو۔''

من موہن تلخ نے جوش ملیح آبادی کو فون کیا اور کہا:
''میں تلخ بول رہا ہوں۔''
جوش صاحب نے جواب دیا: ''کیا حرج ہے اگر آپ شیریں بولیں۔''

جوش صاحب کے والد بھی شعر کہتے تھے اور حضرت جلال لکھنوی سے اصلاح لیتے تھے لیکن ان کی زندگی ہی میں جوش صاحب کی شاعری ان سے زیادہ مقبول ہونے لگی تو انھوں نے کہا: ''دیکھو بھئی جوش! میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہارے پاس دولت مجھ سے زیادہ ہو، عمر مجھ سے زیادہ ہو لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ تم مجھ سے بڑے شاعر بھی کہلاؤ۔''

جوش صاحب ایک بار گرمی کے موسم میں مولانا ابوالکلام آزاد سے ملنے کی غرض سے ان کی کوٹھی پر پہنچے۔ معلوم ہوا کہ پنڈت جی اُن کے پاس آئے ہوئے ہیں۔ کافی دیر تک انتظار کے بعد جب ملاقات کے لیے جوش صاحب کی باری نہ آئی تو انہوں نے اکتا کر ایک چٹ پر یہ شعر لکھ کر مولانا کی خدمت میں بھجوا دیا۔

نامناسب ہے، خون کھولانا
پھر کسی اور وقت، مولانا

اس پرچے کے پہنچتے ہی اندر سے قہقہے کی آواز بلند ہوئی، مولانا اور پنڈت جی دونوں ہنستے ہوئے باہر آ گئے، مولانا نے بڑھ کر جوش صاحب کو گلے لگا لیا اور کہا:
''آپ نے ''مولانا'' کا ایسا اچھا قافیہ نکالا ہے کہ جی خوش ہو گیا اور حضرت اکبر الٰہ آبادی کا قافیہ قبلہ قبلی اور ''شبلی'' یاد آ گیا۔''

جوشؔ صاحب جاڑے کی ایک رات کسی دوست سے ملنے گئے، اندر اطلاع کی تو نوکر نے آ کر جواب دیا: ''نواب صاحب نہیں ہیں۔'' جوشؔ کو کچھ شک گزرا۔ کوفت بہت ہوئی لیکن خاموشی سے واپس چلے آئے۔ کچھ دنوں کے بعد ایسا اتفاق ہوا کہ وہی صاحب حضرت جوشؔ سے ملنے ان کے گھر آئے۔ جوشؔ صاحب نے چھت پر کھڑے ہو کر کہا: ''میں نہیں ہوں۔''

ایک شام جوش صاحب معمول کی چہل قدمی کے بعد گھر سے قریب کسی چوک پر کھڑے تھے۔ ان کے ایک مداح نے انہیں دیکھ کر اپنی گاڑی روکی اور کہا: ''آیئے جوش صاحب، آپ کو چھوڑ دوں۔''

جوش صاحب نے کہا: ''میاں، داشتہ چھوڑی جاتی ہے، کتے اور کبوتر چھوڑے جاتے ہیں، آدمی کو پہنچایا جاتا ہے۔''

ایک دن جاں نثار اختر اور اسرار الحق مجاز جوش صاحب کے گھر کھانے پر مدعو تھے۔ کھانا کھا کر اُٹھے تو جوش صاحب Wash Basin پر ہاتھ دھونے لگے۔ کلّیوں پر کلّیاں کیے جا رہے تھے، مجاز سے رہا نہ گیا، کہنے لگے:

''یہ آپ کلّیاں کر رہے ہیں یا کلّیات!''

جوش صاحب آخری بار پھر بمبئی آئے تھے اور وہ نیشنل اسپورٹنگ کلب میں ٹھہرے تھے۔ مشہور منظرنامے اور مکالمے لکھنے والے مرزا وجاہت حسین مثنوی ''زہرِ عشق'' کے جواب میں اپنی مثنوی سنا رہے تھے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ مشہور فلمی اداکار بھارت بھوشن آئے اور بہت

مجمع تھا پھر بھی وہ کسی نہ کسی طرح جوش صاحب تک پہنچ گئے۔ کہنے لگے:

''جوش صاحب! میں نے فلم ''غالب'' میں غالب کا کردار ادا کیا۔''

جوش صاحب کو یہ بے جا مداخلت پسند نہیں آئی۔ انہوں نے برجستہ کہا:

''میں غالب کا مخالف نہیں ہوں مگر تم نے کیسے یہ کردار ادا کیا کہ لوگ غالب کے مخالف ہو گئے۔'' لوگ یہ سن کر ہنسنے لگے تھے۔

ایک دن جوش صاحب، شنکر پرساد کے اُطاقِ جلوت (Drawing room) میں بیٹھے ہنس بول رہے تھے کہ چپراسی ایک بڑا سا کارڈ لے کر آیا، کارڈ دیکھ کر اُنہوں نے کہا:

''بلا لاؤ۔''

اور جب ایک جوان آدمی نہایت اعلا درجے کا سوٹ پہنے آیا تو شنکر صاحب ''اخاہ'' کہہ کر اُس سے لپٹ گئے۔ اُنہوں نے اُس سے اُردو میں پوچھا:

''آپ انگلستان سے کب آئے؟''

اُس نے انگریزی میں جواب دیا: ''کوئی ایک ہفتہ ہوا۔''

شنکر پرشاد نے جوش صاحب کی طرف اشارہ کر کے اُس سے کہا:

"Please meet him, he is our greatest living poet."

(اِن سے ملیے، یہ ہمارے سب سے بڑے زندہ شاعر ہیں۔)''

اُس ولایت گزیدہ نے جوش صاحب کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا اور پوچھا:

"Is he Mister Ghalib?" (''کیا یہ مسٹر غالب ہیں؟'')

اب نہ پوچھئے کہ اس عجیب سوال کے بعد سب کا کیا حال ہوا، ہنستے ہنستے جوش صاحب اور شنکر پرساد صوفوں پر گر پڑے اور لوٹنے لگے۔ اور وہ پوچھنے والا، رومال سے اپنے ماتھے کا پسینا پونچھنے لگا اور اُس دن سے اُس کا نام ہی پڑ گیا:

"Is he Mister Ghalib?"

اپریل فول منانے کے لیے ایک روز جوش صاحب بہت تڑکے شنکر پرساد کے پاس پہنچے اور بڑے گھبرائے اور سوکھے منہ سے کہا:

''شنکر پرشاد صاحب! بڑا غضب ہو گیا۔''

اُنہوں نے گھبرا کر پوچھا:

''کیا ہوا؟''

جوش نے کہا:

''کنور مہندر سنگھ پاگل ہو گئے ہیں۔''

اُنہوں نے کہا:

''بڑا غضب ہو گیا۔''

جوش نے کہا:

''ایسا ویسا! اُنہوں نے اپنی ڈاڑھی کے تمام بال اکھاڑ ڈالے ہیں، تمام چہرہ لہولہان ہو رہا ہے۔ گھر والوں نے اُن کو ایک کمرے میں بند کر دیا ہے، اب کیا کِیا جائے۔ وہ جس کمرے میں بند ہیں، اُس کی کھڑکیوں کے تمام شیشے توڑ چکے ہیں اور اب سلاخوں پر زور آزمائی کر رہے ہیں۔ کس طرح اُن کو قابو میں لایا جائے۔''

انہوں نے بڑی سراسیمگی کے ساتھ پولیس کے انسپکٹر جنرل چودھری کو فون کر کے، سارا ماجرا بتایا اور کہا:

''آپ پولیس کو لے کر فوراً وہاں جائیں، کنور صاحب کو قابو میں لائیں اور مجھ کو فوراً فون سے مطلع کریں۔''

جب وہ فون کر چکے، جوش نے کہا:

''اب آپ نہائیں دھوئیں۔ میں کنور صاحب کے پاس جاتا ہوں، وہاں سے آپ کو فون کروں گا۔''

پانچ منٹ کے اندر جوش، کنور صاحب کے مکان پہنچ گئے۔ اُنھوں نے جوش کو اپنی خواب گاہ میں بلا لیا۔ وہ ورزش کر رہے تھے، مگدرز میں پر رکھ کر پوچھا:

''خیریت تو ہے، آپ اس قدر سویرے کیسے آ گئے؟''

جوش نے کہا:

''ٹہل کر واپس ہو رہا تھا، جی چاہا، آپ کا دیدار کرتا جاؤں۔''

اُنھوں نے کہا:

''آپ میرے بستر پر آرام سے بیٹھ جائیں، ابھی میری تھوڑی سی ورزش باقی ہے۔''

جوش صاحب کے لیے چائے آ گئی اور وہ ورزش کرنے لگے۔ اِتنے میں بجلی کی گھنٹی بجی۔ جوش نے باہر جا کر دیکھا کہ چودھری صاحب پولیس کے جوانوں کے ساتھ گاڑی سے اتر رہے ہیں، جوش کو دیکھتے ہی انھوں نے کہا:

''جوش صاحب! کس کمرے میں بند کیا گیا ہے کنور صاحب کو۔''

جوش نے کہا:

''اندر کے کمرے میں۔''

اُنھوں نے کہا:

''یہاں تو کوئی شور نہیں ہو رہا ہے۔''

جوش نے کہا:

''کنور صاحب بے ہوش ہو چکے ہیں۔ آپ ڈرائنگ روم میں تشریف رکھیے۔ میں اُن کی بیگم کو بلا کے لاتا ہوں۔''

اندر جا کر جوش نے کہا:

''کنور صاحب، چودھری صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔''

اُنھوں نے منہ بنا کر چپکے سے کہا:

''بڑے ناوقت آئے ہیں۔ میں تو ابھی نہایا بھی نہیں ہوں۔ بہرحال آپ جا کر

انہیں باتوں میں لگائیے میں کپڑے پہن کر آتا ہوں۔''

باہر آ کر جوش نے کہا:

''چودھری صاحب، بیگم تو موٹر میں بیٹھ کر دماغی ڈاکٹر کو اپنے ساتھ لے آنے کے لیے گئی ہوئی ہیں، آتی ہوں گی۔''

چودھری نے جوش سے کہا:

''وہ بے ہوش پڑے ہوئے ہیں۔ یہ موقع بہت غنیمت ہے، اُن کے ہاتھ پاؤں آسانی کے ساتھ باندھ لیے جا سکتے ہیں۔''

جوش نے کہا:

''بہت اچھا، تو پھر چلیے۔''

وہ پولیس والوں کو بلانے کے لیے برآمدے کی طرف چلے گئے اور اِتنے میں کنور صاحب باہر نکل آئے، آتے ہی جوش سے پوچھا:

''کیا چودھری صاحب چلے گئے؟''

جوش نے کہا:

''نہیں، برآمدے تک گئے ہیں۔''

کنور صاحب نے برآمدے میں قدم رکھتے ہی دیکھا کہ چودھری صاحب کی پشت اُن کی جانب ہے اور اُن کے سامنے آٹھ دس پولیس والے کھڑے ہوئے ہیں، جنہیں وہ ہاتھ کے اشارے سے کچھ سمجھا رہے ہیں۔ کنور صاحب دنگ ہو کر وہ سماں دیکھنے لگے اور جیسے ہی پولیس والوں کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے چودھری مڑے تو پشت پر کنور صاحب کو دیکھ کر اُن کی چیخ نکل گئی۔ کنور صاحب نے حیران ہو کر دریافت کیا:

''چودھری صاحب! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہ سب کچھ ہو کیا رہا ہے؟''

چودھری نے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا:

''کنور صاحب، آپ کیسے ہیں؟''

اُنہوں نے کہا:

''میں تو اچھا ہوں، لیکن آپ اپنا حال بتائیں۔''

چودھری صاحب نے کہا:

''ارے!''

کنور صاحب نے کہا:

''ارے!''

اِس ''ارے، ارے'' کی تکرار پر میرا قہقہہ نکل گیا۔ برآمدے میں آ کر میں نے کہا:

''کنور صاحب اور چودھری صاحب، آپ دونوں ڈرائنگ روم میں آ جائیں، ابھی حال کھل جائے گا۔''

دونوں آ گئے۔ چودھری جوش کو آنکھ مار کر دُور کے سوفے پر بیٹھ گئے۔ جوش نے شنکر پرشاد صاحب کو فون کیا کہ آپ اس وقت کنور صاحب کے مکان آ جائیں۔ کنور صاحب نے کہا:

''جوش صاحب! آخر کچھ تو بتایئے کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ چودھری صاحب مجھ سے دُور بیٹھے مجھے گھور رہے ہیں، باہر پولیس کے جوان کھڑے ہوئے ہیں، آپ چیف کمشنر صاحب کو یہاں بلا رہے ہیں؛ یہ سب کچھ ہو کیا رہا ہے؟''

جوش نے کہا:

''کنور صاحب! شنکر پرشاد صاحب کے آتے ہی یہ سارا طلسم ٹوٹ جائے گا۔''

کنور ''ابھی آتا ہوں'' کہہ کر اندر چلے گئے۔ اتنے میں شنکر پرشاد آ گئے۔ چودھری سے گھبرا کر پوچھا:

''کہیے آپ نے کیا کِیا؟''

اِتنے میں کنور باہر آ گئے۔ شنکر پرشاد صاحب نے اُنہیں دیکھتے ہی بڑے زور سے کہا:

''ارے!''

کنور صاحب نے پھٹی آنکھوں اور کھلے منہ کے ساتھ پوچھا:

''ارے یہ کیا!''

چودھری صاحب نے کہا:

''ارے!''

شنکر پرشاد صاحب نے کہا:

''ارے!''

آخر کار کہاں تک جوش ضبط کرتے، ایک اَرّاٹے دار، گھن گرج قہقہہ جوش کے منہ سے بم کے گولے کی طرح نکلا اور فضا پر بلند ہو کر پھٹ گیا اور تمام حاضرین ہل کر رہ گئے۔

جوش نے تالی بجا کر کہا:

''یارو، اپریل فول مبارک!

اپریل فول مبارک!

..........اپریل فول مبارک!''

اور پھر تو شنکر پرشاد اور چودھری کا یہ عالم ہو گیا، گویا ہنستے ہنستے اُن کا دم نکل جائے گا اور کنور صاحب کو چوں کہ کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ ماجرا کیا ہے، وہ انتہائی حیرت کے ساتھ سب کو دیکھنے لگے اور جب ہنسی کا دَونگڑا پڑ چکا تو شنکر پرشاد صاحب نے جوش سے کہا:

''کمال کر دیا آپ نے جوش صاحب! کچھ اس ادا سے آپ نے کہا کہ کنور صاحب پاگل ہو گئے ہیں، اُنھوں نے اپنی ڈاڑھی کا ایک بال اکھاڑ ڈالا ہے اور اُن کا تمام چہرہ لہولہان ہو رہا ہے کہ مجھے یقین آ گیا اور چودھری صاحب کو فوراً یہاں بھیج دیا۔ اِس کا خیال بھی نہیں آیا کہ آج اپریل کی پہلی تاریخ ہے۔''

کنور صاحب نے جب یہ سنا تو اُنھوں نے پیٹ پکڑ کر ہنسنا شروع کر دیا اور اُن کے ہنسنے پر سب پھر سے ہنسنے لگے۔

ایک روز جوش مشاعرے سے داد کے رطل ہائے گراں پی کر جھومتا جھامتا، گھر آیا، خوشی کے مارے دیر تک نیند نہیں آئی.......... اور سو گیا تو خواب میں رات بھر یہ دیکھتا رہا کہ پریاں بھینچ بھینچ کر اسے گلے لگا رہی ہیں۔

غُسل ان پر واجب ہو گیا.......... صبح اُٹھتے ہی حمام کیا اور ناشتے سے فارغ ہو کر، جب اپنے باپ کی خواب گاہ کے برآمدے سے ہو کر گزرنے لگا، تو باپ کی آواز آئی:

''اِدھر آیئے جناب!'' (غصے کے وقت یہی ان کا لہجہ ہو جایا کرتا تھا)

دم نکل گیا۔ اس آوازِ غضب سے.......... اور جب لرزتا ہوا.......... ان کی خواب گاہ میں گیا تو انہوں نے بڑی بھاری آواز میں، ارشاد فرمایا:

''دیکھیے صاحب! یہ میری دلی تمنا ہے کہ آپ اس دنیا میں پھلیں، پُھولیں، عمرِ مسیح و خضر پائیں، آپ کی دولت میری دولت سے بڑھ جائے، آپ کا مَرتبہ مجھ سے ہزار گنا فزوں ہو جائے۔ آپ زندگی کے ہر شعبے میں سبقت لے جائیں مجھ سے.......... مگر کان کھول کر سُن لیجیے کہ میں اس کو برداشت نہیں کر سکتا کہ خاں صاحب! آپ مجھ سے شاعری میں بھی بڑھ جائیں۔ رات کے مشاعرے میں آپ کو مجھ سے زیادہ داد ملی، اب آپ کا، میرے ساتھ مشاعرے جانا بند.......... قطعی بند.......... غضب خدا کا، باپ سے زیادہ بیٹے کو داد ملے، میں یہ اُلٹی گنگا بہنے کا موقع نہیں دوں گا.......... سُنا خاں صاحب آپ نے؟؟''

ایک روز جوش اور فراقؔ کی موجودگی میں شنکر پرساد کے ایک بہت پرانے دوست، جو ہندی کے مشہور شاعر ہیں، اُن سے ملنے آئے، باتوں باتوں میں انہوں نے فرمائش کی کچھ سنایئے اور جب وہ اپنا کلام سنا چکے تو شنکر نے مسکرا کر کہا:

''ابھی جوشؔ صاحب اور فراقؔ صاحب اپنا اپنا کلام سنا رہے تھے تو شاعری کا مزا آ رہا تھا، لیکن جب آپ نے اپنا کلام شروع کیا تو ایسا معلوم ہوا کہ زبردست بلوا ہو رہا ہے۔''

ناصر زیدی جوش ملیح آبادی کے دمِ رخصت کا حقیقی واقعہ رقم کرتے ہوئے لکھتے ہیں،
جب میں کنٹرولر ریڈیو پاکستان ایس ایم رفیق صاحب کو لے کر پولی کلینک ہسپتال اسلام آباد میں جوش ملیح آبادی صاحب کی عیادت کو گیا اور پوچھا کہ ''جوش صاحب مزاج کیسا ہے؟''
تو کہا: ''انتقال فرما رہے ہیں۔''

صوفی غلام مصطفیٰ تبسّم

ولادت: ۴/اگست ۱۸۹۹ء (امرتسر)

وفات: ۷/فروری ۱۹۷۸ء (لاہور)

صوفی تبسم گورنمنٹ کالج سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد کچھ عرصے ریڈیو پاکستان میں بہ طورِ ''ماہر'' ملازم رہے۔ کسی نے اُن سے اُن کے کام کی صحیح نوعیت اور تفصیل پوچھی تو صوفی صاحب نے اپنے ''فارغ البال'' سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:

''میں یہاں کا، کے، کی ٹھیک کرتا ہوں۔''

نیو یارک سے واپسی پر پطرس بخاری اپنے بے تکلف دوستوں کو بتا رہے تھے:

''جناب! میں نے وہاں ایسے ایسے سٹورز دیکھے کہ ایک ہی جگہ ضروریات زندگی ہر شے مل جاتی ہے۔''

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے یہ سن کر حقے کی نلی ایک طرف کی اور کہنے لگے:

''صاحب! پھر تو امریکہ موچی دروازہ ہوگیا نا........ جہاں سے جو چیز چاہو لے لو۔''

صوفی غلام مصطفیٰ تبسّم صاحب کے ایک شاگرد ایک بار نظر کی عینک لگا کر آ گئے تو صوفی صاحب نے کہا کہ تم عینک لگا کر بالکل الو لگتے ہو تو صوفی صاحب کا وہ شاگرد کہنے لگا۔ استادِ محترم اگر میں یہ عینک نہ لگاؤں تو مجھے آپ الو لگتے ہیں۔

پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اُستادوں کے اُستاد تھے، جگت اُستاد تھے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں فارسی پڑھاتے تھے، جہاں احمد شاہ پطرس بخاری پرنسپل تھے۔ ایک مرتبہ بخاری صاحب کسی کلاس میں گئے۔ صوفی تبسم کے صاحبزادے بھی کلاس رُوم میں بطور طالب علم موجود تھے۔ فارسی شاعری پر کوئی بات چلی تو پطرس بخاری نے پوچھا: "تم لوگوں کو فارسی کون پڑھاتا ہے؟" صوفی صاحب کے صاحبزادے نے فخریہ بتایا کہ "ابا پڑھاتے ہیں"۔
بخاری صاحب نے کہا: "اونوں تے آپ فارسی نئی آوندی تہانوں کی پڑھائے گا؟"

یہ بات فارسی کے مستند اُستاد کے بارے میں اُس کے بیٹے سے کہی جا رہی تھی، خیر بات آئی گئی ہوگئی۔ کچھ عرصے بعد صوفی صاحب کا بخاری صاحب سے آمنا سامنا ہوا تو صوفی صاحب نے گِلہ کیا:

"یار بخاری! گل تے تیری سچی اے، پر بچیاں نوں اے گلاں نئی دسّی دِیاں"

ابوالاثر حفیظ جالندھری

ولادت: ۱۴؍جنوری ۱۹۰۰ء (جالندھر، پنجاب)

وفات: ۲۱؍دسمبر ۱۹۸۲ء (لاہور)

حفیظ جالندھری سرعبد القادر کی صدارت میں انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں چندہ جمع کرنے کی غرض سے اپنی نظم سنا رہے تھے۔ جلسے کے اختتام پر منتظم جلسہ نے بتایا کہ 300 روپیہ جمع ہوئے۔

حفیظ نے مسکراتے ہوئے کہا کہ یہ میری نظم کا اعجاز ہے۔

''لیکن حضور!'' منتظم نے متانت سے کہا: ''200 روپیہ ایک ایسے شخص نے دیئے ہیں جو بہرا تھا۔''

حفیظ جالندھری سر کے بالوں سے محروم تھے، کسی بے تکلف دوست نے پوچھا: سر کے بال نہ ہونے سے کوئی مسئلہ تو نہیں بنتا۔

''مسئلہ کیا بنے گا۔ البتہ وضو کرتے وقت یہ پتہ نہیں چلتا کہ منہ کی سرحدیں کہاں تک ہیں۔''

ایک دفعہ ہم کسی کام سے کراچی گئے تو ایک روز وقت نکال کر حفیظ جالندھری صاحب سے ملنے ان کے دفتر چلے گئے۔ وہ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور ہماری تواضع کے لیے سامنے رکھی ہاتھ کی ضرب سے بجنے والی گھنٹی بار بار بجانے لگے۔ مگر چپراسی غائب تھا۔ حفیظ جالندھری صاحب نے گھنٹی میز سے اٹھائی اور باہر نکل گئے۔ قریب ہی موڑ پر مختلف دفتر کے کارندوں کے درمیان چپراسی بیٹھا گپ لگا رہا تھا۔ آپ نے گھنٹی عین اس کے سر پر رکھ کر زور سے بجائی وہ ہڑبڑا کر اٹھا، اب آپ اسے کہنے لگے: ''ذرا کمرے میں چلئے اور خود آکر کرسی پر براجمان ہو گئے۔''

چپراسی ڈرتے ڈرتے بولا: ''حکم حضور!''

وہ بولے: ''یہ اپنے حمید اختر آئے ہوئے ہیں ان کی تواضع کے لئے چائے پانی کا بندوبست کر دیجیے۔''

دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ حفیظ جالندھری برطانوی حکومت کے Song Publicity Department کے انچارج تھے۔ ہر مشاعرے میں ایک طرح سے ان کی ڈیوٹی تھی کہ جنگ کی تائید اور فوجی بھرتی کی موافقت میں کوئی گیت ضرور پڑھیں۔ چناں چہ کلام سنانے سے پہلے اس قسم کا ایک نہ ایک گیروہ حاضرین کو زبردستی سنایا کرتے تھے۔ ان کا سب سے مشہور یا بدنام گیت تھا۔

اڑوسن پڑوسن چاہے کچھ کہے
میں تو چھورے کو بھرتی کر آئی رے

اس کا تو خیر مذاق اڑایا ہی جاتا تھا، اسی کے بعد جب ایک مرتبہ انہوں نے یہ غزل پڑھی:

ناکامیابی یا کامیابی
دونوں کا حاصل خانہ خرابی

پڑھتے پڑھتے جب اس شعر پر پہنچے،

دنیا و دیں سے بیگانہ ہو جا
دیوانہ ہو جا، بن جا شرابی

سامعین میں سے کسی من چلے نے کہہ دیا: ''جزاک اللہ! کیا نیشن بلڈنگ NATION BUILDING (قوم کوسنوارنے کا) پروگرام ہے۔''

ایک مشاعرے میں ساغر نظامی اپنی غزل سنا رہے تھے، جب انھوں نے یہ شعر پڑھا۔

بہت تلخ تھی زندگانی مگر
گلوں، گل رخوں میں بسر ہو گئی

حفیظؔ صاحب نے بے اختیار داد دیتے ہوئے کہا: ''سبحان اللہ! کیا بات کہی ہے ''بسر ہوگئی'' سے یہاں مراد ''شیریں ہوگئی۔''

دِلّی کے ایک ہندو پاک مشاعرے میں حفیظؔ جالندھری اپنی غزل سنا رہے تھے کہ فراقؔ گورکھپوری نے دفعتاً بلند آواز سے کہنا شروع کیا: ''واہ حفیظ پیارے! کیا گلا پایا ہے، یار میرا سارا کلام لے لو مگر اپنی آواز مجھے دے دو۔'' حفیظؔ فوراً شعر ادھورا چھوڑ کر فراق سے کہنے لگے:

''جناب فراق صاحب! میں آپ کا نیاز مند ہوں، میری آواز تو کیا آپ مجھے بھی لے لیجیے لیکن خدا کے لیے مجھے اپنا کلام نہ دیجیے۔''

پطرسؔ بخاری اور حفیظؔ جالندھری اکٹھے سفر کر رہے تھے کہ ایک اسٹیشن پر ایک دوست اسی ڈبے میں داخل ہوئے جس میں وہ دونوں پہلے سے موجود تھے۔ پطرس نے یہ کہہ کر حفیظؔ کا تعارف اُن سے کرایا۔ ''آپ ہیں ہندوستان کے نامور شاعر، فردوسیِ اسلام، مصنف شاہنامۂ اسلام، نغمہ زار اور سوز و ساز حضرت ابوالاثر حفیظؔ جالندھری۔'' اس دوست نے انتہائی عالم اشتیاق میں ہاتھ بڑھا کے ان سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا: ''اچھا آپ جالندھر کے رہنے والے ہیں۔ السلام علیکم!''

حفیظؔ جالندھری پہلی بار حج کرنے کے بعد واپس آئے تو ان کے چہرے پر ریش دراز کا اضافہ ہو چکا تھا، کسی مشاعرہ میں ان کا یہ حلیہ دیکھ کر سوہن لال ساحرؔ کپورتھلوی نے داڑھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا: ''کیوں خان صاحب! یہ شاہنامۂ اسلام کا تازہ ایڈیشن ہے؟''

1963ء کے ہندو پاک مشاعرے میں پاکستان سے گئے ہوئے شاعروں میں سب سے آخر میں حفیظؔ جالندھری کو اپنا کلام سُنانا تھا۔ اس کے بعد رسماً گوپی ناتھ امنؔ کو بہ حیثیت صدر پڑھنا تھا لیکن وہ احتراماً حفیظ جالندھری سے پہلے پڑھنا چاہتے تھے، اس لیے اُٹھ کھڑے ہوئے لیکن ان سے پہلے حفیظ بن بُلائے ہی اسٹیج پر پہنچ گئے۔ امنؔ نے کہا: ''پہلے میں پڑھوں گا۔''

حفیظؔ نے جواب دیا: ''یہ خلافِ ضابطہ ہے، پہلے میں پڑھوں گا۔'' اور یہ کہہ کر انھوں نے پرچہ جیب سے نکال لیا۔ اُدھر امنؔ نے بھی پرچہ نکال لیا اور سامعین سے مخاطب ہو کر کہا: ''حضرات! اَب دوگانا ہوگا۔'' حفیظؔ یہ سن کر مسکرائے اور پرچہ جیب میں رکھ کر کہنے لگے: ''بھائی، میں ہار گیا۔''

شاعروں کی ایک محفل میں پنڈت میلا رام وفاؔ نے ایک اجنبی نوجوان کا تعارف کراتے ہوئے کہا: ''آپ ہیں نادان صاحب اور مجھ سے اپنے کلام کی اصلاح لیتے ہیں۔''

ایک شاعر نے وفاؔ صاحب کے تخلص کی رعایت سے جملہ کسا:

''کافی وفادار شاگرد معلوم ہوتا ہے۔''

اس پر حفیظؔ صاحب نے اپنا یہ شعر پڑھ دیا:

وفاداریاں سخت نادانیاں ہیں
کہ ان کا نتیجہ پشیمانیاں ہیں

حفیظ صاحب نے بتایا کہ علامہ اقبال مجھ سے ''شاہ نامہ'' سنا کرتے تھے اور رویا کرتے تھے۔ یہ سن کر محمد طفیل ہنسنے لگ گئے۔ کہنے لگے: ''ہنس کیوں رہے ہو؟''

''ایک لطیفہ یاد آ گیا ہے جو مشہور ہے۔''

''وہ کیا؟''

''میں نے سنا ہے کہ آپ حکیم محمد چشتی کے پاس تشریف لے گئے تھے۔ ان سے آپ نے اپنی علالت کا حال بیان کیا۔ انہوں نے نسخہ تجویز کر دیا۔ آپ نے پوچھا: ''کوئی پرہیز؟'' انہوں نے کہا: ''کوئی دماغی کام نہ کریں۔'' آپ نے فرمایا: ''آج کل شاہ نامہ لکھ رہا ہوں۔''

اس پر حکیم صاحب نے فرمایا تھا: ''وہ لکھتے رہیں۔'' آج جو آپ نے یہ فرمایا: علامہ اقبال، آپ سے شاہ نامہ سن کر رویا کرتے تھے تو مجھے حکیم فقیر محمد چشتی والا لطیفہ یاد آ گیا۔''

محسن بھوپالی اور سحر انصاری نے بخاری صاحب سے ملاقات کی۔

انہوں نے کہا:

''ایک واقعہ اور یاد آیا تھا، لیکن میں نے ماحول کو ملحوظ رکھتے ہوئے (حفیظ کی یاد میں) نہیں سنایا۔''

''لیکن اب محفل ختم ہو چکی ہے۔'' یہ کہہ کر ہم نے اصرار کیا۔ چنانچہ ہمارے اصرار پر انہوں نے سنا ہی دیا، ایک دفعہ حفیظ جالندھری کہنے لگے:

''یار! تُو حفیظ ہوشیار پوری سے کیوں نہیں کہتا کہ وہ اپنا تخلص بدل لے۔ خواہ مخواہ غلط فہمی ہوتی ہے۔''

میں نے کہا:

''حفیظ صاحب! تخلص تو آپ کو بدل لینا چاہیے۔''

''وہ کیوں؟'' حفیظ جالندھری نے پوچھا۔

میں نے جواب دیا: ''اس لیے کہ آپ کے جو اچھے شعر ہوتے ہیں وہ حفیظ ہوشیار پوری کے کھاتے میں چلے جاتے ہیں۔''

تاجور نجیب آبادی سے حفیظ جالندھری کی کبھی نہ بنی، صرف ٹھنی ہی ٹھنی رہی۔ تاجور انہیں شاعر ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ اگر تیار تھے بھی تو ان کی شاعرانہ چوہدراہٹ انہیں کھلتی تھی، چنانچہ رہی تو صرف تناہی رہی۔ ادھر یہ تاجور کو شاعر کم، پہلوان زیادہ سمجھتے تھے۔ وہ انہیں شاعر کم، گویا زیادہ کہتے تھے۔ ادھر ادھر کے مشاعروں میں بھی چشمکیں ہوا کرتی تھیں، مگر ایس ولی، ایس والی چشمک تو حیران کن، بلکہ دل خوش کن زیادہ تھی۔ جب حفیظ صاحب پڑھ کر اسٹیج سے اترے تو پروگرام کے مطابق تاجور پارٹی نے نازش رضوی کا نام پکارا۔ اول تو اتنے بڑے شاعر کے بعد ان سے کم تر درجے کے شاعر کو بلانا یوں بھی ان کی توہین تھی۔ صرف اس پر اکتفا نہ کیا گیا۔ دیکھا کہ اس کم بخت کے اسٹیج پر آنے کے ساتھ ساتھ دو تین آدمی طبلے اور

سارنگیاں لے کر بڑھے اور خود نازش ہارمونیم لے کر پہنچے۔ اس سین کا دیکھنا تھا کہ لوگوں کا مارے ہنسی کے برا حال ہو گیا۔ قہقہے تھے کہ چھت پھاڑے دے رہے تھے۔ یہ دراصل اس امر کا اظہار تھا کہ جناب حفیظ! اگر آپ گا کر مشاعرے پر چھا سکتے ہیں تو ہم بھی گا بجا کر مشاعرہ لوٹیں گے۔

ستمبر ۱۹۶۸ء میں چٹا گانگ میں ایک کل پاکستان مشاعرے کا اہتمام ہوا۔ میں ان دنوں چٹا گانگ میں ہی تعینات تھا اور اس مشاعرے میں موجود تھا۔ سامعین کی پہلی صف میں ایک بڑا افسر اپنی بیگم کے ساتھ بیٹھا تھا۔ معلوم نہیں کیا مسئلہ تھا، وہ میاں بیوی آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔ ان کی کھسر پھسر مشاعرے میں خلل ڈال رہی تھی مگر وہاں کوئی ایسا نہ تھا جو اُنہیں یہ کہتا کہ براہِ کرم خاموشی اختیار کریں اور لوگوں کو مشاعرہ سننے دیں۔ بطور آخری شاعر حفیظ صاحب مائیک پر تشریف لائے اور اپنے مخصوص ترنم میں مشہور غزل کا مطلع سنایا:

فردوس کی طہور بھی آخر شراب ہے
مجھ کو نہ لے چلو مری نیت خراب ہے

حفیظ صاحب ابھی مطلع پڑھ ہی رہے تھے کہ ان میاں بیوی کی کھسر پھسر پھر گونجی۔ حفیظ صاحب رُک گئے اور ان صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا: ''جب مشاعرے میں بیٹھنے کی تمیز نہیں تو کیا تمھیں کسی حکیم نے کہا تھا کہ مشاعرے میں آؤ۔''

یہ سُن کر اس کی بیگم تو فوراً اٹھ کر چلی گئی۔ چند لمحوں بعد وہ صاحب بھی اُٹھے اور سر جھکائے چپ چاپ رخصت ہو گئے۔

پنڈت ہری چند اختر

ولادت: ۱۵؍اپریل ۱۹۰۱ء (ہوشیار پور)

وفات: ۱؍جنوری ۱۹۵۸ء (دہلی)

ایک دفعہ محمد دین تاثیر نے ہری چند اختر سے پوچھا۔ ''یار پنڈت، سُنا ہے تُو حفیظ کا شاگرد ہے۔''

اختر صاحب نے کہا ''ہاں یہ بات تو صحیح ہے۔''

تاثیر نے برجستہ کہا۔ ''میں تو تیری بڑی عزت کرتا تھا۔''

مالیر کوٹلہ کے ایک مشاعرے میں پریم وار برٹنی جب مشاعرہ کے دوران سامعین کی صفوں کو چیرتے ہوئے سٹیج کی طرف بڑھنے لگے تو وہ بری طرح دھت تھے، پنڈت ہری چند اختر سے کسی نے کہا: ''لیجیے، وہ پریم وار برٹنی بھی آ رہے ہیں۔''

اختر صاحب نے مدہوش پریم وار برٹنی کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا:

''آ رہے ہیں؟ یہ مردود تو سچ مچ مرد ہے، نام سے تو میں سمجھتا تھا کہ کوئی خاتون ہوں گی۔''

کچھ نقاد حضرات اُردو کے ایک شاعر کی مدح سرائی کر رہے تھے، ان میں سے ایک نے کہا:

''صاحب کیا بات ہے، بہت بڑے شاعر ہیں، اب تو حکومت کے خرچ سے یورپ بھی ہو آئے ہیں۔''

ہری چند اختر نے یہ بات سنی تو نہایت متانت سے کہا۔

''جناب اگر کسی دوسرے ملک میں جانے سے کوئی آدمی بڑا شاعر ہو جاتا ہے تو میرے والد صاحب ملکِ عدم جا چکے ہیں لیکن خدا گواہ ہے کہ کبھی ایک شعر بھی موزوں نہیں کر سکے۔''

ہری چند اختر جوش صاحب سے ملنے گئے، جاتے ہی پوچھا: ''جناب! آپ کے مزاج کیسے ہیں؟''

جوش صاحب نے فرمایا: ''آپ تو غلط اُردو بولتے ہیں، یہ آپ نے کیسے کہا کہ آپ کے مزاج کیسے ہیں، جب کہ میرا تو ایک مزاج ہے نا کہ بہت سے مزاج۔''

کچھ دن بعد اختر کی پھر جوش سے ملاقات ہوئی۔ جوش نے فرمایا:

''ابھی ابھی جگن ناتھ آزاد صاحب کے والد تشریف لائے تھے۔''

اس پر اختر صاحب یکدم بولے:

''کتنے؟''

محترمہ بیگم حمیدہ سلطان صاحبہ جنرل سیکرٹری انجمن ترقی اردو (دہلی) کے ہاں علی منزل میں ایک شعری نشست میں حضرت نوح ناروی ایک غزل پڑھ رہے تھے جس کی زمین تھی ''حالات کیا کیا، آفات کیا کیا۔''

جب وہ اپنے مخصوص انداز میں ایک شعر کا مصرع اولیٰ پڑھ رہے تھے:

یہ دل ہے، یہ جگر ہے، یہ کلیجہ

تو ہری چند اختر جھٹ بول اٹھے:

قصائی لایا ہے سوغات کیا کیا

سامعین تو کیا خود نوح ناروی کا ہنستے ہنستے بُرا حال تھا۔ حالانکہ ہنسی اور نوح ناروی میں اینٹ اور کتے والا بیر تھا۔

ہندی زبان کا ایک حامی پنڈت ہری چند اختر کے پاس آیا اور کہا: ''ہندی ہماری بھارت کی راشٹریہ بھاشا ہے۔ اس لیے اب سائیکل رکشا والے کو ''ترہتیا چکرا والا'' کہا جاتا ہے۔

پنڈت جی نے اس آدمی پر ایک گہر نظر ڈالی اور کہا: ''کام پہلے ہی سے ذلیل تھا، اب نام بھی ذلیل ہو گیا ہے۔''

ایک بار جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری اور دوسرے شاعر حضرات شراب نوشی میں مصروف تھے۔ پنڈت ہری چند اختر جو شراب نوشی کے سخت خلاف تھے، انہوں نے محض وقت گزاری کے لیے بار میں دستیاب شراب کی فہرست اٹھائی اور اس کے مطالعہ میں مصروف ہو گئے۔

جوش نے نشے میں ٹن اُن سے پوچھا کہ وہ کیا پڑھ رہے ہیں؟

پنڈت جی نے انہیں بتایا کہ وہ شرابوں کی اقسام اور ان کی قیمتیں دیکھ رہے ہیں۔

جوش کب معاف کرنے والے تھے، فوراً بولے: ''پنڈت جی! آپ کے ہاتھ میں یہ ''مینو کارڈ'' ایسے ہی ہے جیسے کسی ہیجڑے کے ہاتھ میں ''کوک شاستر''۔''

جوش ملیح آبادی اور ہری چند اختر کا ایک نائیکہ کے ہاں جانا ہوا، موصوفہ نے دعوت دی کہ اپنی پسند کی لڑکیاں چن لیں، ہری چند گویا ہوئے:

''محترمہ ہم تو یہاں گانا سننے آئے ہیں پھر گھروں کو لوٹ جائیں گے۔''

ان لڑکیوں میں سے ایک تیز طرار شوخ حسینہ بول پڑی:

''اچھا تو آپ انسپریشن یہاں سے لیں گے اور تخلیق گھر پر جا کر کریں گے۔''

سالانہ امتحان میں مضمون کا موضوع تھا۔ ''اتفاق''

استاد نے طلبا کو بتا رکھا تھا کہ جب سی چیز پر مضمون لکھنا ہو تو تین چیزوں کا خیال رکھو۔ (۱) تمہید یعنی اس چیز کی وضاحت جس پر مضمون لکھنا ہو۔ (۲) فوائد: پھر اس کے فائدے بیان کرو۔ (۳) نقصانات: اور آخر میں اس کے نقصانات تحریر کرو۔

ایک طالب علم کو استاد کا یہ سبق حرف بحرف یاد تھا۔ چنانچہ اس نے تمہید کے طور پر اتفاق کی معنویت پر چند جملے تحریر کیے، پھر اس کے فائدے گنوائے اور مثال کے طور پر بوڑھے اور اس کے بیٹوں کی وہ کہانی لکھ دی، جس میں بوڑھا اتفاق کی تلقین کرتے ہوئے بیٹوں کو تنکوں کا ایک گٹھا توڑنے کے کی ہدایت کرتا ہے۔

جب اتفاق کے نقصانات لکھنے کا سوال پیدا ہوا تو اس نوعمر مضمون نگار کا قلم چند لمحوں کے لیے رُک گیا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ کیا لکھے۔ آخرکار ایک دم اس کی تخلیقی رگ پھڑکی اور اس نے لکھنا شروع کیا: ''جیسے ہر چیز کے فائدے اور نقصان ہوتے ہیں اسی طرح اتفاق کے بھی بعض نقصانات ہوتے ہیں، جیسے اتفاق سے دو موٹروں کی ٹکر ہو جاتی ہے یا اتفاق سے کوئی گاڑی پٹڑی سے اُتر جاتی ہے اور اس طرح اتفاق سے بعض دفعہ بہت سا جانی اور مالی نقصان ہو جاتا ہے۔''

اور اتفاق سے بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ کل کا وہ بچہ جس نے یہ مضمون تحریر کیا تھا وہ بعد کا پنڈت ہری چند اخترؔ ہے۔

پاکستانی دانشوروں کا ایک وفد نئی دہلی آیا تو اس میں مولانا عبدالمجید سالکؔ بھی تھے۔ سالکؔ صاحب کا قیام کارونیشن ہوٹل، فتحپوری میں تھا.............. (جناب خوشتر گرامی ایڈیٹر بیسویں صدی اور پنڈت ہری چند اختر مولانا سالکؔ کے ہاں ہوٹل میں حاضر ہوئے تو ہوٹل کے ملازم سے خوشتر گرامی نے دریافت فرمایا کہ تمہارے یہاں گوشت جھٹکے کا پکتا ہے یا حلال کا۔ ملازم نے چرب زبانی سے کام لیتے ہوئے بڑی تفصیل سے بتایا کہ ان کے یہاں حلال گوشت ہی پکتا ہے اور فلاں مسلمان قصائی کے یہاں سے آتا ہے وغیرہ.......... اس پر پنڈت ہری چند اختر بڑی سادگی سے فرمانے لگے.......... ہاں بھائی ہاں، یہ پتا چل گیا کہ تم سب ''حلال خور'' ہو۔ ''حلال خور'' کے برمحل استعمال سے مولانا سالکؔ اور وہ حضرات جو اس لطیف چوٹ کا مطلب سمجھتے تھے، نے خوب خوب مزہ لیا اور جو حضرات ''حلال خور'' کے معنی سے ناواقف تھے وہ ہمارے قہقہوں پر حیران تھے۔

اُردو کے ایک عظیم الشان مشاعرے میں اُردو کے مشہور شاعر انور صابری کے کلام پڑھنے کی باری آئی تو انھوں نے جو غزل پڑھی اس کی ردیف ''ہے ساقی'' تھی جس کا مقطع حسبِ ذیل تھا:

تیری مستی بھری آنکھوں کو کوئی کچھ نہیں کہتا
یہ انور صابری کیوں مفت میں بدنام ہے ساقی

انور صابری کافی تن و توش کے آدمی تھے۔ رنگ سیاہ اور پوشش بھی کچھ عجیب و غریب سی ہوتی۔ پنڈت ہری چند اختر بھی اس مشاعرے میں مدعو تھے۔ انورؔ صابری کا شعر

سُن کر انھوں نے مسکراتے ہوئے یہ شعر موزوں کر کے پڑھ دیا:

سحر سے، جوش سے، ساحر سے تو واقف ہے میخانہ
یہ انور صابری کس مسخرے کا نام ہے ساقی

یہ سنتے ہی محفل میں قہقہوں کی برسات ہوگئی۔

دہلی میں ایک شاعر تھے جنھیں اپنی زبان پر ناز تھا۔ چنانچہ جب بھی وہ شاعروں میں شریک ہوتے تھے بار بار کہا کرتے تھے کہ حضرات زبان میں عرض کر رہا ہوں ملاحظہ ہو۔ ایک بار پنڈت ہری چند اختر بھی شریکِ مشاعرہ تھے۔ ان شاعر صاحب نے کئی بار یہ فقرہ دہرایا تو ہری چند اختر نے کہا کہ

''اب زبان سے بھی تو کچھ فرمایئے۔''

ڈاکٹر محمد دین تاثیر پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور کی فرمائش پر پنڈت ہری چند اختر نے اسلامیہ کالج کے طلبا کے لیے ایک ڈرامہ لکھا تھا۔ پنڈت جی نے وہ ڈرامہ بخاری صاحب کو دکھایا۔ بخاری صاحب نے اسے اول سے آخر تک پڑھ ڈالا اور انھیں ایسا پسند آیا کہ پنڈت جی سے کہنے لگے اختر، تم یہ ڈرامہ مجھے دے دو۔ گورنمنٹ کالج کے طلبہ اسے اسٹیج کریں گے۔ اختر صاحب نے کہا یہ کیسے ممکن ہے، میں نے اسے تاثیر کے لیے لکھا ہے۔ بخاری صاحب نے فوراً کہا: یار دے دو مجھے، تاثیر تمہارا کیا بگاڑ لے گا۔ فن گفتگو میں اختر صاحب کا بھی جواب نہیں تھا۔ فوراً بولے: بخاری! یہ تعلقات کی بات ہوتی ہے ورنہ تم بھی میرا کیا بگاڑ لوگے۔ بخاری یہ جواب سنتے ہی بے اختیار ہنس پڑے اور ڈرامہ فوراً اختر صاحب کو واپس لوٹا دیا۔

لاہور کی ایک دعوت میں اُردو کے نامور شاعر بیٹھے کھانا کھاتے ہوئے ہنسی مذاق کر رہے تھے۔

ساحرؔ لدھیانوی نے ساحرؔ کپورتھلوی کو گوشت کھاتے دیکھ کر ایک مصرع پڑھا:

گوشت کھاتا ہے جو اے دوست برہمن ہو کر

ہری چند اخترؔ نے اسے یوں پورا کیا:

ایک دن آخر مرے گا وہ ہریجن ہو کر

پنڈت ہری چند اخترؔ کسی مشاعرے میں غزل پڑھ رہے تھے۔ سامعین میں سے اچانک ایک حضرت اُٹھ کر ان کے ایک مصرعہ پر اعتراض کرتے ہوئے کہنے لگے:

''اخترؔ صاحب! دوسرے مصرعے میں الف گر گیا ہے۔''

''تو پکڑ کر کھڑا کر دیجیے۔''

اخترؔ صاحب کے اس جواب کو سن کر معترض الف کو کھڑا کرنے کی بجائے خفیف ہو کر خود ہی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

ایک بار اُردو ادب کے گرتے ہوئے معیار پر چند ادیبوں اور شاعروں میں بحث ہو رہی تھی، اس محفل میں پنڈت ہری چند اخترؔ بھی موجود تھے، جب ان سے اظہارِ خیال کے لیے کہا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ اس سے زیادہ ادب کا زوال اور کیا ہو گا کہ ہم جیسے چُغد بھی اساتذہ میں شمار ہونے لگے۔

ایک مشاعرے میں ایک بزرگ شاعر شعر سنانے تشریف لائے تو ان کے کلام سے زیادہ ان کے مضحکہ خیز حُلیے نے حاضرین کو بہت متاثر کیا۔ چھوٹی سی سفید چمک دار داڑھی، سر پر کھدر کی ڈھلی ہوئی ٹوپی اور جسم پر گہرے سبز رنگ کا لمبا سا چُغہ کسی شخص نے پنڈت ہری چند اختؔر سے پوچھا:

''یہ کون بزرگ ہیں، پنڈت جی!''

اختر صاحب پہلے تو آنکھوں پر چشمہ لگا کر ان حضرت کو غور سے دیکھتے رہے، پھر ایک دم چہک کر بولے:

''شکل وصورت سے تو مولانا نیل کنٹھ دکھائی دیتے ہیں۔''

جوش ملیح آبادی اور پنڈت ہری چند اختؔر کے درمیان زبان کے مسئلے پر بحث چھڑ گئی۔ جوشؔ صاحب کا رویہ بحث کے دوران میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ

''مستند ہے میرا فرمایا ہوا''

لیکن اختؔر صاحب بھی بے ڈھپ قسم کے ادیب تھے، جب بحث نے طوالت پکڑی تو اختؔر صاحب نے فرمایا:

''میں دلی والوں کی زبان ماننے کو تیار ہوں، میں لکھنؤ والوں کی زبان ماننے کو تیار ہوں، لیکن میں ملیح آباد کے باغبانوں کی زبان نہیں مانتا۔''

(جوش ملیح آبادی کے اپنے وطن ملیح آباد میں متعدد آموں کے باغ تھے۔)

انور صابری کا ایک مشاعرہ میں تعارف کرایا جا رہا تھا۔ ناظمِ مشاعرہ نے فرمایا:

''اب میں جس شاعر کو زحمت دے رہا ہوں، وہ آنِ شاعری، جہانِ شاعری، شانِ شاعری ہیں۔'' اس پر ہری چند اختؔر نے فرمایا کہ تعارف مکمل کیجیے، یہ ہنومانِ شاعری بھی ہیں۔

علی گڑھ نمائش کے مشاعرہ میں جوش صاحب، پنڈت ہری چند اختؔر اور کئی دوسرے شعرا شریک ہوئے۔ بیدی صاحب نظامت کر رہے تھے۔ ایک خوبرو نوجوان شاعر جب کلام سنانے مائیک پر آیا تو اس وقت جوشؔ صاحب مائیک کے عین پاس بیٹھے تھے۔ ان شاعر نے ازراہِ ادب جوشؔ سے کہا کہ قبلہ میں معافی چاہتا ہوں میری پشت آپ کی جانب ہے۔ جوش صاحب تو خاموش رہے لیکن ہری چند اختر بولے کہ برخوردار غم نہ کرو جوشؔ صاحب عین صحیح مقام پر تشریف فرما ہیں۔

ایک بار ایک خوبصورت نوجوان شاعر مائیک پر کلام سنانے آئے۔ پنڈت ہری چند اختؔر اور جوشؔ صاحب بھی موجود تھے۔ وہ صاحبزادے ہر شعر پر فرماتے کہ قبلہ جوشؔ صاحب، یہ شعر ملاحظہ فرمائیں۔ دو تین بار جب جوش صاحب کو مخاطب کر چکے اور پھر کہا ذرا یہ شعر ملاحظہ ہو۔ ہری چند اختؔر نے کہا کہ برخوردار، اس وقت جوش صاحب آپ کو ملاحظہ فرما رہے ہیں، شعر کی باری بعد میں آئے گی۔

پنڈت ہری چند اختؔر صاحب کا ایک دوست انھیں راستے میں مل گیا اور کہنے لگا:
''پنڈت جی آپ کو دعوت نامہ تو مِل گیا ہوگا، آیندہ ہفتے میرے بڑے لڑکے کی شادی ہو رہی ہے۔ آج اس کے سہرے کی کتابت کروانے کے لیے یہاں آیا تھا، اَب اُسے چھپوانے کے لیے پریس جا رہا ہوں۔''

اختؔر صاحب نے کتابت شدہ سہرا اپنے دوست کے ہاتھ سے لے کر پڑھنا شروع کیا اور ایک دو ابتدائی شعر پڑھنے کے بعد ہی پھٹ پڑے۔

''کس اُلّو کے پٹھے نے یہ شعر لکھے ہیں؟''

اختؔر صاحب کا دوست مجوب سا ہو گیا اور ان کے ساتھ کھڑے ہوئے ایک منحنی سے نوجوان کا چہرہ کتابت کے کاغذ کی طرح پیلا پڑ گیا۔

''یہ حضرت ہیں جنھوں نے سہرا لکھا ہے۔''

اختؔر صاحب کے دوست نے کسی مجرم کی طرح پشیمان ہو کر اس نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔ اس نوجوان کا اُترا ہوا چہرہ دیکھ کر اختؔر صاحب کو اپنی صاف گوئی پر افسوس ہوا لیکن دوسرے ہی لمحے انھوں نے شاعر صاحب سے مصافحہ کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

''خوب، تو یہ سہرا آپ نے لکھا ہے، بہت اچھے شعر ہیں، جزاک اللہ لیکن صاحب، مجھے اس کی کتابت دیکھ کر تکلیف ہو رہی ہے، دیکھیے نا، نومشق کاتب نے اچھے بھلے شعروں کا ستیاناس کر کے رکھ دیا ہے۔''

ایک بار پنڈت ہری چند اختؔر بہت گھبرائے ہوئے سے عرشؔ ملسیانی کے پاس پہنچے اور کہنے لگے:

''مجھے ڈھائی سو روپے دے دو۔''

عرشؔ نے پوچھا:

''کیا بات ہے؟''

نام لے کر کہنے لگے کہ فلاں صاحب کو پانچ سو روپے کی ضرورت ہے، انھوں نے قرض مانگا ہے۔ عرشؔ نے بے رُخی سے کہا:

''مگر یہ روپے آپ کو نہیں ملیں گے۔''

جواب دیا: ''یہ تو میں بھی جانتا ہوں، اسی لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔''

ایک ہندو لالا کی شادی میں مولانا عبدالمجید سالکؔ، مولانا غلام رسول مہرؔ اور پنڈت ہری چند اخترؔ شریک تھے۔ میزبان کی طرف سے پُرتکلف ویشنو کھانے کے بعد جب ہر مہمان کو ''جل جیرا'' کا ایک گلاس پیش کیا گیا تو مولانا غلام رسول مہرؔ نے متعجب ہو کر پنڈت ہری چند اخترؔ سے پوچھا:

''پنڈت جی! یہ جل جیرا کیا چیز ہے؟''

اخترؔ صاحب کے جواب دینے سے پہلے ہی سالکؔ کہنے لگے:

''پی بھی لے یار، یہ ہندوؤں کا سوڈا واٹر ہے۔''

خواجہ دل محمد، اسلامیہ کالج لاہور میں حساب کے پروفیسر تھے۔ لاہور میونسپل کارپوریشن نے کالج کے پیچھے والی سڑک کا نام ان کے نام پر ''خواجہ دل محمد روڈ'' رکھ دیا تھا۔ ہری چند اختر ایک دن کچھ دوستوں کے ساتھ گزر رہے تھے، ان کی نظر سڑک پر گئی جس پر ''خواجہ دل محمد روڈ'' لکھا ہوا تھا۔ فوراً دوستوں سے مخاطب ہو کر بولے: ''یار عجیب بات ہے، ہم تو خواجہ دل محمد کا تخلص ''دل'' سمجھے ہوئے تھے لیکن ان کا تخلص تو ''روڈ'' ہے۔''

گوپال متل

ولادت: ۱۱ جون ۱۹۰۱ء (مالیر کوٹلہ، مشرقی پنجاب)

وفات: ۱۵ مارچ ۱۹۹۳ء (نئی دہلی)

گوپال متل سے کسی نے دریافت کیا:

"کیوں صاحب! آپ نے اپنی فلاں نظم کانگرسیوں کے لیے لکھی تھی یا کمیونسٹوں کے لیے؟"

متل نے جواباً کہا:

"صاحب! میں تو درزی ہوں۔ میرا کام ٹوپیاں سینا ہے جس کے سر پر جو پوری آ جائے، پہن لے۔"

کرشن موہن جن دنوں اسسٹنٹ کمشنر آف انکم ٹیکس تھے تو ان کے اعزاز میں ایک دعوت ہوئی، اس میں گوپال متل بھی مدعو تھے۔ کرشن موہن نے غزلیں سنانا شروع کیں تو مسلسل سناتے ہی رہے۔ اچانک انہوں نے پانی مانگا تو گوپال متل نے میزبان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "اسے پانی نہ دینا، ورنہ یہ تازہ دم ہو کر اور غزلیں سنائے گا۔"

خلیق انجم اور ایم۔ اسلم ایک دو دوستوں کے ساتھ گوپال متل سے ملنے گئے تھے۔ گوپال متل سیخ پا ہو رہے تھے اور مسلمانوں کو گالیاں نکال رہے تھے۔ جب خلیق انجم نے پوچھا:

''میاں ایسی کیا بات ہوگئی کہ ہماری پوری قوم کو بے پر کی سنا رہے ہو؟''

اس پر گوپال متل بولے:

''مسلمانوں کی عقل پر پردہ پڑ گیا ہے۔ جس قوم کو کل اقبالؔ پیغام دیا کرتا تھا، آج وہ قوم جگن ناتھ آزادؔ کا پیغام برداشت کر رہی ہے۔''

(جگن ناتھ آزادؔ اُن دنوں پاکستان سے لوٹے تھے اور ان کی نظم ''بھارت کے مسلمان'' کا ان دِنوں کافی چرچہ ہو رہا تھا۔)

انورؔ صابری کے بارے میں مشہور تھا کہ انھیں جھوٹ وضع کرنے کی عادت ہے۔ ایک دفعہ علی گڑھ سے واپسی پر ایک قبر کے سامنے سے گزرتے ہوئے انھوں نے وعلیکم سلام کہا تو ساتھ کے دوستوں نے پوچھا کہ آپ نے کس کو سلام کا جواب دیا ہے؟

اس پر انھوں نے بتایا کہ اس قبر میں ہمارے سلسلے کے بزرگوں میں سے کوئی صاحب دفن ہیں، میں نے ان کے سلام کا جواب دیا ہے۔ دہلی پہنچنے پر ساتھ والے لوگوں نے گوپال متل صاحب سے ذکر کیا کہ دیکھیے، صابری صاحب کس قدر جھوٹ بولتے ہیں۔ علی گڑھ میں جس قبر کا ذکر وہ کر رہے تھے، وہ تو ایک انگریز کے کسی کتے کی قبر ہے۔ اس پر گوپال متل صاحب کہنے لگے، آپ جو فرما رہے ہیں بالکل بجا۔ لیکن آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ انور صابری جھوٹ بول رہے ہیں؟

اس زمانے میں جب تلنگانہ تحریر کا زور تھا اور کمیونسٹ پارٹی غیرقانونی قرار دے دی گئی تھی، کتنے ہی لیڈر گرفتار ہو گئے جو حراست سے بچ گئے وہ Under Ground ہو گئے۔ ہنس راج رہبر، دہلی کی صوبائی کمیونسٹ پارٹی کا دفتر روزانہ کھولتے تھے، ڈاک دیکھتے، جوابات لکھتے جاتے اور شام کو دفتر بند کر کے گھر چلے جاتے۔ ایک دن کہنے لگے:

''کمال ہے! آخر حکومت مجھے کیوں نہیں پکڑتی؟''

گوپال متل نے، جو اس وقت موجود تھے، بے ساختہ کہا:

''حکومت کیا بے وقوف ہے جو تجھے پکڑے گی۔ اسے معلوم ہے تُو باہر رہ کر کمیونسٹ پارٹی کو زیادہ نقصان پہنچا سکتا ہے۔''

انور صابری

ولادت: مئی ۱۹۰۱ء (پاکپتن)

وفات: اگست ۱۹۸۵ء (دیوبند)

آزادی کے بعد انور صابری پہلی بار پاکستان گئے تو لاہور کے ایک مشاعرے میں ان کا سامنا ایک ایسے شخص سے ہوگیا جو تحریک آزادی کے دوران ان کا سیاسی حریف تھا۔ اپنی باری آئی تو انور صابری نے جو غزل سنائی اس کا ایک شعر تھا:

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

شعر سن کر وہ صاحب ذرا خفیف بھی ہوئے اور چہرے پر ناگواری کے اثرات بھی نظر آئے، تو انور صابری نے فی البدیہہ مطلع کہا:

تم اسے شکوہ سمجھ کر کس لئے شرما گئے
مدتوں کے بعد دیکھا تھا تو آنسو آ گئے

کنور صاحب ایک مشاعرے میں شاعروں کا تعارف کروا رہے تھے، جب مولانا انور صابری کے پڑھنے کا نمبر آیا تو کنور صاحب نے فرمایا: ''حضرات! آپ نے بازو بند، کمر بند وغیرہ کا نام تو سنا ہوگا۔ مگر یہ دیو بند کا شاعر ہے، جو آپ کے سامنے کلام سنانے آرہا ہے۔''

علامہ انور صابری ایک زمانے کے مقبول ترین شعرا میں تھے۔ شاعر انقلاب ان کا لقب تھا اور شاعری بھی بڑی انقلابی تھی۔ تحریک آزادی کے ہراول میں شامل تھے۔ مشاعروں کی جان تھے۔ بڑے تن توش کے آدمی تھے اور رنگ گہرا سانولا تھا۔ ڈاڑھی سر سید کی ڈاڑھی سے بس اُنیس تھی اور بہ سبب خضاب شب دیجور کو شرماتی تھی۔ بدیہہ گوئی میں کمال حاصل تھا۔ ہم نے خود دیکھا بیٹھے بیٹھے بیس تیس شعر کہہ ڈالتے، سامنے پڑے ہوئے کسی بھی کاغذ پر لکھ کر وہیں چھوڑ کر اٹھ جاتے تھے۔ اس وجہ سے نہ جانے کتنا کلام لاپتہ اور ضائع ہو گیا۔ نبض دوراں کے عنوان سے ان کی کچھ منتخب غزلوں اور نظموں کا ایک مجموعہ شائع ہوا تھا، اب وہ بھی معدوم ہے۔

ایک بار وہ پاکستان آئے ہوئے تھے۔ راولپنڈی کے مشاعرہ میں شرکت کے بعد تفریحاً بس سے مری جانے کی ٹھانی اور تنہا ہی نکل کھڑے ہوئے۔ بس میں ان کے ساتھ والی نشست پر انہی کے سے جان جثہ کی ایک بزرگ خاتون آ کر بیٹھ گئیں۔ انور صابری صاحب نے وقت گزاری کے لئے ان خاتون سے پوچھا: ''آپ کہاں جا رہی ہیں؟''

خاتون نے کہا:

''میں مری جا رہی ہوں۔''

صابری صاحب خاموش بیٹھے رہے۔ اب ان خاتون نے پوچھا: ''اور بھائی آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

انور صابری صاحب نے بڑی متانت سے جواب دیا:

''میں مرا جا رہا ہوں!''

ہندوستان کے سابق ہوم منسٹر کیلاش ناتھ کاٹجو کی صدارت میں مشاعرہ ہو رہا تھا، انور صابری جب سٹیج پر آئے تو کلام پڑھنے سے پہلے فرمانے لگے: ''وقت وقت کی بات ہے، میں اب تک وہی شاعر کا شاعر ہوں اور کاٹجو صاحب وزیر بن گئے ہیں، حالانکہ انگریزوں کے

دورحکومت میں ہم دونوں ایک ہی جیل میں رہ چکے ہیں۔'' کنور صاحب نے فوراً جملہ چست کیا: ''لیکن جرائم جدا جدا تھے۔''

ایک مشاعرے میں نور میرٹھی کے بعد مولانا انور صابری نے اپنا کلام سنایا۔ گوپی ناتھ امنؔ نے نور صاحب کی غزل کا یہ مصرعہ دہراتے ہوئے مولانا کو بلایا: ؎

اب ان کا زمانہ ہے اب ان کی جوانی ہے

مولانا اسٹیج پر تشریف لائے اور امنؔ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

اب ان کا بڑھاپا ہے اور میری جوانی ہے

نگینہ ضلع بجنور میں ایک مشاعرہ میں حافظ محمد ابراہیم مرحوم سابق گورنر پنجاب اور مرکزی وزیر صدارت فرما رہے تھے۔ جنرل شاہ نواز مہمانِ خصوصی تھے۔ بیدیؔ صاحب نظامت کر رہے تھے۔ علامہ انور صابری بھی شریکِ مشاعرہ تھے۔ جب بیدی صاحب نے ان کو دعوتِ کلام دی تو ان کے تعارف میں کہا کہ حضرات! حضرت انور صابری جنگِ آزادی کے مجاہد شاعر ہیں۔ اللہ کے فضل و کرم سے بڑے پاک باز راست باز ہیں۔ ابھی بیدی صاحب یہ کہہ ہی رہے تھے کہ سامعین میں سے ایک صاحبزادے نے بآواز بلند کہا کہ پاک باز، راست باز، ہی نہیں بلکہ لونڈے باز بھی ہیں۔ اس پر سامعین میں سے ایک نے لڑکے کو ڈانٹا کہ کیا بیہودہ بات بک رہے ہو تو علامہ انور خود ہی فرمانے لگے کہ صاحب، ان کی تردید نہ کیجیے۔ صاحبزادے جو کچھ فرما رہے ہیں اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر فرما رہے ہیں۔ اس پر وہ قہقہہ بلند ہوا کہ ان صاحبزادے کو مشاعرہ سے بھاگتے ہی بنی۔

علی گڑھ یونیورسٹی کے آل انڈیا مشاعرہ میں بے پناہ ہوٹنگ ہو رہی تھی کہ علامہ انور صابری نے مائیک پر آ کر کہا۔ عزیز طالب علمو! کیا یہ مشاعرہ اسی دانش گاہ میں ہو رہا ہے جس کا خواب سرسید احمد خان نے دیکھا تھا۔ ایک لڑکے نے کہا جی ہاں! یہ دانش گاہ وہی ہے، جس کا خواب سرسید احمد خان نے دیکھا مگر اس دانش گاہ میں ایسا مشاعرہ سرسید نے نہیں دیکھا تھا۔

ایک مرتبہ علامہ انور صابری اپنے سفرِ پاکستان کی روداد فرقت کاکوروی کو سنا رہے تھے۔ کہنے لگے کہ صدر ایوب مجھ سے لپٹ گئے اور اصرار کیا کہ میں ان کے ساتھ ہی قیام کروں۔ اسی دوران ذوالفقار علی بھٹو آ گئے۔ انھوں نے صدر پاکستان سے کہا کہ ان کو میرے ساتھ قیام کرنا ہوگا کیونکہ یہ میرے دوست ہیں۔ مولانا اربابِ حکومت کی مہمان نوازی کا قصیدہ پڑھ رہے تھے اور ٹیپ کا بند صدر ایوب تھے۔ اچانک فرقت صاحب بولے کہ ''صدر ایوب بھلا کیوں نہ مہمان نواز ہوگا۔ اپنے میرٹھ کا جو رہنے والا ہے۔''

مولانا کے تیور بدل گئے جھلاہٹ کے ساتھ فرقت صاحب سے کہنے لگے: ''تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ صدر ایوب سرحدی پٹھان ہیں اور تم اس کو میرٹھ کا باشندہ بتا رہے ہو۔''

فرقت صاحب نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا: ''مولانا! بے شک، یہ بات غلط ہے۔ میں اتنی دیر سے تمہارے جھوٹ برداشت کر رہا ہوں اور تم میرا ایک جھوٹ بھی برداشت نہیں کر سکے۔''

دہلی سے مشہور شاعر انور صابری کراچی آئے ہوئے تھے۔ اُن کا قیام قاری زاہر قاسمی کے ہاں تھا۔ ایک روز دوپہر کا کھانا ہو رہا تھا۔ مہمان، میزبان اور کئی ملاقاتی دسترخوان پر موجود تھے۔ کھانے کے ساتھ پُورا انصاف کیا جا رہا تھا۔ اتنے میں ایک صاحب اور آ گئے۔

میزبان نے اُن سے کہا۔ ''آ جایئے، کچھ تناول فرما لیجیے۔'' وہ صاحب کہنے لگے۔ ''بھوک تو نہیں ہے لیکن تھوڑا بہت کھا لوں گا تا کہ آپ کا نمک خوار ہو جاؤں۔'' قاری زاہر قاسمی نے برجستہ کہا۔ ''ہمارے ہاں کھانے میں نمک نہیں پڑتا۔ آپ خوار ہی خوار ہوں گے۔''

انور صابری مدھیہ پردیش اُردو کانفرنس کے مشاعرے میں غزل پڑھنے جب مائک پر آئے تو فوٹوگرافر نے ان کی تصویر لینا چاہی۔ کہنے لگے:

''مجھ جیسے کی تصویر کیا کیجیے گا۔''

مجمع میں سے آواز آئی:

''بچوں کو ڈرانے کے کام آئے گی۔''

شوکت تھانوی

ولادت: ۲ر فروری ۱۹۰۴ء (بندرابن ضلع متھرا، یوپی)

وفات: ۴ر مئی ۱۹۶۳ء (لاہور)

ایک بار کسی تھانے میں مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ کسی وجہ سے صدر مشاعرہ تشریف نہ لا سکے تو منتظم مشاعرہ نے شوکت تھانوی سے کرسی صدارت پر تشریف فرمانے کی درخواست کی۔ شوکت تھانوی نے مائک پر آ کر کہا: ''مجھے معلوم تھا کہ تھانے میں آپ کسی تھانوی ہی کو صدر بنائیں گے۔''

یہ سننا تھا کہ ساری محفل لالہ زار بن گئی۔

ایک بار محرم الحرام کے موقعے پر لکھنو میں ایک ''بزم عزا'' میں چند احباب شریک تھے۔ ان میں بلا اختلاف عقیدہ، بے تعصب اور سنجیدہ احباب بھی موجود تھے۔ اس بزم میں شوکت تھانوی بھی، جو کسی صوبہ جاتی یا فرقہ وارانہ تعصب و اختلاف کے قائل نہیں، شریک تھے۔ شوکت صاحب کے برابر بیٹھے ہوئے ایک شیعہ دوست پر مصائب کربلا کے ذکر پر رقت طاری تھی اور ان کی زبان سے بآواز یہ فقرہ ادا ہوا: ''بخدا! اب سنا نہیں جاتا، کیا کروں؟''

شوکت تھانوی نے ان کے کان میں برجستہ کہا: ''سنی ہو جاؤ۔''

ان دوست کو بے اختیار ہنسی آ گئی اور انہوں نے رومال سے منہ چھپا لیا۔

ایک مرتبہ ایک مشاعرے کی نظامت شوکت تھانوی کے ذمے تھی۔ جگر مرادآبادی صدرِ شاعر تھے۔ ایک صاحب جو شاعر نہ تھے، جگر کے بالکل ہی نزدیک، چہرہ بہ چہرہ بالمقابل اِس طرح بیٹھ گئے کہ حاضرینِ محفل کو اور خود جگر صاحب کو اُن کا اِس طرح بیٹھنا ناگوار گزر رہا تھا۔ شوکت تھانوی نے اُن صاحب سے گزارش کی وہ اسٹیج پر عین جگر صاحب کے بالمقابل چہرہ بہ چہرہ ہو کر نہ بیٹھیں۔

اُن صاحب نے تُرش رُو ہو کر جواب دیا:

''نہیں! میں تو یہیں بیٹھوں گا۔ مجھے کوئی نہیں اٹھا سکتا۔''

شوکت تھانوی نے کہا:

''جی بسم اللہ! آپ یہیں تشریف رکھیے۔ میں نے تو صرف اِس لئے منع کیا تھا کہ آپ کو دیکھ کر ''ہز ماسٹرز وائس'' کا ٹریڈ مارک یاد آ جاتا ہے جس میں گراموفون کے بھونپو کے عین سامنے کوئی بیٹھا ہوا ہے۔''

شوکت صاحب کا یہ فقرہ سنتے ہی حاضرین کے قہقہوں سے پورا ہال گونجنے لگا اور وہ صاحب بے حد شرمندہ اور سراسیمہ ہو کر ہال سے باہر چلے گئے۔

ایک دفعہ شوکت تھانوی سخت بیمار پڑے، یہاں تک کہ ان کے سر کے بال جھڑ گئے۔ دوست احباب ان کی عیادت کو پہنچے اور بات چیت کے دوران میں ان کے گنجے سر کو بھی دیکھتے رہے، سب کو متعجب دیکھ کر شوکت تھانوی بولے:

''ملک الموت آئے تھے، صورت دیکھ کر ترس آ گیا، بس صرف سر پر ایک چپت رسید کر کے چلے گئے۔''

پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار ایس پی سنگھا کے گیارہ بچوں کے نام کا آخری حصہ

''سنگھا'' تھا۔ جب ان کے ہاں بارہواں لڑکا پیدا ہوا تو شوکت تھانوی سے مشورہ کیا کہ اس کا کیا نام رکھوں۔

اس پر شوکت صاحب نے بے ساختہ کہا: ''آپ اس کا نام بارہ سنگھا رکھ دیجیے۔''

ایک ناشر نے کتابوں کے نئے گاہک سے شوکت تھانوی کا تعارف کراتے ہوئے کہا: ''آپ جس شخص کا ناول خرید رہے ہیں وہ یہی ذات شریف ہیں۔لیکن یہ چہرے سے جتنے بے وقوف معلوم ہوتے ہیں اتنے ہیں نہیں۔''

شوکت تھانوی نے فوراً کہا: ''جناب مجھ میں اور میرے ناشر میں یہی بڑا فرق ہے۔ یہ جتنے بے وقوف ہیں، چہرے سے معلوم نہیں ہوتے۔''

شوکت تھانوی نے جب شعر کہنے شروع کیے تھے، اس وقت نو عمر تھے۔ بڑی کوشش کے بعد وہ اپنی غزل رسالہ ''ترچھی نظر'' میں چھپوانے میں کامیاب ہوگئے۔ اس غزل کا ایک شعر یہ بھی تھا:

ہمیشہ غیر کی عزت تیری محفل میں ہوتی
ترے کوچے میں جا کر ہم ذلیل وخوار ہوتے

شوکت تھانوی کے والد کی نظر جب اس شعر پر پڑی تو ان کی والدہ کو غصے میں یہ شعر سنا کر کہنے لگے: ''یہ آوارہ گرد آخر اس کوچے میں جاتا ہی کیوں ہے؟''

شوکت کی والدہ ان کے والد کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے صفائی پیش کرتے ہوئے بولیں: ''بچہ ہے، غلطی سے چلا گیا ہوگا، میں منع کردوں گی، اب کی بار معاف کر دیں۔''

امتیاز علی تاج کے متعلق شوکت تھانوی نے لکھا:

''اگر یہ تخلص امتیاز صاحب نہ رکھ چکے ہوتے تو علامہ تاجور نجیب آبادی کو غالباً اپنے تخلص میں خوامخواہ ''ور'' لگانے کی ضرورت نہ ہوتی۔''

ابوالاثر حفیظ جالندھری نے پیرانہ سالی میں جب ایک انگریز خاتون سے شادی کے بارے میں سوچا۔ تذبذب کے عالم میں انھوں نے جب شوکت تھانوی سے مشورہ کیا تو شوکت نے کہا: ''حفیظ صاحب! اس سے قبل کہ وہ بیوۂ حفیظ بن جائے۔ آپ شادی کر لیں۔''

شوکت تھانوی یورپ کے لیے روانہ ہونے لگے تو ان کے ایک دوست نے پوچھا: ''روانگی کب ہوگی؟'' شوکت نے کہا: ''کیا بتاؤں، تمہاری بھاوج نے پریشان کر رکھا ہے۔ کہتی ہے ولایت جاؤ گے تو میم ضرور لاؤ گے۔ حالانکہ میں نے قسم کھا کر کہا ہے کہ اگر اپنے لیے میم لایا تو تمہارے لیے بھی ایک صاحب ضرور لاؤں گا لیکن وہ سنتی ہی نہیں۔''

شوکت تھانوی باغ و بہار طبیعت کے مالک تھے۔ ایک بار بیوی کے ساتھ کراچی جا رہے تھے۔ جس ڈبہ میں ان کی سیٹ تھی وہ نچلی تھی۔ اوپر کی سیٹ پر ایک موٹے تازے آدمی براجمان تھے۔ شوکت صاحب نے اُٹھ کر انھیں غور سے دیکھا۔ پھر چھت کی طرف دیکھ کر کہا:

''سبحان اللہ قدرت''

وہ آدمی بولا:

''کیا مجھ سے کچھ کہنا ہے؟''

شوکت نے کہا:

''جی ہاں! آپ کی نظر میں کوئی لڑکی ہے؟''

''کیوں؟''

''میں اس سے شادی کروں گا۔''

شوکت نے کہا۔

''واہ آپ کی تو بیوی ہے۔''

''سوچتا ہوں۔ جب آپ نیچے اُتریں گے تو گریں گے ضرور اور میری بیوی شہید ہو جائے گی۔ اس لیے میں ابھی سے انتظام کر رہا ہوں۔''

شوکت کے اس جواب پر سارا ڈبہ ہنس دیا اور سارے سفر میں وہ موٹے آدمی سیٹ سے نیچے نہیں اُترے۔

شوکت تھانوی مرض الموت میں مبتلا، زندگی کے آخری دنوں میں میو ہسپتال لاہور میں داخل تھے، اخلاق احمد دہلوی ان کی عیادت کے لیے لے گئے۔ حال احوال پوچھنے پر شوکت تھانوی نے کہا: ''بھائی! مَیں تو جا رہا ہوں۔''

''کہاں؟''۔۔۔اخلاق احمد دہلوی نے پوچھا۔

''انڈر گراؤنڈ''۔ شوکت تھانوی نے بے ساختہ کہا۔

سیّد ذوالفقار علی بخاری

ولادت: ۱۹۰۴ء (پشاور)

وفات: ۱۲/ جولائی ۱۹۷۵ء (کراچی)

پچاس کی دہائی کا تذکرہ ہے۔ ریڈیو پاکستان کراچی میں ارم لکھنوی اور شمس زبیری ''مصلح زبان'' کی ملازمتوں پر فائز تھے۔ اُن کا کام یہ تھا کہ وہ ریڈیو پر پڑھے جانے والے الفاظ کا تلفظ درست کروائیں، مگر قباحت یہ تھی کہ ارم لکھنوی 'لکھنوی تلفظ' کے ماہر تھے اور شمس زبیری 'دہلوی تلفظ' کے، جس کی وجہ سے اُن دونوں میں اکثر تکرار بھی ہو جاتی تھی۔

ایک دن زیڈ اے بخاری صاحب کو شکایت ملی کہ کل کسی لفظ کے تلفظ کی صحت پر ارم لکھنوی اور شمس زبیری میں تکرار اِتنی بڑھی کہ نوبت گالم گلوچ تک پہنچ گئی۔ بخاری صاحب نے ارم لکھنوی کو بلایا اور وجہ پوچھی۔

ارم صاحب نے کہا کہ

> ''ایک تو زبیری صاحب کو فلاں لفظ کا صحیح تلفظ نہیں معلوم، پھر مجھے گالی دی تو اُس کا تلفظ بھی غلط تھا۔ میں نے تو صرف اُن کا تلفظ درست کرنے کے لیے وہی گالی درست تلفظ کے ساتھ دُہرائی تھی۔ اِسے وہ کہتے ہیں کہ میں نے جوابی گالی دی۔''

سیّد ذوالفقار علی بخاری صاحب جس زمانے میں آل انڈیا ریڈیو، دہلی میں ریجنل ڈائریکٹر تھے، اکثر شام کے وقت خواجہ حسن نظامی کے ہاں جا نکلتے۔ ان کے ہاں اربابِ علم اور اربابِ عقیدت کا دربار لگا رہتا۔ بقول بخاری صاحب، خواجہ صاحب کو آئے دن نئی سے

نئی بات سوجھتی تھی۔ ایک دن انہوں نے حاضرین محفل کے سامنے یہ خیال پیش کیا کہ یہ جو سال کے بارہ مہینے ہیں، ان میں سے ہر ایک کے عربی نام کی جگہ کسی مشہور قومی لیڈر کا نام کیوں نہ رکھا جائے۔ خواجہ صاحب کی خاطر بہت سوں نے اس تجویز کی تائید کی۔ بخاری صاحب خاموشی سے تجویز اور تائید سنتے رہے۔ آخر میں بخاری صاحب نے خواجہ صاحب سے کہا: ''تجویز نہایت عمدہ ہے اور کیا عرض کروں۔''

خواجہ صاحب بولے: ''اس میں آپ کو کون سی عمدگی نظر آئی ہے؟''

بخاری صاحب نے جواب دیا: ''اس تجویز کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں رمضان کا مہینہ کہیں نہیں آنے پاتا۔''

ایوب خاں کے دورِ حکومت میں نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات روزانہ ایوب کے دورِ ترقی کے قصیدے چھاپا کرتے تھے۔ اُن دنوں ریڈیو پاکستان سے بیشتر خبروں کا آغاز اِن الفاظ سے کیا جاتا:

"صدر ایوب نے کہا ہے۔"

اُسی دور میں یوں ہوا کہ سندھ کے ایک صحافی کو اطلاعات و نشریات کا وزیر بنا دیا گیا۔ ایک دن وہ وزیر صاحب براڈ کاسٹنگ ہاؤس کا معائنہ کرنے تشریف لے گئے۔ وزیر موصوف اُس وقت کے ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان زیڈ اے بخاری کے ساتھ میٹنگ میں تھے کہ چپراسی چائے کی ٹرے لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ بخاری صاحب جلدی سے اپنی جگہ سے اُٹھے اور چائے کی ٹرے چپراسی سے لے کر نہایت ادب و احترام کے ساتھ وزیر صاحب کے سامنے رکھ دی۔

وزیر صاحب قدرے پریشان ہو کر بخاری صاحب سے مخاطب ہوئے:

"ہم پُرانے دوست ہیں اب جبکہ مَیں وزیر بن گیا ہوں، آپ مجھے خوش کرنے کے لیے کیوں اِس قدر زحمت فرما رہے ہیں؟"

زیڈ اے بخاری صاحب نے برجستہ جواب دیا اور یقیناً ایسا جواب صرف زیڈ اے بخاری ہی دینے کی جرأت کر سکتے تھے۔

"جنابِ والا! مَیں آپ کو خوش کرنے کی کوشش نہیں کر رہا، مَیں تو اپنے چپراسی کو خوش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، جس کے بارے میں مجھے یہ خوف ہے کہ وہ کسی بھی دن میرا وزیر بن سکتا ہے۔"

ایک مرتبہ جوش ملیح آبادی میرے (ذوالفقار علی) غریب خانے پر تشریف فرما تھے، شام کا وقت تھا، غروب آفتاب کا نظارہ، سمندر کی لہریں، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، جوش صاحب ایسے کیف کے عالم میں شعر پڑھ رہے تھے کہ خود اُن پر بھی کیفیت طاری تھی۔

بس جوش اور میں، میں اور جوش، اور کیفیت میں ڈوبے ہوئے شعروں کی بارش کہ اتنے میں حکیم صاحب مرزا حیدر بیگ حیدر دہلوی تشریف لائے۔

جوش صاحب کی طبیعت کا دریا طغیانی پر ہوتو محفل میں زبان کھولتے ہوئے بڑوں بڑوں کا دم نکلتا تھا مگر حکیم صاحب پھر حکیم صاحب ہیں۔ فرمایا: ''جوش صاحب! میرا ابھی ایک شعر سنئے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے خاص اسی مجلس کے لیے لکھا ہو۔ عرض کرتا ہوں۔ بخاریؒ صاحب عرض کرتا ہوں۔ ہیں جی جوش صاحب، عرض کرتا ہوں۔ عرض کیا ہے:

نگہ و کلب میں جب تک سرور ہوتا ہے

جوش صاحب!

نگہ و کلب میں جب تک سرور ہوتا ہے

ملاحظہ فرمائیے بخاری صاحب!

نگہ و کلب میں جب تک سرور ہوتا ہے

عرض کرتا ہوں جوش صاحب!

نگہ و کلب میں جب تک سرور ہوتا ہے

ہیں جی!

نگہ و کلب میں جب تک سرور ہوتا ہے

جوش صاحب تنگ آ گئے اور یکدم بولے:

یہ بندہ والد عبدالغفور ہوتا ہے

ایک محفل میں جہاں پطرس بخاری اور ان کے ہمراہ احباب بیٹھے تھے، زیڈ اے بخاری بھی موجود تھے۔ پطرس صاحب بڑا بھائی ہونے کی حیثیت سے بخاری صاحب سے بار بار کسی کام کو کہتے۔ پانی لاؤ...... اب برف لاؤ...... وہ ایک کرسی اور چاہیے وغیرہ وغیرہ۔

اس پر محفل میں موجود کسی دوست نے ذوالفقار علی بخاری سے کہا:

''بخاری صاحب سگ باش برادر خورد مباش''

(کتے بن جاؤ، چھوٹے بھائی مت بنو!)

بخاری صاحب تو جیسے بھرے بیٹھے تھے، برجستہ جواب دیا۔ یہ نہیں، یوں کہیے:

''سگ باش برادر سگ مباش''

(کتے بن جاؤ، کتے کے بھائی مت بنو!)

بخاری صاحب کی عادت تھی کہ جب کسی کا تمسخر اُڑاتے تو اس حد تک کہ وہ بے چارہ بالکل تباہ و برباد ہی ہو جاتا۔ ایک ایسا ہی واقعہ ہے جب اسسٹنٹ ریجنل ڈائریکٹر جو پروگراموں کے انچارج تھے۔ بخاری صاحب ان کو زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔ خود وہ بھی موقع کی مناسبت سے ایسی حرکتیں کرتے رہتے جو بخاری صاحب کی ناگواری کا سبب بنتی تھیں۔ ایک بار بخاری صاحب آسٹریلیا گئے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے اسسٹنٹ ڈائریکٹر صاحب نے بخاری صاحب کے کسی چہیتے کو کافی تنگ کیا۔ جب بخاری صاحب واپس آئے تو

ظاہر ہے اس شخص نے اپنے افسر کی شکایت اور بخاری صاحب نے اسسٹنٹ ڈائریکٹر صاحب کو سبق سکھانے کا فیصلہ کرلیا۔

دو چار روز بعد وہ صبح سویرے پروگرام میٹنگ میں آ گئے۔ ریڈیو کے شعبے میں دن کا آغاز ہمیشہ پروگرام میٹنگ سے ہوتا ہے کہ جس میں گزشتہ رات نشر کیے گئے پروگراموں پر تنقید و تبصرہ اور آنے والے دن کے پروگراموں کی تفصیلات پر گفتگو ہوتی ہے۔ اس میٹنگ پروگرام اور پریزینٹیشن سے تعلق رکھنے والا سارا عملہ شریک ہوتا ہے۔

اس روز میٹنگ میں بخاری صاحب، اسسٹنٹ ڈائریکٹر صاحب کی ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئے جو میٹنگ کی صدارت کر رہے تھے۔ پہلے وہ آسٹریلیا میں اپنے قیامت کی باتیں بتاتے رہے اور پھر انہوں نے اپنے سفر کا حال سنانا شروع کر دیا۔ کہنے لگے:

''واپسی پر میرے ساتھ نشست پر ایک پاکستانی نودولتیا بیٹھا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے یہ بیٹھے ہیں۔ وہ پہلے تو بڑے غور سے میرے لباس اور میری وضع کو دیکھتا رہا پھر اس نے کہا: ''آپ کا سوٹ بہت اچھا ہے۔'' میں نے کہا ''جی۔'' اس نے میرے کوٹ کا دامن زور سے پکڑ کر بڑی زور سے کھینچا اور پوچھا: ''ہاؤ مچ؟'' یہ کہتے ہوئے بخاری صاحب نے اسسٹنٹ ڈائریکٹر صاحب کے کوٹ کا دامن زور سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا کہ وہ گھبرا ہی گئے۔ پھر بولے: ''ذرا دیر بعد اس نے میرے قمیص کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا۔ اس طرح کہ میرا بٹن توڑ ڈالا اور یہ کہتے ہوئے بخاری صاحب نے جھٹکا دے کر اسسٹنٹ ڈائریکٹر صاحب کے قمیص کا بٹن توڑ ڈالا۔ ظاہر ہے اسسٹنٹ ڈائریکٹر صاحب انتہائی نروس ہو رہے تھے اور حاضرین محفل بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس سارے قصہ کا کلائمکس اس طرح ہوا کہ بخاری صاحب نے کہا اور اس کے بعد تو اس شخص نے حد ہی کر دی۔ میری ٹائی کو کمبخت نے اس طرح اپنی طرف کھینچنا شروع کیا کہ میری آنکھیں باہر نکل آئیں اور وہ ہاؤ مچ، ہاؤ مچ کہتا رہا۔

اشرف صبوحی دہلوی

ولادت: مئی ۱۹۰۵ء (دہلی)

وفات: اپریل ۱۹۹۰ء (کراچی)

میڈم نور جہاں کسی بینک میں گئیں اور چیک لکھنے کے لیے انہیں قلم کی ضرورت پیش آئی۔ اتفاق سے وہاں اشرف صبوحی صاحب موجود تھے، انہوں نے اپنا قلم پیش کیا۔ چیک لکھ کر میڈم جب دستخط کرنے لگیں تو انہوں نے وہاں لکھا:
''نور جہاں بقلم خود۔۔۔'' صبوحی صاحب فوراً بول اٹھے:''میڈم! بقلم صبوحی لکھیے! قلم تو آپ میرا استعمال کر رہی ہیں اور لکھی ہیں بقلم خود۔''

ایک بار اشرف صبوحی کسی کام سے حفیظ جالندھری کے گھر گئے، وہاں انھوں نے حفیظ جالندھری سے کوئی کتاب طلب کی، جو کسی الماری میں مقفل تھی، حفیظؔ صاحب نے بیٹھے بیٹھے ہانک لگائی۔''بیگم! ذرا چابی دینا! ایک کتاب نکالنی ہے۔''
اس پر صبوحی صاحب چہک کر بولے:''ہاں ہاں! ضرور چابی دیجیے انھیں! یہ بھی اب جاپانی کھلونا بن گئے ہیں، چابی کے بغیر نہیں چل سکتے۔''

حکیم محمد سعید دہلوی لاہور آنے کے لیے کراچی کے ہوائی اڈے پر کھڑے طیارے کا انتظار کر رہے تھے۔ اشرف صبوحی صاحب بھی ہمراہ تھے۔ اتنے میں حکیم صاحب کو واش روم جانے کی ضرورت محسوس ہوئی، انھوں نے صبوحی صاحب سے کہا کہ''ذرا سامان کا خیال رکھیے گا، میں واش روم ہو آؤں۔''
صبوحی اشرف صاحب چہک کر بولے:''حکیم صاحب! اتنی پریشانی بھی کیا؟ جس خدا نے آپ کو فارغ البال بنایا ہے، وہی آپ کو فارغ البول بھی کر دے گا۔'' یاد رہے کہ بالوں کے سلسلے میں حکیم صاحب واقعی''فارغ البال'' ہیں۔

چراغ حسن حسرتؔ

ولادت: نومبر ۱۹۰۵ء (بمیار، پونچھ، کشمیر)

وفات: ۲۶/جون ۱۹۵۵ء (لاہور)

مرشد (چراغ حسن حسرتؔ) کھانے سے زیادہ پینے کے قائل تھے، تاہم ادب کی طرح کھانے کا بھی بڑا ہی کلاسیکی مذاق رکھتے تھے۔ ذائقہ تو بعد کی بات تھی، کھانے کی صُورت بُری ہوتی تو اِس پر بھڑک اُٹھتے، طبیعت خراب ہو جاتی، اشتہا مر جاتی، کھانا کھانے کے بجائے کھانا نہ کھانے کے حق میں تقریر کرتے۔ نوابانِ اَودھ، سلاطینِ کشمیر اور قطب شاہی علی قلی خانوں کے مطبخوں، دسترخوانوں کے متعلق وہ جو وسیع ذاتی معلومات رکھتے تھے۔ اُن معلومات نے مرشد کو اِس ضمن میں کچھ اور بھی مشکل پسند بنا دیا تھا۔ ذائقے اور تنوّع کے لحاظ سے کشمیری کھانے کو کھانوں کا بادشاہ مانتے تھے۔

شب دیگ، گوشابہ، کنجو انہ، آفتابہ وغیرہ۔ کشمیری کھانوں کی ایک طویل فہرست تھی جو ہمیں ہر کھانے پر سننا پڑتی۔ ایک چینی لکھ پتی کی دعوت پر جب کوئی پچاس کورسوں کے ڈنر سے سابقہ پڑا، جس میں چینی باورچیوں نے چڑیا کی ایک چونچ میں ترش، نمکین شیریں مچھلی تل کر سامنے رکھ دی تھی، تو مرشد چینیوں کی عظمت کے بھی قائل ہو گئے تھے، مگر قیادت کا جھنڈا پھر بھی کشمیر میں لہراتا رہا۔

کسی مشاعرے میں حفیظ جالندھری اپنی غزل سناتے سناتے چراغ حسن حسرت سے مخاطب ہو کر بولے: ''حسرت صاحب! ملاحظہ فرمائیے، مصرعہ عرض کیا ہے۔'' اور حسرت صاحب، حفیظ صاحب کا مصرعہ سننے سے پہلے ہی نہایت بے چارگی سے کہنے لگے: ''فرمائیے حضرت! شوق سے فرمائیے، اپنی تو عمر ہی غزلوں کے مصرعے اٹھانے اور مردوں کو کندھا دینے میں کٹ گئی ہے۔''

کسی نے چراغ حسن حسرتؔ سے کہا: ''منٹو نے آپ کے بارے میں لکھا ہے، آپ تو محض ایک لغت ہیں جس میں مشکل الفاظ کے معنی دیکھے جا سکتے ہیں۔'' حسرت نے تلملا کر جواب دیا: ''اور منٹو ایک فحش ناول ہے جس کے مطالعہ سے جنسی یتیم اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔''

مولانا چراغ حسن حسرتؔ بے حد ذہین و فطین اخبار نویس، شاعر، ادیب و نقاد ہونے کے علاوہ اعلیٰ پایہ کے زبان داں تھے۔ ہر ایک کا مذاق اڑانا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ خواجہ روڈ لاہور پر ان کا دفتر تھا۔ جہاں وہ ہفتہ وار ''شیرازہ'' شائع کرتے تھے۔ ایک بار جو شامت آئی تو حکیم یوسف حسن پر طنز کیا۔ ''حکیم صاحب! اپنے پرچے کو بہتر بنائیے، ذرا اس جانب توجہ دیجیے کیوں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں.........''

حکیم صاحب یہ پڑھ کر سیخ پا ہو گئے۔ کس کی مجال تھی جو ان پر انگشت نمائی کرے۔ حکیم صاحب نے جواب دیا: ''حضرت مولانا! پہلے اپنے گھر کی خبر لیجیے۔ سخاوت گھر سے شروع ہوتی ہے۔ یہاں تو چراغ تلے اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ محاوروں کے بنڈل اب نہیں

چلتے۔ آپ کا ''شیرازہ'' نیوز ایجنٹوں کے ہاں سے سیدھے ردی کے بیوپاریوں کے ہاں پہنچ رہا ہے۔ لِلّٰہ! ''شیرازہ'' بکھرنے سے بچا لیجیے۔''

حسرتؔ نے بات نہ بڑھانے ہی میں عافیت دیکھی اور فریقین میں جلد ہی بدستور دوستی ہوگئی۔

مولانا چراغ حسن حسرتؔ بلند پایہ صحافی، انشا پرداز اور شاعر تھے۔ فوج میں کپتانی کے منصب پر فائز تھے لیکن ڈسپلن کے پابند نہیں تھے۔ سنگاپور میں تعیناتی کے زمانہ میں جب کرنل مجید ملک نے جو خود بھی شاعر تھے کسی معاملے میں مولانا سے تحریری باز پرس کی تو انھوں نے فائل پر یہ شعر لکھ کر بھیج دیا:

جرمنی بھی ختم، اس کے بعد جاپانی بھی ختم
تیری کرنیلی بھی ختم اور میری کپتانی بھی ختم

چراغ حسن حسرتؔ (ایڈیٹر ''شیرازہ'' لاہور) کا قد لمبا تھا ایک روز بازار گئے، آموں کا موسم تھا۔ ایک دکاندار سے بھاؤ پوچھا۔ دکاندار نے کہا: ''پانچ آنے سیر۔'' حسرتؔ نے کہا: ''میاں آم تو بہت چھوٹے ہیں۔'' دکاندار نے کہا: ''میاں نیچے بیٹھ کر دیکھو آم چھوٹے ہیں یا بڑے۔ قطب مینار سے تو بڑی شے چھوٹی نظر آتی ہی ہے۔

اختر شیرانی

ولادت: ۴رمئی ۱۹۰۵ء (ٹونک، راجستھان)

وفات: ۹رستمبر ۱۹۴۸ء (لاہور، پاکستان)

مشہور محقق اور عالم مولانا محمود شیرانی حیدرآباد دکن گئے، ایک تقریب میں ایک صاحب نے ان سے کہا: ''شیرانی صاحب! آپ کی ایک نظم مجھے بہت پسند ہے۔''

''کون سی نظم بھائی!....'' مولانا نے استفسار کیا۔

وہی جس کا مصرعہ ہے۔ ''بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں''

مولانا نے ٹھنڈی سانس بھری اور بولے: ''یہ نظم میری نہیں، میرے نالائق بیٹے اختر شیرانی کی ہے، وہ تو محض بدنام ہو رہا ہے، میں اس کے کرتوت سے رُسوا ہو رہا ہوں۔''

اختر شیرانی اور مجاز، علی گڑھ ریلوے اسٹیشن پر گھوم رہے تھے۔ اُن کی نظر سیکنڈ کلاس کے ایک کمپارٹمنٹ پر پڑی جہاں دو لڑکیاں ترکی برقعے اوڑھے بیٹھی تھیں۔ ایک لڑکی نے دوسری سے کہا:

''وہ دیکھو اختر شیرانی!''

اختر نے مجاز سے کہا:

''بھاگ اور ٹکٹ خرید کر لا!''

ابھی یہ کسی فیصلے پر نہیں پہنچے تھے کہ گاڑی چلنا شروع ہوگئی۔ اختر کے ہاتھ کوئی کمپارٹمنٹ تو نہیں آیا، گارڈ کا ڈبا آ گیا۔ جب اختر گارڈ کے ڈبے میں داخل ہونے لگے تو گارڈ نے روکا۔ اختر نے گارڈ کو ڈانٹ کر کہا:

"Shut up, it is a matter of love and Romance."

''خاموش! یہ محبت اور رومان کا معاملہ ہے۔''

اختر شیرانی لاہور کی ایک دکان کالج بوٹ شاپ انارکلی میں جوتے خریدنے پہنچے، دکاندار نے ان کے سامنے جوتوں کا ڈھیر لگا دیا۔ اختر شیرانی نے ایک جوڑا دیکھا مگر کوئی جوڑا پسند نہیں آیا۔ قیمتوں پر بھی انہیں اعتراض تھا، دوکاندار طنزیہ لہجے میں بولا:

''اتنے جوتے پڑے ہیں، آپ اب بھی مطمئن نہیں ہوئے؟''

اختر شیرانی ایک جوڑا پہنتے ہوئے بولے:

''بارہ روپے لیتے ہو یا اتاروں جوتا؟''

اختر شیرانی کو شراب پیتے دیکھ کر اُن کے ایک زاہد دوست نے نصیحت فرمائی: ''خدا کے لیے، پیتے ہوئے اس خانہ خراب میں سوڈا یا پانی ملا کر لیا کیجیے، اس طرح پینے سے دل جلتا ہے۔''

اختر شیرانی نے نیٹ پیگ حلق میں انڈیلتے ہوئے کہا: ''مولانا! اللہ بہتر جانتا ہے کہ میرے اس طرح پینے سے دراصل کس کا دل جلتا ہے۔''

اختر شیرانی شراب کے نشہ میں دھت تھے کہ اچانک ساحر لدھیانوی اور شورش کاشمیری مل گئے۔ ساحر نے نہایت عقیدت سے اختر کو سگریٹ پیش کیا تو اختر صاحب سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگاتے ہوئے جھوم کر بولے: ''مجھے دو چیزوں سے بے حد پیار ہے۔''

ساحر اور شورش ہمہ تن گوش ہو گئے اور اختر نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا: ''س' اور 'ش' سے ----'س' یعنی 'سگریٹ' اور 'ش' یعنی 'شراب'' اور پھر دوسرے ہی لمحے اپنے عقیدت مندوں کی طرف نظر ڈالتے ہوئے بولے:

''اور صرف یہی نہیں، 'س' یعنی 'ساحر' اور 'ش' یعنی 'شورش' بھی۔''

لاہور کا ذکر ہے، ایک بار اختر شیرانی، جوش ملیح آبادی کے ساتھ میں موٹر میں بیٹھے مال روڈ سے گزر رہے تھے، حرماں نصیب، حرماں خیر آبادی بھی ساتھ تھے کہ اختر شیرانی نے فٹ پاتھ اور سواریوں سے گزرتی ہوئی عورتوں کو دیکھ دیکھ کر ''ہائے مار ڈالا'' کے نعرے لگانا شروع کر دیئے۔ ہر شخص انہیں عجیب نگاہوں سے دیکھنے لگے، جوش نے موٹر رُکوائی اور بھاگ کھڑے ہوئے۔

ساغر نظامی

ولادت: ۲۱ دسمبر ۱۹۰۵ء (علی گڑھ، یوپی)

وفات: ۲۷ فروری ۱۹۸۳ء (نئی دہلی)

مشہور شاعر ساغر نظامی نے کسی مشاعرے میں ایک خاتوں کو دیکھا اور حسبِ عادت ہزار جان سے اس پر مائل ہو گئے۔ مشاعرے کے بعد موصوف اس خاتون کے پاس پہنچے اور کہنے لگے۔

''اے دشمنِ ایمان و آگہی! کیا تم یہ گوارا کرو گی کہ میرے دل کے مرتعش جذبات تمہارے پاکیزہ عطر بیز تنفس کی آمد شد سے ہم آہنگ ہو سکیں۔''

بے چاری حسینہ اس اندازِ بیان کو بالکل نہ سمجھ سکی اور حیرت سے بولی۔

''آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

اب باکمال شاعر نے حقیقت پسندانہ اندازِ بیاں میں کہا۔

''میں چاہتا ہوں، تم مجھ سے شادی کرلو اور میرے بچوں کی ماں بننا گوارا کرو۔''

حسینہ نے چند لمحے سوچا اور حیرت کے ساتھ دریافت کیا۔ ''کتنے بچے ہیں تمہارے؟''

ساغر نظامی کی بہن بھی شاعرہ تھیں اور مینا تخلص رکھتی تھیں۔ ماجد حیدر آبادی سے چونکہ ساغر صاحب کی چشمکیں چلتی رہتی تھیں، اس لئے ساغر صاحب مشاعرے میں اس شرط پر جاتے تھے کہ ماجد صاحب کو نہیں بلایا جائے گا۔ ایک مشاعرے میں صدارت ساغر نظامی کی تھی۔ چونکہ ماجد صاحب مدعو نہیں تھے اس لئے وہ مشاعرہ سننے کے لئے سامعین میں آ کر بیٹھ گئے۔ لوگوں کو جب پتہ چلا تو سب نے شور مچا دیا کہ ماجد صاحب کو ضرور سنیں گے اور مجبوراً منتظمین کو ماجد صاحب کو دعوتِ سخن دینی پڑی۔ ماجد صاحب مائک پر آئے تو کہنے لگے کہ چونکہ مجھے مدعو نہیں کیا گیا تھا اس لئے کوئی غزل ساتھ نہیں ہے، البتہ دو شعر فی البدیہہ کہے ہیں، جنابِ صدر اجازت دیں تو پیش کروں۔ اجازت ملنے پر یہ دو شعر سنائے:

پھر آ گیا ہے لوگو برسات کا مہینا
لازم ہوا ہے اب تو سب کو شراب پینا
پہنچا جو میکدے میں حیران رہ گیا میں
الٹا پڑا تھا ساغر اوندھی پڑی تھی مینا

ایک مشاعرے کے اختتام پر جب ساغر نظامی کو اصل طے شدہ معاوضے سے کم رقم دی گئی اور اس کی رسید اس کے سامنے کی گئی تو وہ اسے دیکھتے ہی ایک دم پھٹ پڑے۔
"میں اس رسید پر دستخط نہیں کر سکتا۔"
اتنے میں مجاز وہاں آئے، انھوں نے یہ سُنا تو سادگی سے منتظم کو مشورہ دینے لگے:
"اگر دستخط نہیں کر سکتے تو ساغر صاحب سے انگوٹھا ہی لگوا لیجیے۔"

جوش صاحب بمبئی کے ایک نہایت اعلیٰ ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے، آفتاب غروب ہونے میں پانچ دس منٹ باقی تھے، مجاز ان کے پہلو میں پینے کے لیے بے چین بیٹھا

تھا کہ ساغر آ گئے۔ اتنے میں آسمان پر شفق پھول گئی، سامنے کا سمندر گلابی ہو گیا مُلائم ہوا سنکنے لگی اور دَور شروع ہو گیا۔ جب نشہ گھنگھور ہونے کے قریب آیا، مجاز اُٹھا، ساغر کے گلے میں بانہیں ڈال دیں، ساغر بھی اُس سے چمٹ گئے۔

اُس عالم میں مجاز نے کہا:

''سغروا (ساغر) مجھے تجھ سے بے حد محبت ہے، تُو میرا بڑا پیارا دوست ہے۔''

ساغر نے کہا:

''مجزوا (مجاز) مجھے بھی تجھ سے بے حد محبت ہے، تیرا سا دوست ملے گا کہاں؟''

یہ سن کر، مجاز اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا:

''پیارے ساغر! اس میں کوئی شک نہیں کہ میں تجھ کو بے حد چاہتا ہوں، لیکن پیارے یہ اور بات ہے کہ میں تجھ کو شاعر تسلیم نہیں کرتا۔''

یہ سنتے ہی ساغر نے رونا شروع کر دیا۔ ساغر کو روتا دیکھ کر، وہ اپنی جگہ سے اُٹھا، ساغر کی گردن میں پھر بانہیں ڈال دیں اور کہا:

''ساغر تیرا کوئی جواب نہیں۔''

ساغر خوش ہو گیا۔ رونا بند ہو گیا اور مجاز پھر اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا اور تھوڑی دیر میں اُس نے جوش سے کہا:

''جوش صاحب! میں ساغر پر اپنی جان تک نچھاور کر سکتا ہوں۔''

ساغر، اُس سے، دوڑ کر لپٹ گئے، ابھی وہ لپٹے ہوئے ہی تھے کہ مجاز نے کہا:

''مگر یہ اور بات ہے ساغر کہ میں تجھ کو شاعر نہیں سمجھتا۔''

ساغر نے پھر رونا شروع کر دیا اور ہنستے ہنستے جوش اور مجاز کا بُرا حال ہو گیا۔

مخدوم محی الدین

ولادت: فروری ۱۹۰۸ء (سنگاریڈی، اے۔ پی)

وفات: اگست ۱۹۶۹ء (دلّی)

حیدرآباد ڈیکمیٹ میں دارالاقامہ کی نئی عمارتیں تعمیر ہو چکی تھیں۔ صاحیب کا دفتر اونچی ٹیکڑی پر تعمیر شدہ بی ہاسٹل کی شان دار عمارت کی اوپری منزل میں تھا۔ شام کا وقت تھا۔ مخدوم بھی کسی کام سے صاحیب کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ کام کی باتیں ختم ہوئیں۔ وہ اٹھنے لگے تو صاحیب کی نظر دریچے سے باہر آسمان پر ڈوبتے سورج کی روپہلی اور سنہری کرنوں پر پڑی۔ انھوں نے سب سے اور بالخصوص مخدوم سے کہا: ''ذرا ٹھہرنا، ابھی جب سورج پوری طرح غروب ہو جائے گا تو افق پر غروب آفتاب ایک بڑا ہی دل کش مرقع پیش کرے گا۔ حکم حاکم سمجھ کر سب ٹھہرنا ہی چاہتے تھے کہ مخدوم نے نہایت معصومانہ اور برجستہ انداز میں کہا کہ صاحب، ہم ذرا جلدی میں ہیں لیکن اس غروب آفتاب کے خوب صورت منظر کو دیکھنے کل صبح ضرور حاضر ہو جائیں گے۔ یہ کہا اور ہم سب کو ہکا بکا چھوڑ کر رفو چکر ہو گئے۔ بڑی دیر کے بعد صبح کے وقت غروبِ آفتاب کی نظارہ بازی سمجھ میں آئی اور پھر قہقہوں کا طوفان پھٹ پڑا۔

مخدوم نہ صرف ایک اعلیٰ پایہ کے شاعر، خطیب، انسان دوست اور سیاسی رہنما تھے۔ بلکہ کسی قدر بلانوش بھی تھے۔ ان کی ایک کمزوری یہ تھی کہ جب وہ کوئی تازہ نظم یا غزل کہتے وہ اسے کسی نہ کسی کو ضرور سنانا چاہتے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ انھوں نے ایک نظم کہی، کئی جگہ گئے مگر اسے سنانے کو انھیں کوئی بھی سامع نہیں ملا۔ آخر ایک شراب خانے آئے اور بیرے سے بولے: ''دو پیگ لاؤ۔'' بیرا جب دو پیگ لے آیا تو بولے: ''ایک تم اور ایک میں، گھبراؤ مت، یہ پیسے لو۔ بیٹھو میری غزل سنو۔''

کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ

ولادت: ۱۹۰۹ء (منٹگمری، موجودہ 'ساہیوال')

وفات: ۱۷؍جولائی ۱۹۹۲ء (دہلی)

کنور مہندر سنگھ بیدی سکھ مذہب سے تعلق رکھتے تھے جن کے مذہب میں بال کٹوانے یا سگریٹ حقہ وغیرہ پینے کی پابندی ہے یا یوں سمجھئے ان کے مذہب میں حرام ہے۔ ایک مشاعرے میں اپنی نعت سنانے سے قبل انہوں نے کہا کہ میں اردو زبان سے محبت کرتا ہوں باوجود اس کے کہ اس زبان میں کچھ محاورے ایسے ہیں کہ جنہیں اگر میں استعمال کروں تو سکھ مذہب کے مطابق کفر کا فتویٰ لگ جائے۔ مثال کے طور پر میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ کل فلاں جگہ میری حجامت بن گئی۔ یا یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑ گئے۔ یا یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ مجھ سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہوئی کہ برادری نے میرا حقہ پانی بند کر دیا۔ بیدی صاحب کے ہر جملے پر ایک قہقہہ گونج رہا تھا۔

تقسیم ملک کے بعد ہندوستانی حکومت نے شراب کے آزادانہ استعمال پر پابندی لگا کر اسے لائسنس سے مشروط کر دیا۔ اس پابندی کے باعث کئی دانشور اور شاعر پریشان ہو گئے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی نے جب ایک شاعر سے حال احوال پوچھا تو انہوں نے اپنی بدحالی کا اظہار شعر زبان میں یوں کیا:

کس قدر دشوار جینا ہو گیا
لکھنو، مکہ مدینہ ہو گیا

بیدی نے داد دی اور شاعر کے لیے دو لائسنس کے ساتھ چند بوتلوں کا بندوبست بھی کر دیا۔

جوش ملیح آبادی نے پنجابی زبان کے اکھڑ پن سے زچ ہو کر کنور مہندر سنگھ بیدی سے کہا: ''کنور صاحب! کیا آپ جانتے ہیں کہ دوزخ کی سرکاری زبان یہی آپ کی پنجابی ہوگی۔'' کنور صاحب نے برجستہ جواب دیا: ''تو پھر جوش صاحب! آپ کو ضرور سیکھ لینی چاہیے۔''

کسی مشاعرہ میں کوثر قریشی اپنی غزل کا یہ شعر پڑھ رہے تھے:

شرکتِ انجمن ناز ضروری ہے -- مگر
ہم پسِ سایہ دیوار بہت اچھے ہیں

کنور مہندر سنگھ بیدی نے یہ شعر سنا تو کہنے لگے: ''بہت اچھی بات ہے کوثر صاحب! یہ خیال رکھیے گا کہ وہ دیوار کہیں نئی دہلی کے ٹھیکے داروں کی بنائی ہوئی نہ ہو، کیونکہ ایسی دیواریں بالعموم چار مہینے کے بعد گر جاتی ہیں۔''

دہلی میں پیروڈی شاعری کا مشاعرہ تھا۔ جب گلزار زتشی کا نام صدارت کے لیے پیش کیا گیا تو وہ انکسار سے بولے:

حضور! میں صدارت کا اہل کہاں ہوں؟

اس پر کنور مہندر سنگھ نے فرمایا:

''مطمئن رہیں، آپ بھی صدر کی پیروڈی ہی ہیں۔''

کنور مہندر سنگھ بیدی جن دنوں دہلی کے مجسٹریٹ تھے، ان کی عدالت میں چوری کے جرم میں گرفتار کئے گئے ایک نوجوان کو پیش کیا گیا۔

کنور صاحب نے نوجوان کی شکل دیکھتے ہوئے کہا: ''میں ملزم کو ذاتی طور پر جانتا ہوں، ہتھکڑیاں کھول دو، یہ بیچارہ تو ایک شاعر ہے، شعر چرانے کے علاوہ کوئی اور چوری کرنا اس کے بس کا روگ نہیں۔''

ایک مشاعرے کی نظامت کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کر رہے تھے۔ جب فنا نظامی کی باری آئی تو مہندر سنگھ نے کہا کہ حضرات اب میں ملک کے چوٹی کے شاعر حضرت فنا نظامی کو زحمتِ کلام دے رہا ہوں۔ فنا صاحب مائیک پر آئے، سحر کی پگڑی کی طرف مسکرا کر دیکھا اور اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگے: ''حضور چوٹی کے شاعر تو آپ ہیں میں تو ڈاڑھی کا شاعر ہوں۔''

ایک مشاعرے میں نریش کمار شاد نے اپنی باری پر جب حسب ذیل قطعہ پڑھا:

جو بھی عورت ہے ساز ہستی کا
بیش قیمت سا اک ترانہ ہے
ایک ہیرا ہے، خوبرو ہو اگر
نیک خو ہو، تو اک خزانہ ہے

تو بیدیؔ صاحب نے فرمایا کہ ''یہ وہ خزانہ ہے جو گھر والوں کو اکثر دیوالیہ بنا دیا کرتا ہے۔''

موتی جھیل کان پور کے مشاعرے سے بہت شان دار ہوتے ہیں۔ جتنی تعداد سامعین کی ان مشاعروں میں ہوتی ہے، کہیں اور نہ دیکھی۔ بیدی صاحب اس مشاعرے کی

نظامت فرما رہے تھے۔ ایک بار راز الہ آبادی بھی اس مشاعرے میں شریک ہوئے۔ ٹی۔وی والے مشاعرہ کو ٹیلی وائز کر رہے تھے۔ بیدیؔ صاحب نے رازؔ صاحب کو دعوتِ کلام دی۔ وہ مائیک پر تشریف لائے۔ رازؔ صاحب کا رنگ گورا نہیں تھا اور اس پر گھنی داڑھی سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے۔ اس وقت ٹی۔وی والے ان کی بائیں جانب کھڑے تھے۔ جونہی رازؔ صاحب نے مطلع فرمایا۔ ٹی۔وی والوں نے ان کے رخ پر روشنی ڈالی اور ٹیلی وائز کرنا شروع کر دیا۔ بائیں جانب کے سامعین نے داد دی۔ جو محض اتفاق کی بات تھی لیکن رازؔ صاحب فرمانے لگے کہ صرف بائیں جانب سے داد ملی ہے۔ بیدیؔ صاحب نے گزارش کی کہ حضور ٹی۔وی والوں کی روشنی بھی تو آپ کے بائیں ہی کلۂ مبارک پر پڑی تھی۔

دہلی کے ایک نظم گو شاعر زلف کی تعریف میں ایک اچھی خاصی طویل نظم سنا رہے تھے۔ جب نظم سے لوگ اُکتا گئے تو کنور مہندر سنگھ بیدی نے کہا قبلہ یہ زلف بھی کیا زلف ہے کہ اس کی تعریف میں آپ اتنی لمبی نظم سنا رہے ہیں۔ تو وہ فوراً بولے:

''کنور صاحب میں اپنے محبوب کی زلف کی تعریف کر رہا ہوں آپ کی زلف کی نہیں۔''

گوپی ناتھ امنؔ کے فرزند کی شادی تھی انھوں نے دہلی کے دوست شعرا کو بھی مدعو کیا جن میں کنور مہندر سنگھ بیدی بھی شریک تھے۔ ہر شاعر نے سہرا یا دعائیہ قطعہ یا رباعی سنائی۔ امنؔ صاحب نے بیدی صاحب سے درخواست کی کہ آپ بھی کچھ ارشاد فرمائیے۔ تو بیدی صاحب نے یہ شعر فی البدیہہ کہہ کر پیش کر دیا:

جناب امنؔ کے لختِ جگر کی شادی ہے
مگر غریب کو کس جرم کی سزا دی ہے

چیمسفورڈ کلب دہلی کے ایک مشاعرے میں جس کی نظامت کنور مہندر سنگھ بیدی کر رہے تھے، انھوں نے جناب عرش ملیسانی سے کلام سنانے کی گزارش کی۔ جب عرش صاحب مائیک کی طرف جانے لگے تو بیدیؔ صاحب نے فرمایا:

عرش کو فرش پر بٹھاتا ہوں
معجزہ آپ کو دکھاتا ہوں

اور اسی طرح دوسرے شاعر کو بلانے سے پہلے فرمانے لگے کہ ایک محاورہ ہے۔ ''برعکس نہند نامِ زنگی کافور'' کیا ستم ظریفی ہے کہ اب میں آپ کے سامنے ایک ایسے شاعر کو پیش کر رہا ہوں جو ہر طرح سے گھرا ہوا ہے اور قافیہ ردیف کا بھی پابند ہے اس پر ستم یہ کہ سرکاری ملازم بھی ہے اور تخلص ہے'' آزاد'' اس پر جگن ناتھ آزاد اٹھ کر مائیک پر تشریف لے آئے۔

ایک دراز ریش مولانا وضع کے شاعر کسی مشاعرے میں کہہ رہے تھے۔ ''جوش ایسے ملحد اور بے دین اور بے اصول آدمی کا ہندوستان سے پاکستان چلے جانا ہی بہتر تھا۔ خس کم جہاں پاک.................!''

کسی دوسرے شاعر نے مولانا کو ٹوکتے ہوئے کہا: ''جوش صاحب کے مستقل طور پر پاکستان چلے جانے سے تو یہاں خس کی کمی واقع ہوگئی، لیکن مولانا اگر آپ پاکستان ہجرت فرما جائیں تو ہندوستان میں کیا چیز کم ہو جائے گی؟'' ''خاشاک'' کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ نے دونوں کی گفتگو کو سن کر نہایت برجستگی سے کہا۔

جناب کنور مہندر سنگھ بیدیؔ کے مکان پر ان کے تلامذہ جمع تھے۔ بیدی صاحب ان کا تعارف یوں کرا رہے تھے۔ یہ رعنا سحری ہیں، یہ انجم سحری، یہ واجد سحری۔ فنا نظامی بھی موجود تھے، کہنے لگے اور میں چراغِ سحری ہوں۔''

۱۹۷۵ء کے ایک آل انڈیا مشاعرے میں ایک نوجوان شاعرہ نے اپنے حسن اور ترنم کے طفیل شرکت کا موقع حاصل کر لیا تھا۔ جب موصوفہ نے غزل پڑھی تو سارے سامعین جھوم اٹھے۔ غزل بھی اچھی تھی۔ لیکن نادانستگی میں اس شاعرہ زیر زبر اور پیش کی کئی غلطیاں سرزد ہوئیں تو کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ تاڑ گئے کہ غزل کسی اور کی ہے۔ غزل سنانے کے بعد جب موصوفہ اپنی نشست پر واپس آ کر جلوہ گر ہوئیں تو ایک مداح شاعر نے اس سے کہا: ''محترمہ آپ کے کلام نے واقعی مشاعرہ لوٹ لیا۔'' اس پر سحر صاحب خاموش نہ رہ سکے۔ برجستہ تصحیح فرمائی: ''یوں کہیے برخوردار کہ محترمہ نے مشاعرہ لوٹ لیا، بیچاری غزل پر تو الزام نہ لگائیے..........!''

یہ سن کر مداح اور شاعرہ دونوں زبردستی کی ہنسی ہنس کر چپ بیٹھ گئے۔

ایک مختصر سی نشست میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اپنا کلام سنا رہے تھے۔ انہوں نے ایک غزل پڑھی جس کے قافیے میں ''سود و زیاں'' آیا تھا۔ شعر اچھا تھا، مگر شنکر پرشاد نے فرمایا: ''یہ آپ نے سکھ ہوتے ہوئے بنیے والا قافیہ کیسے باندھ دیا؟''

دہلی کے ایک مشاعرے میں کنور مہندر سنگھ بیدی نے شعرا کو ڈائس پر بلایا تو ترتیب ایسی رکھی کہ شاعرات ان کے قریب رہیں۔ مشاعرے کے بعد خلیق انجم، بیدی

صاحب سے کہنے لگے کہ آپ جب کسی شاعرہ کو داد دیتے ہیں تو آپ کا ہاتھ لہرانے کے بجائے اس کی پیٹھ پر زیادہ دیر تک سرکتا رہتا ہے۔

بیدی صاحب نے فوراً جواب دیا:

''داد دینے کا یہی انداز تو داد طلب ہے۔''

3

کئی مرتبہ دہلی میں پینے پر روک رہتی تھی، ایسی صورت میں یہ لوگ پاس کے ایک علاقے گڑگاؤں (ہریانہ) میں طلبِ رندانہ کی تکمیل کے لیے چلے جایا کرتے تھے۔ ایک بار پنجاب اور ہریانہ کے گورنر سی۔ پی۔ این۔ سنگھ نے جوشؔ صاحب کو سونی پت میں دعوت کے لیے پیغام بھیجا۔ جوشؔ صاحب اور ہم سب لوگ خوش تھے کہ مہمان نوازی کا لطف اُٹھائیں گے۔ وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ گورنر کے گھر پر نشہ بندی ہے۔ جب گورنر نے جوشؔ صاحب سے کچھ سنانے کی درخواست کی تو جوشؔ اپنا سا منہ لیے خاموش رہے اور کچھ بھی سنانے کے موڈ میں نظر نہیں آرہے تھے۔ بیدیؔ نے موقع کی نزاکت کو سمجھا اور گورنر سے کچھ وقت کی اجازت لے کر پاس ہی میں اپنے کسی دوست کے گھر جوشؔ کو لے گئے۔ وہاں طبیعت پُرجوش کرنے کے بعد، گورنر صاحب کی محفل میں جوشؔ نے چار چاند لگا دیے۔ گورنر صاحب سے رہا نہ گیا اور بیدی سے پوچھ لیا کہ ایسا انہوں نے کیا کیا کہ جوشؔ صاحب چہکنے لگ گئے۔ بیدیؔ نے جواب دیا، ''جناب...... نسخہ پرانا ہے اور ترکیبِ استعمال نئی۔''

عبدالحمید عدم

ولادت: ۱۰ اَپریل ۱۹۱۰ء (تلونڈی موسیٰ، ضلع گوجرانوالہ)

وفات: ۱۰/مارچ ۱۹۸۱ء (لاہور)

مشہورِ زمانہ شاعر عبدالحمید عدم اور پنڈت ہری چند اختر، سال ہا سال کے بعد ایک مشاعرے میں اکٹھے ہوئے تو پنڈت ہری چند اختر، عدم کو پہچان نہ سکے، کیونکہ وہ کبھی خاصے سِلم، سمارٹ رہے تھے اور اب بہت فربہ اندام ہو چکے تھے۔ عدم صاحب یہ جان کر کہ ہری چند اختر اُن کو پہچان نہیں سکے، اُن سے خود مخاطب ہوئے:

"پنڈت جی! مجھے پہچانا؟ مَیں عدم ہوں!"

پنڈت ہری چند اختر کے مُنہ سے بے ساختہ یہ مصرعہ نکلا:

"اگر تم عدم ہو تو موجود کیا ہے؟"

شاعر شراب و شباب الطاف مشہدی، ظہیر کاشمیری، خیال امروہوی اور قمر صدیقی عبدالحمید عدم کے ہم پیالہ و ہم نوالہ رہے۔ ایک مدت تک اُن کی شام کی محفلِ طرب لاہور میں حکیم یعسوب الحسن کے میکدے میں جمتی رہی۔

حکیم یعسوب الحسن ماہنامہ "خضرِ راہ" نکالتے تھے۔ یہ حکیم یوسف حسن مدیر "نیرنگِ خیال" کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کا دفتر فلیمنگ روڈ پر تھا۔ مَیں اُن دنوں اسلامیہ

کالج ریلوے روڈ لاہور کا طالب علم تھا اور کالج کی واحد ادبی بزم" بزم عروجِ ادب" کا جنرل سیکرٹری بھی تھا۔ اسی ناتے سے 1962ء میں پہلی بار ایک شام میں حضرتِ عدم کی تلاش میں دفتر "خفرِراہ" جا پہنچا۔ مُدعا "بزمِ عروجِ ادب" کے ہفتہ وار ادبی، تنقیدی اجلاس سے ہٹ کر "ایک شام، عدم کے نام" کا اہتمام تھا۔

"دفترِ خفرِراہ" میں عبدالحمید عدم میرِ محفل بنے ہوئے تھے.... ظہیر کاشمیری، خیال امروہوی اور قمر صدیقی ایک بڑا سا پیالہ یا "جامِ سفال" جامِ جم کی صورت میں سامنے رکھے حکیم یعسوب الحسن کی میزبانی سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور زبان حال سے کہہ رہے کہ:

جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

ظہیر کاشمیری نے تواضع کے لیے میری طرف بھی جام بڑھایا تو عدم صاحب نے فوراً اُن کا ہاتھ وہیں تھام لیا اور حکیم یعسوب الحسن سے کہا: "ملازم کو بلواؤ، وہ ہمارے اِس نوجوان طالب علم مہمان کے لیے بازار سے تازہ انگور لے کر آئے۔"

انگوروں کا موسم تھا، چشم زدن میں عدم صاحب کے ارشاد کی تعمیل ہوئی، کیونکہ اُنھوں نے ہی رقم اپنی جیبِ خاص سے فراہم کی تھی۔ انگور آئے تو ظہیر کاشمیری نے جملہ چُست کیا: "عدم صاحب! پھر بھی آپ نے نوجوان کی تواضع "دُخت رز" (انگور کی بیٹی) سے نہیں تو انگور سے ہی کی ناں؟"

عبدالحمید عدم نے اپنے ایک ملاقاتی سے پوچھا:

"حضور کیا آپ بھی ادب سے شوق رکھتے ہیں۔"

ملاقاتی ایک مال دار تاجر تھا، بولا:

"کبھی کبھار کوئی کتاب پڑھ لیتا ہوں، یوں میرا ادب سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔"

عدم نے بڑی معصومیت سے کہا:

"تو گویا آپ بے ادب ہوئے؟"

عبدالحمید عدم کو کسی صاحب نے ایک بار جوش سے ملایا اور کہا: ''آپ عدم ہیں۔'' عدم کافی تن و توش کے آدمی تھے۔ جوش نے ان کے ڈیل ڈول کو بغور دیکھا اور کہنے لگے: ''عدم یہ ہے تو وجود کیا ہوگا؟''

شاید مجھے نکال کے پچھتا رہے ہوں آپ
محفل میں اس خیال سے پھر آ گیا ہوں میں

یہ شعر عبدالحمید عدم کا ہے اور اس کی پیروڈی ناصر کاظمی نے کی تھی:

شاید مجھے نکال کے کچھ کھا رہے ہوں آپ
محفل میں اس خیال سے پھر آ گیا ہوں میں

اِس کے جواب میں عدم نے ناصر کی زمین میں یہ رباعی کہی تھی:

کوا کیوں کائیں کائیں کرتا ہے
طوطا کیوں ٹائیں ٹائیں کرتا ہے
شعر ہوتے ہیں میرؔ کے ناصر
لفظ کُچھ دائیں بائیں کرتا ہے

کنہیالال کپور

ولادت: ۲۷ جون ۱۹۱۰ء (لائل پور)

وفات: مئی ۱۹۸۰ء (پونہ)

انتظار حسین نے اپنی کتاب میں ایک دو جگہ مظفر علی سید کا بھی ذکر کیا ہے۔ کنہیا لال کپور سے انتظار حسین نے کہا:

''کپور صاحب! آپ اپنے دوست مظفر علی سید پر کام کر رہے ہیں۔''

کپور صاحب نے جواب دیا:

''ہاں سید صاحب کا خط آیا تھا۔ میں نے انہیں لکھ بھیجا ہے کہ یہاں ایک سکھ مجھ پر کام کرنے کے درپے تھا، مگر ایک سکھ کے ہاتھوں جھٹکا ہونے کے مقابلے میں مجھے ایک سید کی چھری سے ذبح ہونا منظور ہے۔''

ایک انگریز خاتون جو خاصا ادبی ذوق رکھتی تھیں، کنہیا لال کپور سے متعارف ہوئیں، تو اُن کے نحیف و نزار جسم کو دیکھ کر کہنے لگیں: ''کپور صاحب! آپ سُوئی کی طرح پتلے ہیں۔'' کپوؔر نے مسکراتے ہوئے نہایت انکساری سے کہا: ''آپ کو غلط فہمی ہوئی محترمہ! بعض سُوئیاں مجھ سے بھی موٹی ہوتی ہیں۔''

کلکتے کے ایک بنگالی پروفیسر سے کنہیالال کپور کا تعارف کرایا گیا تو اس نے کپور صاحب کے دُبلے پتلے جسم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''آپ پنجابی ہرگز معلوم نہیں ہوتے۔'' ''آپ بجا فرماتے ہیں۔'' کپور نے جواب دیا۔ ''پنجابی کے بجائے بنگالی نظر آتا ہوں۔'' ''نہیں صاحب بنگالی سے بھی بدتر۔'' 'معاف کیجیے گا، بنگالی سے تو شاید ہی کوئی بدتر ہوگا۔''

کنہیالال کپور ایک بار کسی ادبی اور معیاری قسم کے اردو ماہنامہ کے ایڈیٹر سے ملنے کے لیے اس کے دفتر میں تشریف لے گئے۔ باتوں باتوں میں ان ایڈیٹر دوست سے دریافت کیا۔ ''آپ کا پرچہ ہر ماہ کتنی تعداد میں شائع ہوتا ہے۔'' ''گیارہ سو.........'' ''گیارہ سو؟.......... وہ کیوں؟..................'' کپور نے حیران ہوکر پوچھا۔ ''ایک ہزار مارکیٹ میں فروخت کرنے کے لیے اور ایک سو اعزازی طور پر ادیبوں کو مفت بھیجنے کے لیے۔'' کپور نے انتہائی سنجیدگی سے مشورہ دیا۔ ''تو جناب آپ ایک سو پرچہ ہی شائع کیا کیجیے۔''

کنہیالال کپور نے کسی شخص پر خفا ہوتے ہوئے کہا: ''میں تو آپ کو شریف آدمی سمجھا تھا۔'' ''میں بھی آپ کو شریف آدمی ہی سمجھا تھا۔'' اس شخص نے بھی برہمی میں بلا سوچے سمجھے کہہ دیا۔ ''تو آپ ٹھیک سمجھے، غلط فہمی مجھ کو ہوئی۔'' کپورؔ نے نہایت سنجیدگی اور کمال عجز سے اعتراف کرلیا۔
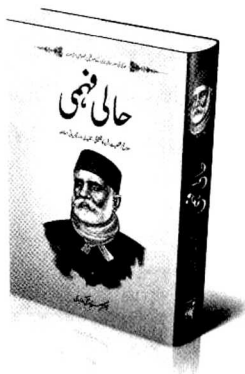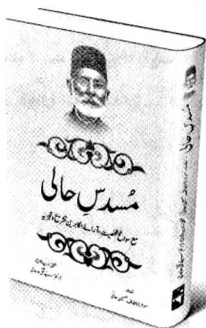
فیض احمد فیض

ولادت: ۱۳؍فروری ۱۹۱۱ء (سیالکوٹ، پاکستان)

وفات: ۲۰؍نومبر ۱۹۸۴ء (لاہور، پاکستان)

فیض صاحب آغا ناصر کے گھر رات کے کھانے پر آئے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ پی ٹی وی میں نئے نئے مقرر کردہ چیئرمین ہارون بخاری موجود تھے، جو پطرس صاحب کے بیٹے اور زیڈ اے بخاری کے بھتیجے تھے۔ اسی حوالے سے بات ان دونوں بزرگوں، یعنی بخاری برادران پر چل نکلی۔ فیض صاحب بخاری برادران کی باتیں کرتے رہے۔ پطرس بخاری کی دانش وری اور طنز و مزاح والی تحریریں اور زیڈ اے بخاری کی اداکاری اور لطیفہ گوئی خاص موضوع تھا۔

چوں کہ لطیفوں کی بات ہو رہی تھی تو ہارون بخاری صاحب نے کہا:

''میں بھی ایک لطیفہ سناؤں گا۔''

شاید اس طرح وہ اپنے باپ اور چچا سے اپنی حس مزاح اور فن کارانہ صلاحیتوں کے رشتے استوار کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہارون بخاری نے جو لطیفہ سنایا وہ کچھ اس طرح تھا:

''کسی جنگل میں ہاتھی سیر کے لیے نکلا۔ سامنے سے ایک چوہا آ رہا تھا۔ چوہے نے اس سے پہلے کبھی ہاتھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس عظیم الجثہ مخلوق کو دیکھ کر بڑا حیران ہوا اور اس سے پوچھا: ''تُو کون ہے؟''

ہاتھی نے جواب دیا: ''میں ہاتھی ہوں۔''

چوہے نے پھر سوال کیا: ''تُو کہاں رہتا ہے۔''

ہاتھی نے کہا: ''اسی جنگل میں۔''

چوہے کی حیرت کم نہیں ہو رہی تھی۔ آخرکار ڈرتے ڈرتے اس نے سب سے اہم

سوال کر ڈالا: ''تیری عمر کیا ہے؟''

ہاتھی نے جواب دیا: ''تین سال''

چوہا جواب سن کر دم دبا کر چپ چاپ ایک طرف کو چل دیا۔ تب ہاتھی نے اسے روکا اور اس سے اس کا نام، اس کی رہائش وغیرہ کے بارے میں پوچھنے کے بعد آخری سوال کیا: ''اور تیری عمر کیا ہے؟''

چوہے نے گردن جھکا لی، اور بولا:

''عمر تو میری بھی تین سال ہی ہے مگر ذرا صحت کم زور ہے۔''

لطیفہ ختم ہوا، مگر کچھ اس انداز سے سنایا گیا تھا کہ کوئی نہیں ہنسا۔ تب فیض صاحب کی آنکھوں میں شرارت آمیز چمک آئی اور ہارون بخاری کی طرف دیکھتے ہوئے بولے:

''بھئی، ہیں تو یہ بھی بخاری، پر ذرا صحت کم زور ہے۔''

ایک دن فیض صاحب مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر عبد الرحمٰن چغتائی صاحب کے ہاں لے جا رہے تھے۔ نسبت روڈ سے گزرے تو انہیں سڑک کے کنارے ''قاسمی پریس'' کا ایک بڑا سا بورڈ دکھائی دیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ کن صاحب کا پریس تھا مگر بہر حال قاسمی پریس کا بورڈ تھا۔ فیض صاحب کہنے لگے ''آپ چپکے چپکے اتنا بڑا کاروبار چلا رہے ہیں۔'' اس پر ہم دونوں ہنسے۔

تھوڑا آگے گئے تو میو اسپتال کے قریب مجھے ایک بورڈ نظر آیا۔ میں نے کہا ''فیض صاحب، کاروبار تو آپ نے بھی خوب پھیلا رکھا ہے، وہ بورڈ دیکھیے۔''

بورڈ پر ''فیض ہیئر کٹنگ سیلون'' کے الفاظ درج تھے۔

فیض صاحب اتنا ہنسے کہ انہیں کار سڑک کے ایک طرف روک لینا پڑی۔

سیف الدین سیف بیان کرتے ہیں:

ایک بار کوئی صاحب آئے اور فیض کو اپنا کلام سنانے لگے۔ انہوں نے اپنی ایک نظم سنائی جس میں ہر تیسرا چوتھا مصرع فیض صاحب ہی کا تھا۔ فیض صاحب انہیں مسلسل داد دیتے رہے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے کہا: ''فیض صاحب! یہ کیا قصہ ہے؟ آدھا کلام تو آپ کا تھا اور آپ واہ واہ کیے جا رہے تھے۔''

فیض صاحب مسکرا کر کہنے لگے: ''بھئی کیا کرتا، پہلی بار تو اپنے شعروں پر داد دینے کا موقع ہاتھ آیا تھا۔''

مجاز نے اپنے مجموعے کے دوسرے ایڈیشن کے لیے فیضؔ سے دیباچہ منگوایا تھا۔ جس کے آنے میں دیر ہوئی اور مجموعہ چھپنے کے لیے پریس جانے لگا تو مجاز نے اس طرح انتساب کیا:

''فیض کے دیباچے کے نام''

مقبوضہ کشمیر کے وزیر اعلیٰ نے ٹیلی فون پر انہیں دعوت دی کہ اس بار آپ اور ایلس کی ہندوستان میں موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم آپ کو سرینگر بلانا چاہتے ہیں، جہاں آپ اپنی شادی کی سالگرہ منائیں اور پرانی یادوں کو تازہ کریں۔

فیض صاحب مسکرائے اور اپنے مخصوص انداز میں بولے:

''بھئی یہ تو ٹھیک ہے مگر ہم وہاں آ کیسے سکتے ہیں؟ ہم تو کشمیر میں آپ کی حکومت کو مانتے ہی نہیں ہیں۔''

آغا ناصر کو فیض احمد فیض نے فون کیا۔ فون ان کے بیٹے نے اُٹھایا جس کی عمران دونوں دس بارہ برس ہوگی۔ اس نے ریسیور ہاتھ میں پکڑے زور سے آواز لگائی: ''ابی! فیض انکل فیض کا فون ہے۔''

جب آغا ناصر نے ریسیور ہاتھ میں لیا تو دوسری جانب فیض صاحب بے تحاشا ہنس رہے تھے کہ بھئی یہ ''فیض انکل فیض'' تو کمال کی اصطلاح ہے۔

ایک بار فیض احمد فیض صاحب سے کسی نوجوان کامریڈ نے بہت مضطرب ہو کر پوچھا: ''فیض صاحب! آخر انقلاب کب آئے گا؟''

فیض صاحب مسکرائے اور اپنے مخصوص انداز میں بڑے اطمینان سے جواب دیا:
''بھئی آ جائے گا۔ ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے۔''

زہرہ نگاہ کے ہاں دعوت ختم ہوئی تو زہرہ نگاہ نے ساقی فاروقی سے درخواست کی کہ احمد فراز صاحب کو ان کی رہائش گاہ تک پہنچا دیں۔ ساقی نے جواب دیا:
''میں انہیں اپنی گاڑی میں نہیں بٹھا سکتا۔ کیونکہ جوں ہی کوئی خراب شاعر میری گاڑی میں بیٹھتا ہے، گاڑی کا ایک پہیہ ہلنے لگتا ہے۔''

اس پر فیض احمد فیض نے فقرہ کسا: ''ساقی تمہارے بیٹھنے سے تو تمہاری گاڑی کے دونوں پہیے مستقل ہلتے رہتے ہوں گے۔''

فیض احمد فیض نے اپنے ایک شاعر دوست سے کہا:
''یار تم نے میرے متعلق کبھی کچھ نہیں لکھا۔''

اس پر دوست نے جواب دیا: ''فیض صاحب! آپ کو تو معلوم ہے کہ آپ کے نام کا ایک ہی قافیہ ''حیض'' ہے اور وہ بھی کتنا غلیظ۔''

عالیہ امام صاحبہ کے ہاں فیض صاحب کی دعوت تھی۔ مہدی صاحب ساقی گری کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ شعروشاعری کا دور چل رہا تھا۔ عالیہ امام کے بہنوئی نے باہر گھر والوں پر برسنا شروع کر دیا۔

''عالیہ کا گھر اس قابل نہیں کہ کوئی شریف آدمی اس کے گھر میں رکھ سکے، سیّد زادی کہلاتی ہیں اور گھر پر جام سے جام ٹکرائے جا رہے ہیں......''

آوازیں سن کر عالیہ گھبرائیں۔ فیضؔ صاحب نہایت اطمینان سے عالیہ کے ساتھ باہر آئے، ان صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے:

''بھائی صاحب! ہم تو کبھی کسی عبادت میں مخل نہیں ہوتے۔ تو پھر آپ کیوں؟''

یہ جملہ سنتے ہی بھائی صاحب ہنس پڑے اور محفل میں شریک ہو کر فیضؔ صاحب کے کلام پر داد دینے لگے۔

ایک نوجوان لڑکی نے کہا: ''فیض صاحب! مجھ میں بڑا تکبر ہے اور میں انا کی بہت ماری ہوئی ہوں۔ جب صبح میں شیشہ دیکھتی ہوں تو میں سمجھتی ہوں کہ مجھ سے زیادہ خوبصورت اس دُنیا میں اور کوئی نہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے فیض صاب کو بڑی سینس آف ہیوم دی تھی۔

کہنے لگے: ''بی بی! یہ تکبر اور انا ہرگز نہیں، یہ غلط فہمی ہے۔''

اسرار الحق مجاز لکھنوی

ولادت: ۱۹/اکتوبر ۱۹۱۱ء (ردولی، ضلع بارہ بنکی، یوپی)

وفات: ۵/دسمبر ۱۹۵۵ء (لکھنؤ)

مجاز اپنی نیم دیوانگی کی حالت میں ایک بار کسی مجلس وعظ میں پہنچ گئے۔ ان کے کسی شناسا نے حیرت زدہ ہوکر پوچھا:

''حضرت مجاز! آپ اور یہاں؟''

''جی ہاں!'' مجاز نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

''آدمی کو بگڑتے کیا دیر لگتی ہے۔''

اسرار الحق مجاز کی زبان سے لطائف کی گلکاریاں ہوتی رہتی تھیں ان کا ایک لطیفہ جو صرف دولفظوں پر مشتمل ہے اس کی مثال ملنا مشکل ہے بمبئی کی ایک محفل میں شعراء کے علاوہ ایک مرواری سیٹھ بھی موجود تھے انہوں نے مجاز سے دریافت کیا ''مجاز صاحب آپ کا تخلص کیا ہے؟''

مجاز نے کہا: ''اسرار الحق'' اور محفل کو قہقہہ زار بنا دیا۔

رات کا وقت تھا۔ اسرار الحق مجاز کسی میخانے سے نکل کر یونیورسٹی روڈ پر ترنگ میں جھومتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ اسی اثنا میں اُدھر سے ایک تانگہ گزرا۔ مجاز نے اسے آواز دی، تانگہ رک گیا۔ مجاز اس کے قریب آئے اور لہرا کر بولے: جناب، صدر جاؤ گے؟ تانگے والے نے جواب دیا: ''ہاں، جاؤں گا''۔ ''اچھا تو جاؤ۔۔۔۔۔!'' یہ کہہ کر مجاز لڑھکتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

مجاز اور فراق کے درمیان کافی سنجیدگی سے گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک دم فراق کا لہجہ بدلا اور انہوں نے ہنستے ہوئے پوچھا:

''مجاز! تم نے کباب بیچنے کیوں بند کر دیے؟''

''آپ کے ہاں سے گوشت آنا جو بند ہو گیا۔'' مجاز نے اسی سنجیدگی سے فوراً جواب دیا۔

کسی مشاعرے میں مجاز اپنی غزل پڑھ رہے تھے۔ محفل پورے رنگ پر تھی اور سامعین خاموشی کے ساتھ کلام سن رہے تھے کہ اتنے میں کسی خاتون کی گود میں ان کا شیر خوار بچہ زور زور سے رونے لگا۔ مجاز نے اپنی غزل کا شعر ادھورا چھوڑتے ہوئے حیران ہو کر پوچھا:

''بھئی! یہ نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا؟''

مجاز تنہا کافی ہاؤس میں بیٹھے تھے کہ ایک صاحب جو اِن کو جانتے نہیں تھے، ان کے ساتھ والی کرسی پر آ بیٹھے۔ کافی کا آرڈر دے کر انہوں نے اپنی کن سُری آواز میں گنگنانا شروع کیا: ''احمقوں کی کمی نہیں غالب۔ ایک ڈھونڈو، ہزار ملتے ہیں۔''

مجاز نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ''ڈھونڈنے کی نوبت ہی کہاں آتی ہے، حضرت! خود بخود تشریف لے آتے ہیں۔''

سوز شاہجہانپوری ایک دن لکھنو کافی ہاؤس آ گئے اور مجاز کے میز پر آن بیٹھے۔ کہنے لگے: ''بھائی مجاز! میں نے اپنا مجموعہ کلام تو مرتب کرلیا ہے۔ اب اس کے لیے کسی موزوں نام کی تلاش ہے۔ کوئی ایسا نام ہو جو نیا بھی ہو اور جس میں میرے نام کی رعایت بھی ہو۔

مجاز نے برجستہ کہا: ''سوزاک رکھ لو۔''

کسی مشاعرے میں ایک نوجوان شاعر غزل پڑھ رہے تھے جس کی زمین تھی ''نظاروں سے کھیلا، بہاروں سے کھیلا'' وغیرہ وغیرہ۔

غزل سننے کے بعد مجاز نے کہا:

''ویل پلیڈ (Well Played) مسٹر!''

ریل کے سفر میں سب سے اوپر والی برتھ پر مجاز، درمیان میں جوش ملیح آبادی اور نچلی برتھ پر فراق گورکھپوری سفر کر رہے تھے۔

معاً جوش نے فراق سے پوچھا: ''رگھو پتی اس وقت تمہاری عمر کیا ہوگی؟''

فراق نے جواب دیا: ''یہی کوئی دس برس''

جوش خاموش ہو گئے تو فراق نے جوش سے پوچھا: ''شبیر حسن! تمہاری عمر کیا ہوگی؟''

جوش نے برجستہ جواب دیا:

''یہی کوئی پانچ چھ سال۔''

اس پر اوپر کی برتھ پر لیٹے ہوئے مجاز نے اپنا منہ چادر میں چھپاتے ہوئے کہا:

''بزرگو! اب مجھ سے عمر مت پوچھنا کیونکہ میں تو ابھی پیدا ہی نہیں ہوا۔''

تقسیم ہند سے پہلے کی بات ہے۔ حمیدہ سلطان صاحبہ کے گھر فیض، مجاز، جذبی اور جاں نثار اختر مدعو تھے۔ ساغر دہلی سے آئے ہوئے تھے اور حمیدہ سلطان ہی کے مہمان تھے۔ شاعری کا دَور چلا تو سب سے پہلے جذبی نے اپنی نظم ''موت'' سنائی۔ ان کے بعد جاں نثار اختر بیٹھے تھے، انہوں نے ''زندگی'' کے عنوان سے ایک نظم پڑھی۔ ان کے بعد فیض صاحب کی باری آئی، کہنے لگے:

''کیا سناؤں؟''

مجاز نے کہا:

''موت اور زندگی پر تو جذبی اور جاں نثار نے نظمیں سنا دیں۔ آپ حیات بعد الممات سنا دیجیے۔''

اسی محفل کی بات ہے جب مجاز کے پڑھنے کا نمبر آیا تو میزبان حمیدہ سلطان نے کہا:

''بھئی ہم مجاز سے نظم نہیں سنیں گے، کوئی لطیفہ سنیں گے۔''

مجاؔز نے برجستہ کہا:

''شاعری بھی فنونِ لطیفہ ہی میں سے ہے۔''

جوشؔ صاحب ایک روز مجازؔ سے کہنے لگے:

''دیکھو مجازؔ، شراب پینے کا صحیح طریقہ یہ ہے کی آہستہ آہستہ پی جائے۔ میں دو منٹ میں ایک پیگ ختم کرتا ہوں اور ہمیشہ گھڑی سامنے رکھ کر پیتا ہوں۔ تم بھی گھڑی سامنے رکھ کے پیا کرو۔''

''گھڑی رکھ کر؟'' مجازؔ نے بات سے بات پیدا کرتے ہوئے کہا، ''میرا بس چلے تو میں گھڑا رکھ کر پیا کروں۔''

عالم مدہوشی میں ایک صاحبِ ذوق خاتون کو اپنی شاعری کے بارے میں رائے دیتے ہوئے مجاز نے کہا:

''میں ڈکشن کا ماسٹر ہوں''

''تو پھر جوش ملیح آبادی کیا ہیں؟''

اس خاتون نے محض دل لگی کی خاطر سوال کیا۔ ''ڈکشنری کے ماسٹر!! مجاز نے جواب دیا۔''

محمود آباد کے ایک مشاعرے میں مجازؔ کی اعلیٰ شاعری سے متاثر ہو کر مہاراجہ محمود آباد نے مہربانی کی نظر کی۔

مجازؔ نے مہاراجہ محمود آباد سے پانچ سو روپے ماہانہ وظیفہ اس شرط پر کہ ''تم شراب چھوڑ دو''، لینا قبول نہ کیا اور نہایت معصومانہ میں جواب دیا کہ ''تو ہم ان پیسوں کا کیا کریں گے؟''

ایک بار کسی دعوت میں بہت سے شعرا و ادبا مدعو تھے، کھانا آنے سے قبل اس بات پر گفتگو ہو رہی تھی کہ صاحبِ طرز انشا پردازی یا شاعری اکتسابی چیز نہیں ہے کہ انسان اسے محنت سے حاصل کر لے اور وہ اپنے اندازِ تحریر سے پہچانا جائے بلکہ ایک وہبی صفت ہے جو فطری طور پر اسے ملتی ہے۔ اسی لئے ہم بعض دفعہ یہ کہتے ہیں کہ یہ غزل غالبؔ یا اقبالؔ کے رنگ میں ہے یا یہ مولانا آزادؔ کی سی نثر ہے۔ اتفاق سے سب سے پہلے رائتہ لا کر رکھا گیا تو مجازؔ کہنے لگے کہ اب دیکھئے رائتے ہی کو لے لیجئے اگر اسے مختلف شعرا استعمال کرتے تو کیسے کرتے۔ جیسے علامہ اقبال کہتے:

حیف شاہیں رائتہ کھانے لگا

یا جوش ہوتے تو یوں کہتے:

وہ کج کلاہ جو کھاتا ہے رائتہ اکثر

اور اختر شیرانی کہتے:

رائتہ جب رخِ سلمیٰ پہ بکھر جاتا ہے

فراق یوں کہتے:

ٹپک رہا ہے انگلیوں سے رائتہ کچھ کچھ

اور میں تو یوں ہی کہتا:

ٹھہرئے ایک ذرا رائتہ کھالوں تو چلوں

ایک مشاعرے میں بزرگ شاعر نوح ناروی اپنا کلام پڑھ رہے تھے۔ ان کے نقلی دانتوں کی بتیسی شائد ڈھیلی تھی اچانک شعر پڑھتے ہوئے نیچے گر گئی۔

نوح صاحب جیسے ہی بتیسی اٹھانے کے لئے جھکے مجاز نے مائک پر آ کر نہایت ادب سے کہا:

''حضرات آپ استاد سے ایک خالص زبان کا شعر سنئے۔''

کسی نے ایک بار مجاز کے سامنے اقبال کا یہ مصرعہ پڑھا۔ ع

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں

مجاز بولے:

''ہاں بھئی! افسوس تو یہی ہے۔ جب حقیقت منتظر ''لباسِ مجاز'' میں نظر آئی تو کوئی پہچاننے والا ہی نہیں۔''

ایک بار کسی ادیب نے کہا: "مجاز صاحب! آپ نے شعروں سے زیادہ لطیفے کہنے شروع کر دیئے ہیں۔''

مجاز: ...... ''تو اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے؟''

وہ صاحب بولے: ''تو اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ مشاعرہ میں لوگ آپ سے فرمائش کیا کریں گے کہ اپنے نئے لطیفے سنایئے۔''

مجاز نے کہا: ''اور میں ان سے کہوں گا۔ شاعری بھی فنون لطیفہ میں سے ہے۔''

ایک بار جوش، فراق، مجاز اور ان کے ایک دمساز۔ مے نوشی کے دوران اپنی اپنی عمریں بتا رہے تھے۔

جوش نے کہا۔

میری عمر ابھی صرف پچیس سال ہے۔

اور میری عمر ابھی صرف بیس سال ہے۔

فراق نے جواب دیا۔

دمساز نے جھومتے ہوئے کہا ...... میرا یہی چودھا پندرہ کا سن، جوانی کی باتیں مرادوں کے دن ...... مجاز یہ سن کر دل ہی دل میں کڑھ رہے تھے۔ ان سے پوچھا گیا تو جل کر بولے۔

آپ لوگوں کی عمروں کے حساب سے تو خاکسار ابھی پیدا بھی نہیں ہوا۔

مجاز کی بہن حمیدہ نے جب ایم۔اے پاس کیا تو ان کا بحیثیت لیکچرر کرامت حسین مسلم گرلز کالج میں تقرر ہو گیا۔

جب مجاز نے یہ خبر سنی تو اپنی والدہ کے پاس گئے اور ان سے کہا

''اور تو سب ہو گئے اماں...... بس اب گھر میں ہم اور تم صرف دو ہی آدمی بے روزگار رہ گئے۔''

سرور صاحب لکھنؤ یونیورسٹی سے مسلم یونیورسٹی جانے والے تھے اس سلسلہ میں ایوان ادب کی طرف سے ان کو ایک عشائیہ دیا جانے والا تھا۔ لیکن کسی نہ کسی مجبوری کی وجہ سے سرور صاحب اس کی تاریخ بڑھواتے چلے آرہے تھے۔ اسی درمیان علامہ کیفی کا انتقال ہو گیا۔ مجاز صاحب نے اتفاق سے اسی دن عشائیہ کے بارے میں پوچھا۔

میں نے کہا:

''کیا بتاؤں سرور صاحب کو کوئی تاریخ راس ہی نہیں آتی بتایئے کیا کیا جائے؟''

بولے: ''اگر سرور صاحب راضی نہیں ہوتے تو اسی پیسے سے علامہ کیفی کا چالیسواں کروادو۔''

عصمت چغتائی جب بمبئی سے لکھنؤ کے لیے روانہ ہونے لگیں تو شاہد لطیف (ان کے شوہر) نے کہا: ''عصمت! تم لکھنؤ سے میرے لیے دو چیزیں لانا مت بھولنا، ایک تو کُرتے اور دوسرے مجاز۔''

عصمت لکھنؤ میں مجاز سے ملیں تو شاہد لطیف کی فرمائش دہرا دی۔

مجاز نے جواب دیا:

''اچھا گریباں اور چاکِ گریباں دونوں کو منگوایا ہے۔''

ایک نوجوان شاعر، فراق صاحب کے رنگ میں رباعی کہنے کی ناکام کوشش کیا کرتے ان کے احباب نے انہیں سمجھایا کہ یہ کام پختہ کاروں کے لیے چھوڑ دو۔ ابھی سے رباعی پر توجہ قبل از وقت ہے۔''

مگر نوجوان شاعر اپنے زعم میں یہ بات نہ سمجھ سکا۔

ایک مرتبہ جذبی نے پوچھا:

''کہیے حضرت! کتنی رباعیاں کہہ ڈالی ہوں گی؟''

جواب ملا ''یہی! کوئی چالیس کے قریب''

مجاز بول اٹھے: ''جو جناب آپ اپنی رباعی گوئی کا چالیسواں کروا ڈالیے۔''

ایک بار سلام صاحب نے مجاز سے پوچھا:

''کیوں مجاز! آخر تم بھی کہو کہ میری شاعری کس معیار کی ہے؟''

مجاز پہلے تو بہت ٹالتے رہے مگر جب سلام صاحب بہت بضد ہوئے تو مجاز نے کہا: ''بھئی میں ابھی تمہاری شاعری کے بارے میں کیا رائے قائم کرسکتا ہوں۔ پہلے تم اس کا اردو میں ترجمہ تو کروا لو۔''

قیام پاکستان کے بعد مجاز مشاعروں میں شرکت کی غرض سے کراچی اور لاہور گئے۔

وہاں سے واپسی پر ایک دن پاکستان زیر بحث تھا۔ مجاز نے بڑے اطمینان سے کہا کہ ''کسی کا فائدہ قیام پاکستان سے ہوا یا نہیں، مگر میرا فائدہ ضرور ہوا۔'

پھر ڈاکٹر عبادت بریلوی سے مخاطب ہو کر۔ اس فائدہ کی وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ ''بھئی فائدہ یہ ہوا۔ میری اہمیت اور بڑھ گئی۔

ڈاکٹر نے پوچھا۔ کیسے؟

جواب دیا ''وہ اس طرح کہ اب میں فکر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے بھی ایک فارن کنٹری کی سیر کی ہے۔''

ایک صاحب نے بڑی شاہانہ طبیعت پائی تھی جس فراخدلی سے وہ اپنا پیسہ خرچ کرتے تھے اسی ٹھاٹھ سے وہ دوسروں کا پیسہ بھی خرچ کروا دیتے۔

ایک بار وہ مجاز سے بولے۔ ''مجاز صاحب! میں نے ایک دو نہیں بلکہ کتنے ہی لکھ پتی بنا کر چھوڑ دیئے۔''

''ہاں بھی ٹھیک کہتے ہو۔ مگر یہ تو تم بھی مانتے ہو کہ پہلے وہ کروڑ پتی بھی تھے۔''

مجاز کے بے تکلف دوست سردار اچل سنگھ جب پنجاب سے نئے نئے لکھنؤ آئے تو ٹھیٹھ پنجابی تھے۔ ادبی ذوق تھا اور کافی ہاؤس میں مجاز کے ساتھ بیٹھتے تھے۔

کچھ عرصہ بعد ان کی لکھنؤ کی ایسی ہوا لگی کہ انہوں نے اپنے کو صفا چٹ کروا دیا اور

بالکل سپاٹ ہوکر کافی ہاؤس میں پہنچے۔

مجاز ان کا حلیہ دیکھ کر حیرت سے بولے ''یا خدا! یہ پہلا سردار ہے، جسے تو نے فارغ البالی عطا کی ہے۔''

جذبی نے مجاز سے کہا:

''بھائی میں تو جہاں فن دیکھتا ہوں سر جھکا دیتا ہوں۔''

مجاز بول اٹھے ''خواہ یہ نہ معلوم ہو کہ فن کیا ہے؟''

حیات اللہ انصاری صاحب نے بچوں کے لیے ایک قاعدہ لکھا۔ اس کی اتنی شہرت ہوئی کہ جدھر دیکھیے حیات اللہ قاعدہ زیر بحث ہے۔''

مجاز نے اس کا جب بار بار ذکر سنا تو ایک دن ہنستے ہوئے بولے ''کیا حیات اللہ نے اپنا تخلص قاعدہ رکھ لیا ہے؟''

ایک بار مجاز کے پڑوس میں چوری ہوگئی۔ تفتیش کے لیے پولس آئی، محلے والے جمع ہو گئے اور موقع واردات کے بارے میں اپنی رائے دینے لگے۔

مجاز صاحب نے صاحب خانہ سے ہمدردی کرتے ہوئے ان کو مجمع سے الگ لے جا کر بہت ہی راز دارانہ انداز میں بتایا کہ ''جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے۔ تو بھئی ہو نہ ہو مجھے تو یہ کسی چور کی حرکت معلوم ہوتی ہے۔''

شوکت تھانوی نے ایک دفعہ مجاز کے والد سے مجاز کی بڑی تعریف کی، مگر ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ ''مجاز کو شراب نوشی کی بڑی بری عادت پڑ گئی ہے۔ کسی طرح ان سے چھڑوایئے۔''

یہ خبر جب مجاز تک پہنچی تو بہت خفا ہوئے اور ان سے کہا ''یا مجھ سے دوستی رکھیے یا میرے والد صاحب سے۔ بیک وقت باپ بیٹے سے دوستی رکھنے میں بیٹا تو بیٹا باپ تک کے بگڑ جانے کا خطرہ ہے۔''

ایک روز میں نے کہا: ''مجاز صاحب! میں آپ کے لطیفے جمع کر رہا ہوں۔ کچھ اپنے لطیفے سنایئے۔''

ہنستے ہوئے بولے: ''لیجیے پاشا صاحب! ایک لطیفہ تو یہی ہو گیا کہ آپ مجھ ہی سے میرے لطیفے پوچھ رہے ہیں۔''

ایک بار مجاز سعید اختر نعمانی کے گھر پر بیٹھے ہوئے تھے ان کے ایک دوست اپنا قلمی دیوان بغل میں دبائے ہوئے وارد ہوئے اور مجاز کی طرف دیوان بڑھاتے ہوئے بولے۔

''کتاب چھپوانا چاہتا ہوں۔ آپ مقدمے کے طور پر چند سطور لکھ دیں۔ تو عنایت ہوگی۔''

مجاز مسکرا کر بولے...... ''میر نے سچ ہی کہا تھا۔

لے کے دیوان بغل میں اپنا میر
ہم پکارے ہیں کلام شاعر کا

مجاز کی شادی کی ان کی والدہ کو بہت فکر تھی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے دو لڑکیوں کی تصویریں انہیں دکھا کر کہا۔

''دونوں میں کوئی پسند ہے......؟''

مجاز جلدی سے بول اٹھے...... ''دونوں......!''

فراق اور مجاز کے ساتھ کافی ہاؤس میں ایک ممتاز شاعر اور ان کی اکلوتی صاحبزادی بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ گپ شپ کے دوران فراق صاحب کو شرارت سوجھی اور وہ ان شاعر صاحب کی خوبصورت صاحبزادی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

''صاحب آپ نے زندگی میں ایک ہی مصرعہ کہا ہے۔''

مجاز بھلا کب چوکنے والے تھے۔ جلدی سے بولے۔

''جی ہاں فراق صاحب! مگر اس کا بھی قافیہ تنگ ہے۔''

مجاز نے اپنے ایک ہم نوالہ اور ہم پیالہ سے ایک دن باتوں باتوں میں پوچھا:

''کہیے حضرت! کبھی آپ نے عشق بھی کیا ہے؟''

حضرت بولے...... ''ہاں کیا تو ہے......''

ارے! مجاز اچھل پڑے اور بولے: ''اماں عجیب آدمی ہو، تم پر تو ریسرچ کرنا چاہیے۔ عشق کرتے ہو اور اس کا تذکرہ تک نہیں کرتے۔''

لکھنؤ کی ایک نمائش میں مجاز اپنے گہرے دوست سلام مچھلی شہری صاحب کے ساتھ ٹہل رہے تھے۔ نمائش کے منتظمین کی طرف سے لاؤڈ اسپیکر پر کھوئے ہوئے بچوں کی

شناخت کے اعلانات برابر ہو رہے تھے۔ مجاز کو کچھ دیر بعد شرارت سوجھی اور سلام صاحب کو ایک جگہ بٹھا کر جلدی سے نمائش کے دفتر پہنچے اور تھوڑی دیر بعد لاؤڈ اسپیکر سے اعلان ہو رہا تھا:

''ایک بچہ جس کا نام سلام ہے اور صورت سے مچھلی شہری معلوم ہوتا ہے جن صاحب کو ملے دفتر پہنچا دیں۔''

بمبئی میں ایک ادبی نشست میں اداکارہ نگار سلطانہ بھی موجود تھیں۔
مجاز اپنی نظم، شہر نگار پڑھ رہے تھے لیکن اس مصرعے پر آئے تو مسکرا دیئے:

میرے لب پر لب لعلین نگار آہی گیا

مجاز کا مسکرانا تھا کہ محفل میں قہقہہ پڑ گیا۔

حیدر آباد دکن میں قاف (ق) کی جگہ ''خ'' بولا جاتا ہے۔
ایک بزرگ حیدر آبادی نے مجاز کو مدعو کرتے ہوئے کہا۔
''مجاز صاحب کل میری لڑکی کی تخریب (تقریب) ہے۔ اس میں ضرور شرکت فرمایئے......''
مجاز نے بے حد مایوس ہوتے ہوئے کہا: ''نہیں صاحب! ایسے خوفناک منظر کی میں تاب نہ لا سکوں گا۔''

ایک مشاعرے میں مجاز نے اپنی ایک نظم ''نورا'' پڑھنا شروع کی ...... سامعین نے اصرار کیا کہ ''آوارہ'' پڑھیے۔ ''اسے بھی آوارہ سمجھیے'' اور شروع ہو گئے۔

ایک مشہور شاعر جب کبھی دوستوں کی محفل میں بیٹھتے اپنے کنوارے پن پر بہت رویا کرتے، ایک بار وہ بڑی حیرت سے بولے:

''جوانی گزرتی جا رہی ہے، جسم میں جان نہیں رہ گئی ہے، سوچتا ہوں کہ کسی بیوہ سے شادی کرلوں۔''

مجاز جل کر بولے:

''بیوہ کی قید کی کیا ضرورت ہے۔ تم شادی کرلو۔ بیوہ تو وہ ہو ہی جائے گی۔''

مجاز نے پارٹی لائن پر ہمیشہ چال والی شاعری کبھی نہ کی۔

جنگ کے زمانے میں جب ان کی نظموں پر اشتراکی نقاد اعتراض کرتے تو وہ ہمیشہ مذاق میں یہ کہہ کر ٹال دیتے۔

''جی ہاں یہ نظم ذرا پٹری سے اتر گئی ہے۔

مجاز ایک بار اپنے چند دوستوں کے ساتھ شراب نوشی میں مشغول تھے۔ ایک صاحب نے جب بوتل سے شراب انڈیلی تو اس کے کچھ قطرے میز پر گر پڑے۔ مجاز سے نہ رہا گیا اور ہدایت کی۔

دیکھیے ذرا سنبھل کے۔ اگر ایک قطرہ بھی گرا تو ایک اولاد کا غم ہوگا اور کہیں بوتل ہاتھ سے چھوٹ گئی تو سمجھ لیجیے کہ پورا خاندان تباہ ہوجائے گا۔

مجاز جب رانچی کے دماغی ہسپتال سے واپس ہوئے تو کسی نے پوچھا:

''کیا واقعی آپ کی عقل زائل ہوگئی تھی؟''

مجاز نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا: ''برادرم عقل تھی ہی کہاں جو زائل ہوتی۔ عقل ہوتی تو اس ملک میں شاعری کرتے۔''

کاشانہ فراق ہے......

فراق صاحب حسب عادت ماحول کی بے رنگی سے اکتا کر بچوں سے دل بہلا رہے ہیں بچوں کے معصومانہ غمزے اور شوخیاں اپنے شباب پر ہیں کہ اتنے میں مجاز وارد ہوتے ہیں۔

فراق صاحب اپنی نواسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے:

''یار مجاز! لڑکی بہت شریر ہے مجھے حرامزادہ کہتی ہے۔''

''بڑی مردم شناس معلوم ہوتی ہے۔''

مجاز نے بیٹھتے بیٹھتے جملہ پورا کیا۔

جوش ملیح آبادی سفر پر جا رہے تھے۔ اسٹیشن پہنچے تو ان کی گاڑی چھوٹنے ہی والی تھی مجاز اور دوسرے شعراء انہیں خدا حافظ کہنے کے لیے پہلے سے پلیٹ فارم پر ریلوے بک اسٹال کے سامنے کھڑے ہوئے تھے کہ اچانک جوش صاحب تیزی سے مسکراتے ہوئے سامنے سے گزر گئے۔

اس پر ایک شاعر نے کہا: ''اتنا عظیم شاعر اگر کسی اور ملک میں ہوتا تو آج اس کے معتقد قطار در قطار اسٹیشن پر اس کو الوداع کہنے کے لیے آتے اور ہر شخص اپنے محبوب شاعر سے مصافحہ کرنے کی سعادت حاصل کرتا...... اور......''

''اور اسی دوران میں شاعرِ اعظم کی گاڑی دوسرے اسٹیشن تک پہنچ چکی ہوتی۔''
مجاز نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

مجاز گوالیار سے لکھنؤ آنے کے لیے اسٹیشن پر ویٹنگ روم میں بیٹھے جاں نثار اختر کا انتظار کر رہے تھے ایک صاحب آئے اور کسی قدر گھبراہٹ سے بولے:
''مجاز صاحب! ٹرین آ رہی ہے۔''
''تو میں کیسے روک سکتا ہوں۔''
مجاز نے سوکھے منہ جواب دیا۔

ایک بار نیاز حیدر نے پوچھا:
''مجاز صاحب ہندوستان اور پاکستان کے بٹوارے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔''
مجاز بولے''خیال بٹ جاتا ہے۔''

ایک زمانہ میں مجاز اپنی ذہنی توازن قدرے کھو بیٹھے تھے۔ انہیں علاج کی غرض سے رانچی کے پاگل خانہ میں داخل کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد جب وہاں سے واپس آئے تو حالت سنبھل چکی تھی لکھنؤ آتے ہی ان کے احباب نے انہیں گھیر لیا۔
کسی نے پوچھا: ''کہیے اتنے دن کیسے رہے؟''
کسی نے ہمدردی کی: ''اب مزاج تو ٹھیک ہیں۔''
کسی نے جاننا چاہا: ''سنا ہے کچھ دماغی توازن بگڑ گیا تھا۔''

غرض اسی قسم کے سوالات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک دن اکتا کر بولے:

''بھئی مجھے تو وہاں اور یہاں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک پاگل خانہ سے نکل کر دوسرے پاگل خانہ میں آ گیا ہوں۔''

ایک بار مجاز کے ساتھ جوش صاحب بھی مے نوشی میں شامل تھے، دَور چل رہا تھا کہ کسی نے حرام و حلال کا ذکر چھیڑ دیا۔

جوش صاحب نے شراب کی موافقت میں دلیلیں دینا شروع کر دیں مگر جب بحث تلخ ہوگئی تو بپھر کر بولے:

''کیا حرام و حلال لگا رکھا ہے۔ شراب حلالی کے لیے حلال ہوتی ہے۔''

اتنے میں کہیں فراق صاحب نے نشے میں چُور مجاز صاحب کے جام کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

مجاز نے مسکرا کر جوش صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''فراق صاحب ادھر ہاتھ نہ بڑھایئے۔ ورنہ حرام ہو جائے گی۔''

ہندو مسلم اتحاد کے موقع پر ایک مشاعرہ ہو رہا تھا۔ دوسرے شاعروں کے ساتھ جب مجاز پنڈال میں داخل ہوئے تو سامنے بڑا بڑا لکھا ہوا تھا۔

''مذہب کے نام پر لڑنا حماقت ہے۔''

مجاز نے ایک لمحہ اس عبارت پر نظر ڈالنے کے بعد کہا: ''اس حماقت کے نام پر لڑنا مذہب ہے۔''

پاک و ہند مشاعرہ میں ایک حسینہ مشاہیر شعراء سے آٹو گراف لے رہی تھی اس مشاعرہ میں جوش، جگر، فراق، حفیظ، ساغر اور مجاز کے ساتھ نریش کمار شاد وغیرہ بھی تھے۔

مجاز کے پاس جب آٹو گراف بک پہنچی اور لکھنے سے قبل انہوں نے ورق گردانی کی۔ جوش اور شاد کا آٹو گراف دیکھنے کے بعد وہ مسکرائے اور انہوں نے آٹو گراف بک پر لکھا۔ آٹو گراف بک ایک ایسا اصطبل ہے جس میں گھوڑے اور گدھے ایک ساتھ باندھے جاتے ہیں۔''

ایک بار مجاز اپنے گہرے دوست سلام صاحب مے نوشی کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ ایک صاحب بولے ''سلام صاحب پینے کے بعد ایٹم بم بن جاتے ہیں۔'' ''ایٹم بم''۔ مجاز بولے ''ایٹم بم تو ہیروشیما پر گرایا گیا تھا۔ مگر یہ حضرت ہمہ شما پر گرتے ہیں۔

ایک سڑک پر سامنے سے کوئی بگڑے جنٹلمین الٹا ہیٹ پہنے چلے آرہے تھے۔ انہیں دیکھ کر مجاز مسکراتے ہوئے بولے۔ ''ذرا ان حضرت سے پوچھو کہ یہ آرہے ہیں یا جارہے ہیں۔''

ساحر نے بہت جذباتی طریقے سے کہنا شروع کیا۔ ''دیکھو مجاز یہ بمبئی کا اسٹیشن ہے اس کی عمارت کتنی عالیشان ہے۔ اس کے کمرے کتنے بڑے بڑے اور روشن ہیں۔'' ساحر نے کہا: ''اور اسی بمبئی میں ہزاروں بلکہ لاکھوں مزدور، کیڑوں مکوڑوں کی طرح تنگ و تاریک اور متعفن کھولیوں میں ایڑیاں رگڑ رہے ہیں۔ ہمارے رہنے کے لیے عالیشان کمرے نہ جانے کب ملیں گے۔'' مجاز نے ساحر کے لہجے کی نقل کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں یار ساحر! تم نے

ٹھیک ہی تو کہا ہے کہ

ریلوے والوں نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

ایک بار مجاز صاحب شہاب جعفری کے گھر گئے۔ باہر جعفری صاحب کا بچہ کھیل رہا تھا۔ مجاز اس کو کھلاتے رہے اتنے میں شہاب جعفری گھر میں سے برآمد ہوئے۔ مجاز نے پوچھا: ''یہ تمہارا بھائی ہے؟'' ''نہیں! یہ میرا بچہ ہے!'' تم نے شادی کر لی۔ مجاز نے پوچھا۔ ''ہاں'' اور بچہ بھی پیدا کر لیا۔'' ''ہاں'' ''ہائے افسوس'' مجاز نے ایک آہ سرد کھینچی اور بولے۔ ''انسان سے پھر انسان نکل گیا۔''

ایک بار مجاز نے کہا:
''ہزار صاحب آپ نے تخلص میں اس قدر بخل سے کیوں کام لیا؟''
''کیا مطلب آپ کا؟'' ہزار صاحب نے وضاحت چاہی۔
مجاز بولے:
''ارے جناب لاکھ نہ دو لاکھ صرف ہزار؟''

شوکت تھانوی نے ''وہی وہانوی'' کے نام سے ایک ناول لکھی۔ مجاز کو معلوم ہوا تو شوکت صاحب سے بولے: ''آئندہ ''فلاں فلانوی'' نام کیسا رہے گا؟''

مجاز لاہور گئے۔ فیض، ندیم اور دوسرے ادیبوں نے شہر اور اطراف شہر کی انہیں سیر کرائی۔ بالآخر مجاز کو وداع کرنے کا وقت آیا۔

فیض نے پوچھا:

''مجاز صاحب آپ لاہور پسند آیا؟''

''ہاں بھئی شہر تو اچھا ہے لیکن یہاں پنجابی بہت ہیں۔'' مجاز نے مخصوص سادگی سے جواب دیا۔

ڈاکٹر محمد حسن کے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ''پیسہ اور پرچھائیں'' دیکھ کر مجاز بولے۔ ''چھپائی تو خوب ہے۔ مگر کاغذ ایسا ہے کہ ایک طرف کی روشنائی دوسری طرف پھوٹ آئی ہے کہ ایک طرف سے پیسہ معلوم ہوتا ہے اور دوسری طرف سے پرچھائیں۔''

ایک زمانے میں ہر خاص و عام میں ایک سید صاحب اور ایک محترمہ کے تعلقات خصوصی کا بڑا چرچا تھا۔ ایک صاحب ان محترمہ کی ایک قلمی تصویر لے کر مجاز کے پاس آئے اور بولے۔ ''بھئی میں اس تصویر کو فریم کر کے اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔ تم اس پر کوئی چبھتا ہوا شعر لکھ دو۔ مجاز نے فوراً اکبر کے اس مصرع کو یوں لکھ دیا۔

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا ہے

نئے شعراء نے ایک زمانے میں ''امن'' کے موضوع پر نظمیں کہنا اپنا فرض سمجھ رکھا تھا خواہ اس کے بارے میں ان کے تاثرات کتنے ہی سطحی اور مصنوعی کیوں نہ ہوں۔ ایک ترقی پسند شاعر نے کئی بار مجاز کو بھی مجبور کیا کہ وہ بھی امن پر کوئی نظم لکھیں۔ پہلے تو مجاز ہاں ہوں میں

بات ٹالتے رہے مگر ایک دن وہ صاحب ان کے بالکل ہی پیچھے پڑ گئے۔ ''دیکھو مجاز تمہیں پیس پر نظم لکھنا ہے۔'' ''ہاں لکھوں گا۔ مجاز نے ہاں کر دی اتنے میں ایک صاحب اور آ گئے اور مجاز کی خیریت پوچھی۔ مجاز سہمے ہوئے انداز میں بولے: ''بھائی خدا کے لیے میری جان چھڑاؤ یہ مجھے بہت دیر سے کٹ پیس کھلا رہا ہے۔''

مجاز صاحب بمبئی گئے تو سردار جعفری سے ملنے ان کے گھر گئے۔ سردار جعفری اتفاق سے گھر پر موجود نہ تھے ان کا نوکر گھر سے نکلا اور بتایا کہ صاحب گھر پر نہیں ہیں۔ مجاز نے یہ جاننے کے لیے کہ واپسی کب تک ہوگی نوکر سے پوچھا:

''عموماً صاحب کتنے بجے آتے ہیں؟''

نوکر سمجھا عموماً کسی صاحب کا نام ہے اور بولا:

''عموماً صاحب یہاں نہیں آتا۔''

مجاز نے اطمینان سے گردن ہلائی اور بولے:

''اچھا تو پھر خصوصاً صاحب بھی یہاں نہیں آتے ہوں گے۔''

آموں کی ایک دعوت میں آم چوستے ہوئے جعفری نے مجاز سے کہا۔ کیسے میٹھے آم ہیں مجاز، روس میں اور تو ہر چیز مل جاتی ہوگی مگر ایسے میٹھے آم وہاں کہاں۔ ''روس میں آم کی کیا ضرورت ہے۔'' مجاز نے بلا تامل جواب دیا۔ ''وہاں عوام جو موجود ہیں۔''

اکبر کی خدمت میں ہر وقت حاضر رہنے والے ایک صاحب جو کافی ''خوش خوراک'' تھے اور اسی ''زیستن برائے خوردن'' نے انہیں معدے کا مستقل مریض بنا دیا تھا۔ آئے دن پیٹ کی بیماریوں میں مبتلا رہے۔ ایک روز کچھ پریشان اور مضمحل سے آئے۔

اکبر نے پوچھا: ''کہو بھئی کیا حال ہے؟''

کچھ آبدیدہ ہو کر بولے:

''اب تو زندگی سے بیزار ہو چکا ہوں۔ روز روز کی بیماریوں سے کھانے پینے کا لطف جاتا رہا۔ زندگی بے کیف اور بے مزہ سی ہوگئی ہے اب۔ ایک لمحہ خاموش رہے اکبر، پھر ٹھنڈی سانس بھر کر کہنے لگے ''ہاں بھئی سچ ہے۔''

زندگی سے میرا بھائی سیر ہے
پھر بھی خوراک اس کی ڈھائی سیر ہے

انیسویں صدی کے آخر میں ہندوستان ''پریس'' اور ''پبلسٹی'' سے کافی روشناس ہو چکا تھا۔ ''اشتہار بازی'' اور ''ایڈورٹائزمنٹ'' کے نئے تجربات سب سے پہلے پنجاب اور دلی کے دوا فروشوں نے شروع کیے تھے۔ بنگال بھی کچھ زیادہ پیچھے نہیں تھا۔لیکن اردو زبان میں تھوڑی بہت ''اشتہار بازی'' کلکتہ میں رائج ہوئی تھی۔ جنسی امراض، کے کوک شاسترانہ اشتہارات عام طور پر اخباروں میں چھپنے لگے تھے اور بیسویں صدی کے شروع میں تو اس بیماری نے وبائی شکل اختیار کر لی تھی۔ مرنے سے دس پندرہ برس پہلے اکبر دائم المریض ہو چکے تھے، پیٹ کی بیماریوں نے کافی کمزور بنا دیا تھا۔ ایک صاحب ملنے کے لیے آئے۔ بیماری کا حال سن کر دہلی کی ایک اشہاری دوا تجویز کر دی۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ یہ اشتہاری دوائیں اکبر کی ''چڑ'' ہیں۔ کہنے لگے۔ آپ کو نہیں معلوم...... میں نے تو انہیں اشتہاری دواؤں کی وجہ سے اخبار کھولنا تک چھوڑ دیا۔ پڑھنا تو درکنار...... مجھے تو ان اخبارات سے نفرت سی ہوگئی ہے۔ آپ نے میرا یہ شعر سنا نہیں شاید:

مجھے بھی دیجیے اخبار کا ورق کوئی
مگر وہ جس میں دواؤں کا اشتہار نہ ہو

ان (مجاز لکھنوی) کے بارے میں جو لطیفہ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے کسی دوست سے کہا:

''میں شادی کرنا چاہتا ہوں، لیکن کسی بیوہ سے اور اس دوست نے کہا تھا،'' شادی تم کسی سے بھی کرلو، بیوہ تو ہو ہی جائے گی۔''

یہ واقعہ میرے (کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے) مکان پر ہی ہوا تھا اور فقرہ کہنے والے ماہر القادری مرحوم تھے۔

بھیمڑی کانفرنس کے بعد لکھنو میں بھی ترقی پسند ادیبوں کی ایک کانفرنس ہوئی۔ زمانہ وہی انتہا پسندی کا تھا۔ ڈاکٹر عبدالعلیم بہت زور شور سے تقریر کر رہے تھے اور جب تقریر کرتے ہوئے وہ یہاں پہنچے کہ ''جو ادیب جیل خانے، سولی پانے اور سینے پر گولی کھانے کے لیے تیار نہ ہوں، اس ہال سے باہر نکل جائیں۔''

تو مجاز نے بے ساختہ کہا:

''تیار تو نہیں ہیں لیکن سب کے سامنے باہر کیسے چلے جائیں۔''

اسی کانفرنس کے ایک اجلاس میں مجروح اپنی غزل سنا رہے تھے:

''آنکل کے میداں میں دورخی کے خانے سے۔''

جب اس شعر پر پہنچے۔

اہلِ دل اگائیں گے کھیت میں مہ و انجم
اب گہر سبک ہو گا ایک جو کے دانے سے

تو مجاز نے پریشانی کے لہجے میں کہا:

''کھیت میں مہ و انجم اگائیں گے تو کھائیں گے کیا سالے۔''

ایک بار جذبی، جوش صاحب کے پاس بیٹھے تھے کہ مجاز آ گئے، آتے ہی جذبی سے پوچھا:

''تمہارا ڈاکٹریٹ کا تھیسس تیار ہو گیا کہ نہیں؟''

اور جذبی نے جب یہ کہا کہ ''ابھی نہیں۔'' تو مجاز کہنے لگے:

''جوش صاحب! یہ جذبی جو میرے سامنے بیٹھا ہے، میں اس کے بارے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس کو تھائی سِس ہو جائے گا مگر یہ تھیسس نہیں لکھ سکے گا۔''

دہلی کا واقعہ ہے، جوش ملیح آبادی، صابر دہلوی اور اسرار الحق مجاز، کنور مہندر سنگھ بیدی کے گھر میں بیٹھے پی رہے تھے۔ اُن کے ملاقات کمرے میں ایک شیر فریم کے اندر ایک طرف، کھڑا ہوا تھا، شعر خوانی ہو رہی تھی۔ صابر دہلوی جب اپنا کلام سنا چکے تو مجاز کی باری آئی۔ وہ بڑی متانت کے ساتھ اُٹھا اور کمرے کے شیر کی پشت پر جا کر بیٹھ گیا۔

جوش نے پوچھا:

''ارے یہ کیا کر رہا ہے؟''

مجاز نے کہا:

''آپ سب بھیڑیں ہیں کہ فرش پر بیٹھے شعر سنا رہے ہیں، میں شیر ہوں، شیر پر بیٹھ کر اپنا کلام سناؤں گا۔''

لکھنؤ کا ذکر ہے، ایک بار جوش اور مجاز چار باغ اسٹیشن پر کھڑے ہوئے تھے کہ دھڑدھڑاتا پنجاب میل آیا، ایک صاحب جن کے منہ پر چیچک کے داغ تھے اور رنگ نہایت سیاہ تھا، نہایت شان دار سوٹ پہنے اور گھڑی کی سونے کی زنجیر گلے میں ڈالے، اپنے فرسٹ کلاس سے اُترے اور اپنے سونے کی انگوٹھیوں والے ہاتھ، پتلون کی جیب میں ڈال کر، بڑے ٹھاٹ کے ساتھ، پلیٹ فارم پر آ کر کھڑے ہو گئے۔

اُن کی اس فرعونیت کو دیکھ کر مجاز کو مذاق سوجھا، اُن کے سامنے جا کر اُس نے، بڑے ادب کے ساتھ، اُن کو سلام کیا اور پوچھا:

''حضور کہاں تشریف لیے جا رہے ہیں۔''

انہوں نے کہا:

''یہ بات آپ کیوں پوچھ رہے ہیں۔''

مجاز نے ہاتھ جوڑ کر کہا:

''حضور میں بے حد غریب آدمی ہوں، آپ میری امداد فرما دیں۔''

انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس روپے کا نوٹ نکال کر، مجاز کی طرف بڑھا دیا، مجاز نے بڑی مسکنت سے، اُن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا:

''سرکار! میں آپ سے روپے کی مدد کا خواستگار نہیں ہوں، فقط اس قدر استدعا ہے کہ آپ ایک ٹرین مس کر کے، صرف ایک رات کے واسطے لکھنؤ میں ٹھہر جائیں۔''

انہوں نے، تیوری پر بل ڈال کر پوچھا:

''میں یہاں ٹھہر کر کیا کروں گا؟''

مجاز نے کہا:

''حضور یہاں ایک رات اگر ٹھہر جائیں گے تو میں اور میرے بال بچے ایک بڑی مصیبت سے نجات پا جائیں گے اور ہم سب آپ کو ہمیشہ دُعائیں دیتے رہیں گے۔''

انہوں نے کہا:

''یہ آپ کہہ کیا رہے ہیں، میری سمجھ میں نہیں آتا۔''

مجاز نے پھر ہاتھ جوڑ کر کہا:

''اے حضور! یہاں کے ایک محلے ''عیش باغ'' میں ایک چھوٹا سا کھیت ہے، ہر رات کو گیدڑ آتے ہیں، اور کھیت چَر کر چلے جاتے ہیں، اس لیے میری یہ گزارش ہے کہ حضور، آج رات کو اُس کھیت میں دونوں پاؤں پھیلا کر، اور دونوں ہاتھوں کو بلند کر کے فقط ایک گھنٹے کے لیے کھڑے ہو جائیں تا کہ مجھ کو حرام زادے گیدڑوں سے ہمیشہ کے واسطے نجات مل جائے۔''

یہ سنتے ہی وہ مجاز کی طرف جھپٹے، وہ پیچھے ہٹ گیا، گاڑی نے سیٹی دی، وہ غصے میں بھرے اور اپنے درجے میں چلے گئے اور گاڑی رینگنے لگی اور ہاتھ جوڑے ہوئے مجاز کی یہ آواز گونجنے لگی:

''حضور، صرف ایک رات کے لیے۔''

جوش نے ایک دن پوچھا:

''مجاز! تیرے والدین تو بے حد پابند صوم وصلوٰۃ ہیں، مجھ کو حیرت ہے کہ وہ تیری بادہ خواری کو کیوں کر برداشت کرتے ہیں۔''

مجاز نے کہا:

''بعض والدین اس قدر خوش قسمت ہوتے ہیں کہ اُن کی اولاد نہایت سعادت مند ہوتی ہے، اور میں اس قدر خوش قسمت بیٹا ہوں کہ میرے والدین، حد سے زیادہ، سعادت مند ہیں۔''

اور جوش، اس لفظِ ''سعادت مند'' کے محلِ استعمال پر لوٹ پوٹ ہو کر رہ گئے۔

ایک رات کو، لکھنؤ میں پھڑ جمی ہوئی تھی۔ جوش ملیح آبادی، رئیس احمد، میرزا جعفر حسین، حکیم صاحب عالم، حکیم مخمور، میرزا عطا حسین قزلباش، میرن صاحب اور نہ جانے اور کون کون، حلقے میں، فرش پر بیٹھے ہوئے تھے کہ مجاز، جھک کر ''ہلو، ہلو'' کرنے لگا اور ٹیلی فون کا فرضی رسیور اُٹھا کر کہنے لگا:

''میں اسرارالحق مجاز بول رہا آپ کون ہیں؟
اچھا اچھا کجن بائی ہیں، ارے ارے آپ کو مجھ سے اس قدر عشق ہے
ارے آپ کو میرے بغیر نیند نہیں آ رہی ہے، اچھا ابھی آتا ہوں۔''

یہ کہتے ہی وہ اُٹھ کھڑا ہوا، اور یک دم سے نرت کر کے گانے لگا:

''بریلی کے بجار میں، جھمکا گراری، جھمکا، اے جھمکا گراری، بریلی کے بجا میں جھمکا گراری''

(کہیں سے بریلی کے بازار میں جھمکا (کان کا زیور) گر پڑا (یعنی کسی کو دیکھا اور اس پر دل آ گیا)۔

اور حکیم مخمور اُس کے سامنے کھڑے ہو گئے اور تالیاں بجا بجا کر نعرے لگانے لگے:

''اے بڑھ کے بٹیا بڑھ کے، اے بڑھ کے بٹیا، بڑھ کے۔''

(جب کوئی نوعمر طوائف ناچنے گانے کے لیے کھڑی ہوتی ہے، تو اس کے سازندے، اُس کا دل بڑھانے کا واسطے بڑھ کے بٹیا، کے نعرے لگاتے ہیں تا کہ وہ بڑھ بڑھ کر ناچے اور لہک لہک کر گائے۔)

اِدھر ارے---

''بریلی کے بجار میں جھمکا، ارے جھمکا۔ آہا جھمکا، بریلی کے بجار میں، جھمکا گراری جھمکا گراری، جھمکا گراری، جھمکا گراری، جھمکا گراری۔''

اور اُدھر

''بڑھ کے اے بڑھ کے، اے بڑھ کے بٹیا بڑھ کے'' ہاں ہاں بڑھ کے، بٹیا بڑھ کے''

نے قیامت برپا کر دی اور سب اس قدر زور زور سے ہنسے کہ گلی کے کتے بھونکنے لگے۔

میاں کیفی اعظمی، کیمونسٹ پارٹی کے جلسے میں شریک ہونے کے لیے حیدرآباد دکن گئے اور وہاں سے تیرِ عشق کھا کر بمبئی آ گئے اور اُس لڑکی کے باپ کے پاس اپنے نکاح کا پیغام بھیج دیا، لڑکی کی ماں نے انکار کر دیا، مگر لڑکی کے باپ اس قدر خوش حال تھے کہ وہ اپنی لڑکی کو بمبئی لے آئے اور کیفی سے اُس کا نکاح کرا دیا۔ نکاح کا جشن بنّے میاں (سجاد ظہیر) کے کمرے میں منایا گیا تھا۔ سب لوگوں نے اپنے اپنے چہروں پر، طرح طرح کے رنگ لگا لگا کر دھومیں مچائی تھیں اور خوشی میں ڈوب کر رقص کیا تھا۔ جب ساری اُچھل کود ہو گئی تو مجاز، کیفی کے خسر کے پاس آئے اور اُن کی روشن خیالی کی داد دے کر، جب انہوں نے یہ کہا:

''جنابِ والا خسر ہو تو آپ کا سا، ورنہ سرے سے ہو ہی نہیں۔''

تو سب کے پیٹ میں، ہنستے ہنستے بَل پڑ گئے، خدا کی قسم، ''ورنہ ہو ہی نہیں'' کی داد نہیں دی جا سکتی۔

سعادت حسن منٹو

ولادت: ۱۱رمئی ۱۹۱۲ء(لدھیانہ)

وفات:۱۸رجنوری ۱۹۵۵ء(لاہور)

شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں:

''ایک موقع پر منٹو اور چراغ حسن حسرت کی آپس میں لڑائی ہوگئی۔

ایک محفل میں مولانا نے منٹو سے کہا:

''آپ نے ''مقاماتِ حریری'' پڑھی ہے؟ آپ نے کیا پڑھی ہوگی، عربی میں ہے یہ کتاب۔ ''دیوانِ حماسہ'' پڑھا ہے؟ لیکن آپ نے کیا پڑھا ہوگا۔ کاش آپ کو عربی آتی ہوتی۔''

اِسی طرح مولانا حسرت نے کئی کتابوں کے نام لے لے کر اُس سے پوچھا۔ منٹو خاموش بیٹھا پیچ وتاب کھاتا رہا۔ بولا تو صرف اتنا بولا:

''مولانا! ہم نے عربی فارسی نہیں پڑھی تو کیا ہے، ہم نے اَور بہت کچھ پڑھا ہے۔''

بات شاید کچھ بڑھ جاتی لیکن کرشن چندر وغیرہ نے بیچ میں پڑ کر موضوع ہی بدل ڈالا۔ اگلے دن جب پھر سب جمع ہوئے تو منٹو نے جوابی حملہ شروع کر دیا کہ

''کیوں مولانا، آپ نے فلاں کتاب پڑھی ہے؟ مگر آپ نے کیا پڑھی ہوگی وہ تو انگریزی میں ہے اور فلاں کتاب، شاید آپ نے اِس جدید مصنف کا نام بھی نہیں سنا ہوگا؟''

اسی طرح منٹو نے کوئی پچاس غیر مشہور انگریزی کتابوں کے نام ایک ہی سانس میں گنوا دیئے اور مولانا سے کہلوا لیا کہ اِن میں سے ایک بھی کتاب نہیں پڑھی۔ ہم چشموں اور ہم نشینوں میں یوں سبکی ہوتے دیکھ کر مولانا کو پسینے آ گئے۔

منٹو نے کہا:

''مولانا! اگر آپ نے عربی پڑھی ہے تو ہم نے بھی انگریزی پڑھی ہے، آپ میں کوئی سرخاب کا پر لگا ہوا نہیں ہے۔ آئندہ ہم پر رعب جمانے کی کوشش نہ کیجیے۔''

مولانا کے جانے کے بعد کسی نے منٹو سے پوچھا:

''یار! تُو نے اِتنے سارے نام کہاں سے یاد کر لیے؟''

منٹو نے مسکرا کر کہا:

''کل شام یہاں سے اُٹھ کر سیدھا انگریزی کتب فروش جینؔا کے ہاں گیا۔ جدید ترین مطبوعات کی فہرست اُس سے لے کر میں نے رٹ ڈالی۔''

بالآخر احباب نے دونوں کو ایک پارٹی میں جمع کیا اور اُن کی صلح کرا دی۔

منٹو نے کہا:

''مولانا! تم بھی فراڈ ہو اور میں بھی فراڈ ہوں۔''

مولانا نے کہا:

''نہیں، تم سمرسٹ ماہم ہو۔''

منٹو نے کہا:

''تم ابن خلدون ہو۔''

اور دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔

جب منٹو پر اس کی کتابوں میں فحاشی کا متن ہونے کی بنا پر مقدمہ چلا تو سرکاری گواہوں میں ایک عمر رسیدہ ہندو اخبار نویس تھے، جو روزانہ اخبار ''پربھات'' (لاہور) کے ایڈیٹر تھے۔ ان کا نام نانک چند نازؔ تھا۔ جب منٹو کی طرف سے وکیل نے جرح شروع کی تو وہ سٹپٹا گئے۔ انہیں منٹو کی دو کتابیں پکڑا دی گئیں اور کہا گیا کہ ان میں سے فحش الفاظ نکال کر

دکھائیں۔ بے چارے پھنس گئے کہ فحاشی ''الفاظ'' میں نہیں ہوتی، سچوایشن میں ہوتی ہے۔
ورق الٹنے پلٹنے کے بعد کہنے لگے:

''جیسے کہ یہ لفظ ہے۔'عاشق!!'

وکیلِ دفاع نے پوچھا: ''اگر یہ فحش ہے تو اس کا کوئی نعم البدل بتائیں۔''

منٹو کی رگ ظرافت پھڑک اٹھی۔ بولے:

''اچھا ''عاشق'' فحش ہے، تو اس کی جگہ ''یار'' کیسا رہے گا؟''

ایک قہقہہ پڑا اور جج بھی اس میں شامل ہوگیا۔

سعادت حسن منٹو نے کافی لوگوں کے سکیچ لکھے ہیں اور اس سلسلے میں ان کی کتاب ''گنجے فرشتے'' کافی مشہور ہے۔

جب ان سے احمد ندیم قاسمی کا کیریکٹر سکیچ لکھنے کی فرمائش کی گئی تو وہ اداس ہو کر نہایت بجھے بجھے لہجہ میں کہنے لگے: ''قاسمی کا سکیچ؟ وہ بھی کوئی آدمی ہے، جتنے صفحے چاہو سیاہ کرلو، لیکن بار بار مجھے یہی جملہ لکھنا پڑے گا:

''قاسمی بہت شریف آدمی ہے، قاسمی بہت شریف آدمی ہے۔''

جب منٹو کے افسانہ ''بُو'' پر کچھ بااخلاق لوگ بد کے اور معاملہ عدالت تک پہنچا تو ایک ادیب نے منٹو سے کہا:

''لاہور کے کچھ سرکردہ بھنگیوں نے اربابِ عدالت سے شکایت کی ہے کہ آپ نے ایک افسانہ ''بُو'' لکھا ہے، جس کی ''بدبُو'' دُور دُور تک پھیل گئی ہے۔''

منٹو نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: ''کوئی بات نہیں، میں ایک افسانہ ''فینائل'' لکھ کر ان کی شکایت رفع کردوں گا۔''

ایک روز منٹو صاحب بڑی تیزی سے ریڈیو اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہو رہے تھے کہ وہاں برآمدے میں مڈگارڈوں کے بغیر ایک سائیکل دیکھ کر لمحہ بھر کے لئے رک گئے، اور پھر دوسرے ہی لمحے ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں مسکراہٹ کی ایک چمکیلی سی لہر دوڑ گئی اور وہ چیخ چیخ کر کہنے لگے۔ "راشد صاحب، راشد صاحب، ذرا جلدی سے باہر تشریف لایئے۔" شور سن کر ن۔م۔ راشد کے علاوہ کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک اور ریڈیو اسٹیشن کے دوسرے کارکن بھی ان کے گرد آ جمع ہوئے۔

"راشد صاحب، آپ دیکھ رہے ہیں اسے!!" منٹو نے اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ بغیر مڈگارڈوں کی سائیکل! خدا کی قسم سائیکل نہیں، بلکہ حقیقت میں آپ کی کوئی نظم ہے۔"

جگر مرادآبادی لاہور تشریف لے گئے تو کچھ مقامی ادیب و شاعر نیاز حاصل کرنے ان کی قیام گاہ پر پہنچے۔ جگر نہایت اخلاص اور تپاک سے ہر ایک کا خیر مقدم کر رہے تھے کہ اتنے میں سعادت حسن منٹو نے آگے بڑھ کر جگر صاحب سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا: "قبلہ، اگر آپ مرادآباد کے جگر ہیں، تو یہ خاکسار لاہور کا گردہ ہے۔"

ایک بار عبدالمجید بھٹی احمد ندیم قاسمی کے مکان پر انہیں اپنے نئے ناول کا مسودہ سنا رہے تھے کہ اتنے میں وہاں منٹو صاحب آ گئے، آتے ہی انہوں نے بلند آواز کے ساتھ قاسمی صاحب سے کچھ پیسے مانگے۔ بھٹی صاحب نے منٹو کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے نہایت انکسار سے کہا: "منٹو صاحب، میں نے ایک ناول لکھا ہے، قاسمی صاحب کو سنا رہا ہوں۔ بیٹھیے آپ بھی سنیے۔"

''لاحول ولا۔''، منٹو نے کہا: ''میں اور تمہارا ناول سنوں، تم بھی عجیب ہونق انسان ہو، کیا مجھے بھی قاسمی کی طرح کوئی بزدل اور شریف آدمی سمجھ لیا ہے۔''

سعادت حسن منٹو کے ایک دوست نے ایک دن ان سے کہا:
''منٹو صاحب، پچھلی بار جب آپ سے ملاقات ہوئی تھی تو آپ سے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی تھی کہ آپ نے مے نوشی سے توبہ کرلی ہے، لیکن آج مجھے یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا ہے کہ آج آپ نے پھر پی ہوئی ہے۔''
منٹو نے جواب دیا:
''بھئی تم درست کہہ رہے ہو، اُس دن اور آج کے دن میں فرق صرف یہ ہے کہ اُس دن تم خوش تھے اور آج میں خوش ہوں۔''

منٹو اور اشکؔ میں عام طور پر ٹھنی رہتی تھی۔ منٹو ہر روز اشکؔ کے بارے میں کوئی نہ کوئی لطیفہ مشہور کر دیتا تھا۔ اس زمانے میں یہ لطیفہ بہت مشہور تھا۔
اوپندر ناتھ اشک نے ایک بلی پال رکھی تھی وہ صبح صبح اپنی پیاری بلی کو ہمسایوں کے گھروں میں بھیج دیتا ہے۔ بلی کہیں نہ کہیں سے دودھ کے دو چار گھونٹ پی کے لوٹتی ہے تو اشکؔ اسے دبا کے دودھ نکال لیتا ہے اور اس دودھ سے چائے بنتی ہے جو اشک اور اس کا خاندان اپنے ناشتے میں پیتا ہے۔

ایک بار ہوٹل میں منٹو صاحب نے مدہوشی کے عالم میں کئی گلاس اور پلیٹیں توڑ دیں۔ جب بیرا بل لے کر آیا تو ان کی آنکھوں میں ذہانت عود کر آئی۔ ''اس بل میں ٹوٹے

ہوئے گلاسوں اور پلیٹوں کی قیمت کیوں شامل کی گئی ہے؟'' انھوں نے بیرے سے پوچھا۔ ''صاحب یہاں کا دستور یہی ہے۔'' ''اچھی بات۔'' اور یہ کہہ کر منٹو صاحب خاموشی سے بل ادا کر کے چل دیے۔

تقریباً ایک ہفتے بعد وہ اسی ہوٹل میں پھر سے موجود تھے، ان کے احباب اب اس لمحے کا انتظار کر رہے تھے، جب وہ ایک دم بہک جائیں گے لیکن وہ بہکنے کی بجائے ایک دم چلا اٹھے۔ ''سانپ............ارے سانپ۔'' ان کی چیخ پکار سن کر بار کی جامد فضا میں کھلبلی کی ایک لہر دوڑ گئی اور پھر سانپ کو دیکھ کر وہ ہنگامہ ہوا کہ خدا کی پناہ! سراسیمہ ہو کر بھاگنے والوں نے کرسیاں اور میزیں اوندھی کر دیں۔ اس اثنا میں کھانے کی کئی پلیٹیں اور گلاس بھی اس افراتفری کی نذر ہو گئے۔

جب سانپ مارا جا چکا اور قدرے سکون ہوا تو منٹو نے بیرے سے بل طلب کیا اور پھر بل کو دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں مخصوص ذہانت چمکنے لگی۔ ''آج آپ نے بل میں ٹوٹے ہوئے گلاسوں اور پلیٹوں کی قیمت شامل کیوں نہیں کی؟'' ''وہ تو سانپ کی وجہ سے ٹوٹی ہیں جناب! اس میں کسٹمروں کا کیا قصور؟'' اور جب منٹو اپنے دوستوں کے ساتھ باہر جانے لگے تو انھوں نے منیجر کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ''پچھلی مرتبہ جب آپ کی پلیٹیں ٹوٹی تھیں تو آپ نے کھانے پینے کے اخراجات کے علاوہ کراکری کے تین چار روپے چارج کر لیے تھے اور آج جب آپ کی پلیٹیں ٹوٹی ہیں تو مجھے یہ تین روپے آپ کو ادا کرنے کی بجائے یہاں آنے سے پہلے ایک سپیرے کو دینے پڑے ہیں۔

جب سعادت حسن منٹو لاہور کے دماغی شفاخانے میں زیر علاج تھے تو ایک دن اُن کی بیوی کھانا لے کر وہاں آئی۔ ''یہ کیا ہے؟'' منٹو نے سالن کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''مرغ کا گوشت ہے۔'' اس کی بیوی نے جواب دیا۔ منٹو نے پلیٹ بغور دیکھتے ہوئے پوچھا: ''لیکن مرغ کی ٹانگ کہاں ہے۔''

اس کی بیوی نے بتایا کہ مرغ کی ٹانگ کھانے کی ڈاکٹر نے اجازت نہیں دی۔ صرف مرغ کے شوربے ہی سے کھانا کھانے کے لیے کہا ہے۔ منٹو نے یہ بات سن کر سیخ پا ہوتے ہوئے کہا: ''واہ یہ بھی عجیب بات ہے۔ مرغ کی ٹانگ کے بغیر مرغ کا گوشت کیا معنی رکھتا ہے۔ مرغ کی ٹانگ ہی تو محاورے میں استعمال ہوتی ہے۔'' بیوی نے بہت کوشش کی کہ منٹو کھانا کھالے لیکن منٹو اپنی بات پر بضد رہا۔ وہی مرغ کی ایک ٹانگ۔

کہانی مکمل ہوگئی تو مسودہ جیب میں ڈال کر منٹو گھر سے باہر نکلے اور حسبِ عادت ایک خالی تانگے کی پچھلی سیٹ پر نیم دراز ہو گئے۔ ''کہاں جانا ہے صاحب؟'' تانگے والے نے پوچھا۔ ''انارکلی'' منٹو نے جواب دیا۔ تانگا چلنے لگا۔ راستے میں عینک کے موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے سے ان کی مضطرب آنکھیں ہر راہ چلتے کو دیکھ رہی تھیں۔ دفعتاً ان میں چمک پیدا ہوئی اور تانگا رُکوا دیا۔ ایک پبلیشر سے راستے ہی میں ملاقات ہوگئی لیکن اس کے پاس سے پانچ کے نوٹ کے سوا اور کچھ ہاتھ نہ آسکا۔ تانگا پھر چلنے لگا اور آخر ایک رسالے کے دفتر کے سامنے جا رُکا۔ انھوں نے اُتر کر پانچ کا نوٹ کوچوان کے ہاتھوں میں تھما دیا۔

''صاحب ریزگاری نہیں ہے۔'' کوچوان نے کہا۔ ''یہ کیا بکواس ہے؟ خیر میں سامنے دفتر میں جا رہا ہوں، باقی پیسے وہیں پہنچا دینا۔'' اتنا کہہ کر وہ لپک کر دفتر میں داخل ہو گئے۔ ''آیئے آیئے قبلہ منٹو صاحب! ایک منحنی سے نوجوان نے اُٹھ کر خیر مقدم کیا۔ اور منٹو نے کھٹ جیب سے کہانی کا مسودہ نکالتے ہوئے کہا:

''لو میری جان! تمہارے رسالے کے لیے بڑی ہپ ٹلا کہانی لکھی ہے لیکن اس کے معاوضے کی مجھے فوراً ضرورت ہے، کہاں ہے وہ فرادِ اعظم تمہارا آقائے محترم!'' ''اس کی کیا پوچھتے ہیں آپ منٹو صاحب!'' نوجوان نے تلملاتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''سالا صبح سے غائب ہے مجھے خود پیسوں کی سخت ضرورت ہے، پچھلے مہینے کی پوری تن خواہ بھی کم بخت نے ابھی تک نہیں دی۔ بدنصیبی کی انتہا یہ ہے کہ پنواڑی تک نے اب اُدھار دینا بند کر دیا ہے، صبح

سے بیڑیوں سے کام چلا رہا ہوں، سگریٹ تک کے لیے پیسے نہیں ہیں۔''

اس مرتبہ اپنی جھلاہٹ کا مظاہرہ منٹو نے خاموشی سے کیا، چند لمحے کچھ سوچتے رہے اور پھر دوڑ کر باہر نکل آئے ان کے پیچھے پیچھے ایڈیٹر بھی آ گیا۔ باہر تانگے والے کا نشان تک نہ تھا۔ دو تین بار زور زور سے آوازیں دینے کے بعد جب منٹو نے دیکھا کہ وہ ''مرد ہشیار'' نو دو گیارہ ہو چکا ہے تو وہ کسی اَن جانی مسرت کے احساس سے مسکرا دیئے اور ایڈیٹر سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: ''تم نے سچ کہا تھا چغد! واقعی تم بدنصیب آدمی ہو ورنہ تم جیسے بدنصیبوں کو سگریٹوں کی جگہ بیڑیاں ہی پینی چاہئیں۔''

''جی ہاں، جی ہاں!'' اور اس کے بعد ایک دَم اس ایڈیٹر نے چونکتے ہوئے پوچھا: ''کیوں، وہ کیوں منٹو صاحب؟'' اور منٹو نے اُسے بتایا کہ کس طرح وہ اپنی تمام پونجی مبلغ پانچ روپے نوٹ کی صورت میں تانگے والے کو دے کر آئے تھے اور وہ ریزگاری کے بہانے نوٹ ہی پر ہاتھ صاف کر گیا۔ ''تو بدنصیب تو آپ ہوئے حضرت!'' ایڈیٹر کے چہرے کی زردی سے تھکی تھکی مسکراہٹ جھانکنے لگی۔

''عجیب بوگس آدمی ہو، ارے میاں! میں نے سوچا تھا کہ تانگے والا کرایہ کاٹ کر جو پیسے دے گا وہ تمہیں سگریٹوں کے لیے دے دوں گا، اتنی سی بات نہیں سمجھے، بدنصیب نہیں تو اور کیا ہو؟''

ایک روز ریڈیو سٹیشن پر ''منٹو'' بڑے بیزار بیٹھے تھے کسی نے پوچھا: ''خیریت تو ہے؟'' بولے: ''سخت بدتمیز اور جاہل ہیں یہاں کے لوگ۔ میں ٹیلیفون ریسیو کر کے کہتا ہوں: ''منٹو'' تو ادھر سے وہ حیران ہو کر پوچھتا ہے: ''ون ٹو؟'' میں کہتا ہوں: ''ون ٹو'' نہیں، ''منٹو!!''۔ تو وہ کہتا ہے: ''بھنتو؟''

سعادت حسن منٹو نے ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈٹ جواہر لعل نہرو کے نام ایک خط لکھا، جس کا کچھ حصہ حسب ذیل ہے:''پنڈت جی! یہ میرا پہلا خط ہے جو میں آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں ۔ آپ ماشاء اللہ امریکیوں میں بڑے حسین تصور کیے جاتے ہیں لیکن میں کہتا ہوں کہ میرے خدوخال کچھ ایسے بُرے نہیں کہ اگر میں امریکہ جاؤں تو شاید مجھے بھی حُسن کا رُتبہ عطا ہو جائے گا لیکن آپ ہندوستان کے وزیر اعظم ہیں اور میں پاکستان کا عظیم افسانہ نگار۔ آپ نے ہمارے دریاؤں کا پانی بند کر دیا۔ آپ کی دیکھا دیکھی آپ کی راج دھانی کے پبلشرز نے میری رائیلٹی بند کر دی اور مجھ سے پوچھے بنا دھڑا دھڑ میری کتابیں خود ہی چھاپے جا رہے ہیں۔ یہ بھی کوئی شرافت ہے۔

میں تو یہ سمجھتا تھا کہ آپ کی وزارت میں بے ہودہ حرکت ہو ہی نہیں سکتی مگر آپ کو فوراً معلوم ہو سکتا ہے کہ دہلی، لکھنو اور جالندھر میں کتنے پبلشروں نے میری کتابیں جائز طور پر چھاپی ہیں۔ فحش نگاری کے الزام میں مجھ پر کئی مقدمے چل چکے ہیں مگر یہ کتنی بڑی زیادتی ہے کہ دہلی میں آپ کی ناک کے عین نیچے وہاں کا ایک پبلشر میرے افسانوں کا مجموعہ ''منٹو کے فحش افسانے'' کے نام سے چھاپتا ہے۔ میں نے کتاب ''گنجے فرشتے'' لکھی اس کو آپ کے بھارت کے پبلشر نے ''پردے کے پیچھے'' کے عنوان سے شائع کر دیا۔

''آ رہا ہوں آپ کے پاس'' میں نے یہ نئی کتاب لکھی ہے، اس کا دیباچہ یہی خط ہے جو میں نے آپ کے نام لکھا ہے۔ اگر یہ کتاب بھی آپ کے یہاں نا جائز طور پر چھپ گئی تو خدا کی قسم میں کسی نہ کسی دن دہلی پہنچ کر آپ کو گریباں سے پکڑ لوں گا پھر چھوڑوں گا نہیں آپ کو۔ آپ کے ساتھ ایسا چمٹوں گا کہ آپ ساری عمر یاد رکھیں گے۔ ہر روز صبح آپ سے کہوں گا کہ نمکین چائے پلائیں، ساتھ ایک کلچہ ہو، شلجموں کی شب دیگ تو خیر ہر ہفتے کے بعد ضرور ہو گی۔ یہ کتاب چھپ جائے تو اس کا نسخہ آپ کو بھیجوں گا۔ اُمید ہے کہ آپ اس کی رسید سے مجھ کو ضرور آگاہ کریں گے۔''

دستخط

سعادت حسن منٹو

ملتان کے ایک نامور وکیل تھے، آغا شیر احمد خاموش جو منٹو کے دو افسانوں (کالی شلوار، کھول دو) کو پڑھے بغیر ایک افسانہ خیال کرتے تھے۔ منٹو جو پروفیسروں کو منافق خیال کرتا تھا (آپ نے اس کا افسانہ 'آٹھ دن' ضرور پڑھا ہوگا) مگر جب اس پر مشکل وقت آتا تھا اور خاص طور پر جب اس کے افسانوں پر فحاشی کے ضمن میں مقدمے چلائے جاتے تھے تو وہ اپنی صفائی کے گواہوں میں پروفیسر فیض احمد فیض، پروفیسر عابد علی عابد اور پروفیسر محمد دین تاثیر کو بلایا کرتا تھا۔ ان کے ایک مقدمے میں استغاثے کے ایک معروف گواہ کی بدحواسی کا ذکر بھی ملتا ہے جو ایک ادبی رسالے کے مدیر تھے۔ جب ان پر جرح کی گئی کہ افسانہ ''ٹھنڈا گوشت'' میں کون سا فحش لفظ استعمال ہوا ہے تو انہوں نے عدالت میں لفظ ''یار'' پر انگلی رکھ دی، جس پر مہدی علی خان جیسے باذوق مجسٹریٹ بھی ہنس پڑے اور کہا ''یار تم نے لفظ بھی پکڑا تو کون سا پکڑا؟''

منٹو کی ایک کتاب مشہور فلمسٹار نور جہاں سے متعلق شائع ہوئی تھی۔ 'نور جہاں سرورِ جاں' اس کتاب کو پڑھنے کے بعد ابراہیم جلیس نے منٹو سے کہا:

''تمہاری یہ کتاب ''نور جہاں سرورِ جاں'' محض بکواس ہے، اب تم ہتک، بابو گوپی ناتھ، موذیل اور کھول دو جیسے لافانی افسانے کیوں نہیں لکھتے؟ فلمسٹاروں کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟''

منٹو نے کہا:

''یار، اب گوپی ناتھ کے مقابلے میں فلمسٹار آسانی سے بک جاتے ہیں۔''

علی سردار جعفری

ولادت: ۲۹ر نومبر ۱۹۱۳ء (بلرام پور، گونڈہ، یوپی)

وفات: یکم اگست ۲۰۰۰ء (بمبئی)

اچھا مقرر کبھی سامعین کو اکتاہٹ کا شکار ہونے نہیں دیتا۔ اسے متاثر کرنے کا فن آتا ہے۔ نہ وہ سامعین کی ''ہوٹنگ'' سے بدحواس ہوتا ہے۔ نہ ان کے فقروں کا بُرا مان کو اسٹیج چھوڑتا ہے بلکہ ایک قابل وکیل کی طرح ترکی بہ ترکی جواب دیتا ہے اور اپنی حاضر جوابی سے محفل کو زعفران زار بنا دیتا ہے۔

سردار جعفری میں ایک اچھے مقرر کی یہ خصوصیت بھی موجود تھی۔ ممبئی کے سامعین اس بات کے گواہ ہیں کہ ۱۹۸۰ء کے مراد آباد کے فساد کے بعد قومی یک جہتی کے موضوع پر ایک جلسہ رات کے ساڑھے نو بجے عوامی ادارہ مومن پورہ ممبئی میں منعقد ہوا۔ جب سردار جعفری مائیک پر آئے تو اس وقت رات کے ٹھیک بارہ بج رہے تھے۔ باذوق سامعین میں سے کسی نے شوخی سے آواز لگائی:

''سردار صاحب بارہ بج چکے ہیں۔''

انہوں نے برجستہ جواب دیا:

''میں وہ سردار نہیں ہوں۔''

اور ہال قہقہوں سے گونج اٹھا۔

علی گڑھ نمائش میں کُل ہند مشاعرہ ہو رہا تھا۔ یہ بات ہماری طالب علمی کے زمانے کی ہے۔ بڑے بڑے نامور شعرا حضرات اسٹیج پر جلوہ افروز تھے۔ بیدی صاحب مشاعرے کی نظامت کر رہے تھے۔ وہ اپنی تقریر کر ہی رہے تھے، کہ لوگوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔

ان کو اچھا نہیں لگا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو علی سردار جعفری صاحب آ رہے تھے۔ چونکہ علی سردار صاحب کا نام شاعروں کی فہرست میں نہیں تھا اور وہ اچانک علی گڑھ آئے تھے۔ ان کے میزبان یونیورسٹی انجینئر اویس صاحب، ان کو لے کر مشاعرے میں آئے تھے۔ اے ایم یو کے لڑکے سردار صاحب کو بہت پسند کرتے تھے۔ اس لئے ان کی اچانک آمد پر شور برپا ہونے لگا خوشی کا۔

بیدی صاحب نے کھڑے ہو کر سردار جعفری صاحب کا استقبال کیا اور کہا:

''یوں تو سردار جعفری صاحب بہت اچھے شاعر ہیں اور بہت مقبول بھی ہیں۔''

لڑکوں نے کہا۔ ''نہیں!''

اس پر بیدی صاحب بے برجستہ کہا:

''کیونکہ ان کے نام کے ساتھ بھی سردار لگا ہوا ہے۔''

یہ سن کر بہت دیر تک قہقہوں کی بارش ہوتی رہی۔

کسی مشاعرے میں شاعر سردار جعفری جب اپنا کلام سنانے پہنچے تو کہنے لگے: ''حضرات! میں عاشقانہ رنگ میں کچھ اشعار عرض کرنا چاہتا ہوں حالاں کہ میرا اصلی رنگ یہ نہیں۔'' قریب ہی جگن ناتھ آزاد بیٹھے تھے۔ انھوں نے بلند آواز سے کہا: ''حضرات! دراصل ان کا اصلی رنگ معشوقانہ ہے۔''

ساحر لدھیانوی کے انتقال پر ۲۵ / اکتوبر ۱۹۸۰ء کو مہاراشٹر کالج میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس میں سردار جعفری اور عصمت چغتائی دونوں شریک تھے۔ عصمت چغتائی نے حسب معمول شوخی اور بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس وقت جو تقریر کی اس کے چند جملے یہ تھے۔

''ساحر اپنے معاشقوں میں ناکام رہے۔ ان کی شاعری خوب صورت ہے مگر وہ خود کسی زاویے سے خوب صورت نہیں تھے۔ توبہ توبہ ان کی ناک تو بالکل توتے کی چونچ تھی۔''

سردار جعفری اس بے موقع گفتگو کو برداشت نہ کر پائے اور بیچ میں وہ بول پڑے:

''نہیں نہیں۔ ساحر بالکل بدصورت نہیں تھے۔ وہ نہایت نفاست پسند، خوش لباس اور خوش وضع انسان تھے۔ البتہ ان کی ناک کچھ بڑی اور Bend تھی۔''

عصمت آپا نے پھر وہی راگ الاپا۔

''مجھے تو وہ بالکل اچھے نہیں لگتے تھے۔''

''وہ آپ کا معیارِ حسن ہے۔''

سردار جعفری نے فوراً جواب دیا۔

''حقیقت تو یہ ہے کہ کنواری ہی نہیں شادی شدہ عورتیں بھی ساحر پر مرتی تھیں۔''

اس نوک جھوک کا نتیجہ ظاہر تھا۔ اس غم کے موقع پر بھی لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ سردار جعفری کو جلسے کی نزاکت کا احساس ہوا اور انہوں نے ان کی تعزیتی تقریر میں گفتگو کو یوں موڑ دیا۔

''یہ عصمت چغتائی ہیں۔ انہوں نے کبھی کسی کو نہیں بخشا۔ یہاں تک کہ اپنے آپ کو بھی، مجھے اس بات کا پورا خیال ہے کہ یہ تعزیتی جلسہ ہے اور ایک کالج میں ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے یہاں سامعین میں اکثریت طلبہ و طالبات کی ہے ورنہ میں تو مثالوں کے ساتھ ساحر کو Defend کر سکتا ہوں۔''

سلام بن رزاق رقم طراز ہیں:

''جعفری صاحب اکثر تقریر کرتے ہوئے اپنے لمبے بالوں کو اپنی فراخ پیشانی سے اس ادا سے سرکاتے تھے کہ ایک تصویر سی کھنچ جاتی تھی۔ نوجوانوں کو ان کا یہ اسٹائل بے حد پسند تھا۔ ہمارے ایک شناسا نے جنہیں شاعری سے تھوڑا شغف تھا، جعفری صاحب کی تقلید

میں انہیں کی طرح کے لمبے لمبے بال رکھ لیے۔ ہم اسے اکثر رسول حمزہ کا ایک ٹکرا سنا کر چھیڑا کرتے تھے کہ تم نے لیوٹالسٹائی کی طرح ایک ٹوپ تو خرید لیا ہے مگر اس جیسا سر کہاں سے لاؤ گے۔''

ایک دعوت میں جب صاحبِ خانہ کا کم سن بچہ مسلسل کئی منٹوں تک اسرارالحق مجازؔ کو گھورنے کے بعد گنگنانے لگا تو کسی نے مجاز سے کہا:

''مجاز صاحب! یہ بچہ بڑا ہو کر یا تو شاعر بنے گا، یا............''

مجازؔ نے گرہ لگاتے ہوئے جملہ مکمل کر دیا ''یا سردار جعفری''

ایک دن کیفی اعظمی فرمانے لگے کہ دُنیا جانتی ہے سردار جعفری صاحب بہت بولتے ہیں بلکہ بولتے ہی چلے جاتے ہیں۔ مخاطب شاذ ہی بولنے کا موقع حاصل کر پاتا ہے۔ دو صاحبوں کے مکالموں کے درمیان بھی ان کا لقمہ دینا جاری رہتا ہے۔ صحیح اور غلط کی آوازیں گونجتی رہتی ہیں لیکن آپ کو یہ سن کر حیرت ہو گی کہ ایک روز مَیں مسلسل بولتا رہا اور سردار ہاتھوں کے کنول میں اپنا چہرہ دھرے خاموشی سے میری باتیں سنتے رہے، نہ کچھ بولے اور نہ کہیں ٹوکا۔ اس لیے کہ اس روز ان کے داڑھ میں درد ہو رہا تھا۔

سبطِ حسن لکھتے ہیں:

''ایک شام ہم تینوں فرنگی محل جانے کے لیے گھر سے نکلے۔ ارادہ یہ تھا کہ امین آباد تک پیدل چلیں گے اور وہاں سے ایک ایک آنے میں یکہ کر لیں گے۔ امین آباد پہنچے تو صدیق بک ڈپو کے مالک صدیق صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ صدیق صاحب بڑے مجلسی

اور ادب نواز شخص تھے۔ اور کیا مجال جو کوئی اہل قلم ان سے ملے بغیر امین آباد سے گزر جائے۔ وہ ہم لوگوں کو لے کر دکان کے سامنے پارک میں جو بنچ پڑی تھی اس پر بیٹھ گئے اور باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں اور مجاز پارک سے نکل کر یکے پر بیٹھے اور فرنگی محل چل دیے۔ وہاں فرحت اللہ انصاری مرحوم کی مہمان نوازیوں سے شکم سیر ہو کر جب ہم دس بجے رات کے وقت صدیق بک ڈپو پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ بحث بدستور جاری ہے۔ سردار نے بس اتنا پوچھا کہ تم کہاں چلے گئے تھے؟۔۔۔ مجاز نے بڑی معصومیت سے کہا۔ کہیں نہیں، ذرا پان کھانے۔"

جاں نثار اختر

ولادت: ۸ فروری ۱۹۱۴ء (گوالیار)

وفات: ۱۸ اگست ۱۹۷۶ء (ممبئی)

علی گڑھ یونیورسٹی میں اسرار الحق مجازؔ اور جاں نثار اختر کلاس فیلو رہے ہیں۔ دونوں کے پاس انٹرمیڈیٹ تک سائنس تھی۔ Zoologoy کی کلاس تھی۔ مینڈک پن کیے ہوئے ڈش میں دونوں کے سامنے رکھے تھے۔ جنہیں جاں نثار اور مجاز دوسرے کلاس فیلوز سے Dissect کرا رہے تھے اور خود باتوں میں محو تھے۔ ان کے پروفیسر نے دیکھ لیا۔ قریب آ کر کہنے لگے: ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ دونوں شاعر حضرات نے سائنس کیوں لے رکھی ہے، آپ سے کس گدھے نے کہا تھا۔''

جاں نثار اختر تو چپ رہے، مجاز نے برجستہ کہا: ''کہا تو والد صاحب نے تھا۔''

مجاز کی نظم ''آوارہ'' اولاً ''ساقی'' کے سالنامے میں شائع ہوئی تھی جس میں ''رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے۔۔۔'' والے بند کا دوسرا مصرعہ یوں تھا۔

چل کسی گل ریز و گوہر بیز کا شانے میں چل

اس کے کچھ دن بعد جاں نثار اختر نے ایک تین شعر کا قطعہ کہا جس کا پہلا شعر تھا:

پھر ہوں اک شہنازِ لالہ رخ کے کاشانے میں آج
رات کٹ جائے گی پھر رنگین افسانے میں آج

مجاز کو ''شہنازِ لالہ رخ'' کی ترکیب بے حد پسند آئی۔ دوسرے دن مجاز نے جاں نثار اختر سے کہا: ''اختر! میں نے تمہاری ''شہنازِ لالہ رخ'' کو چرا لیا ہے اور ''چل کسی گل ریز گوہر بیز کاشانے میں چل'' کی بجائے ''چل کسی شہنازِ لالہ رخ کے کاشانے میں چل'' کر دیا ہے۔''

مجاز کی یہ نظم ''آہنگ'' میں ''کسی شہنازِ لالہ رخ'' کی ترمیم کے ساتھ شائع ہوئی اور

جب جاں نثار اختر اپنا پہلا مجموعہ مرتب کرنے بیٹھا تو انھوں نے اپنا قطعہ مجاز کے نام سے منسوب کر دیا اور خود اس ترکیب کو مجاز سے لینے کا الزام لے لیا۔ ''می آرم اعترافِ گناہِ نکردہ را۔''

زہرہ سے جاں نثار اختر کا تعارف مجاز کی ہی معرفت ہوا تھا۔ مجاز کی نظموں میں یہ نام بار بار آتا ہے، مجاز نے اس سے عشق کیا، اس کے لیے زدوکوب سہی، اس کے لیے آوارہ و بدنام ہوا اور آخرکار اعصاب جواب دے گئے۔ زہرہ ظاہر ہے جاں نثار اختر سے ذہنی طور پر تو متعارف تھیں۔ اب ذاتی تعارف ہوا تو اپنی آٹوگراف بک اٹھا لائیں اور جاں نثار کے آگے بڑھا دی۔ جاں نثار اختر نے شرارتاً اس پر جگر کا شعر لکھ کر قوسین میں جگر کا نام لکھا اور نیچے اپنے دستخط کر دیے۔

نظر فروز رہے، سامعہ نواز رہے
زہے مجاز کہ وہ زینتِ مجاز رہے

مجاز نے آٹوگراف بک لے کر دیکھنا چاہا کہ جاں نثار نے کیا لکھا ہے لیکن آٹوگراف بک مجاز کو نہیں دیکھنے دی گئی۔

ایک دفعہ جاں نثار اختر نے فراق گورکھپوری سے کہا کہ آپ لوگ اس شعر کو فحش کہتے ہیں:

اب جواں ہو چلی ہے شامِ وصال
خلوتِ نیم شب ہے کپڑے اُتار

کہنے لگے: ''شعر کہنے کی طرح شعر پڑھنے کا بھی سلیقہ ہوتا ہے، اگر دوسرے مصرعے کو بلند آواز سے پڑھا جائے گا تو شعر یقینی فحش ہو جائے گا۔''

جاں نثار اختر نے دوسرا مصرعہ خود پڑھ کے بتایا اور ''کپڑے اُتار'' نہایت سرگوشانہ انداز میں ادا کیا اور کہنے لگے: ''دیکھو اب شعر فحش نہیں رہا۔''

آل احمد سرور جس زمانے میں لکھنؤ یونیورسٹی میں پروفیسر تھے، جاں نثار اختر اور صفیہ اختر ان سے ملنے کے لیے ان کے گھر گئے۔ ان کی بیگم صاحبہ بھی موجود تھیں۔ اُردو تنقید نگاری موضوعِ بحث بن گئی۔ صفیہ کہنے لگیں:

''میں سرور صاحب سے کہتی ہوں کہ آپ اس وقت تک اچھے تنقید نگار نہیں بن سکتے جب تک ''بہ حیثیتِ مجموعی'' لکھنا نہیں چھوڑیں گے، نقاد کے لیے ایک واضح رائے رکھنا ضروری ہے۔''

بیگم سرور کہنے لگیں کہ

''میں نے سرور صاحب کا نام ہی ''بحیثیتِ مجموعی'' رکھ دیا ہے۔''

جس پر خود سرور صاحب بھی بہت محظوظ ہوئے۔

عسکری صاحب بھوپال کے مشہور وکلا میں سے تھے اور اُردو ادب کے دلدادہ۔ اُردو میں انیس اور فارسی میں فردوسی کے عاشق تھے۔ ایک ناونوش کی محفل میں انیس کے مرثیے سنائے چلے جا رہے تھے۔ جاں نثار اختر بھی موجود تھے، تفریحاً کہہ دیا: ''انیس کو آپ اتنا کیوں اچھالتے ہیں، تین سو پینسٹھ دن میں بے چارا دس دن کا تو شاعر ہے۔''

وہ سنجیدگی سے خفا ہو گئے اور جاں نثار اختر سے یک لخت ملنا چھوڑ دیا۔ دو سال گزر گئے، ایک مشاعرے کے سلسلے میں سردار جعفری بھوپال آئے، انہیں اس بات کا پتا چلا تو عسکری صاحب کو لے کر جاں نثار اختر کے گھر لے آئے، صلح تو ہو گئی لیکن جاں نثار صاحب کو اس کی قیمت یہ ادا کرنی پڑی کہ چار گھنٹے تک ان سے انیس کے مرثیے سننے پڑے۔

احسان دانش

ولادت: ۱۹۱۴ء (کاندھلہ، مظفر نگر)

وفات: ۲۲ مارچ ۱۹۸۲ء (لاہور)

احسان دانش سے کسی مشاعرہ کے مہتمم نے التجا کی کہ ہم ایک مشاعرہ کر رہے ہیں۔ اس میں شامل ہو کر ممنون فرمایئے۔ احسانؔ نے پوچھا: ''معاوضہ کتنا ملے گا؟'' مہتمم نے نہایت انکساری سے جواب دیا: ''آپ اس مشاعرہ میں معاوضہ کے بغیر شمولیت فرما کر کمترین کو شکر گزار فرمائیں۔''

احسانؔ نے اس کی انکساری سے قطعاً متاثر نہ ہوتے ہوئے کاروباری انداز میں کہا: ''بندہ نواز! آپ کو ممنون فرمانے میں مجھے کوئی اعتراض نہ تھا اور میں کسی معاوضے کے بغیر آپ کے مشاعرہ میں چلا جاتا بشرطیکہ میرے شعروں سے میرے بچوں کا پیٹ بھر سکتا۔ آپ خود ہی غور فرمایئے قبلہ کہ گھوڑا گھاس سے محبت کرنے لگے تو کیا آپ کے شکریے پر زندہ رہ سکے گا۔''

راولپنڈی کے ایک مشاعرے کے لیے لاہور سے کچھ شعرا کو مدعو کرنے کے لیے منتظمین حضرات احسان دانش سے ملے۔ انھوں نے سوال کیا: ''آپ کتنے پیسے دے سکیں گے؟'' منتظم نے کہا: ''آپ کو تین سو روپے دیے جا سکیں گے، یہ زیادہ سے زیادہ معاوضہ ہے، اسی رقم کو قبول فرماتے ہوئے خان بہادر، حفیظ جالندھری نے بھی شمولیت کا وعدہ فرمایا ہے۔''

''حضرت! کہاں خان بہادر اور کہاں ایک مزدور شاعر احسان! لیکن بندہ نواز، میں

اپنے مقام سے کسی قیمت پر نہیں گرنا چاہتا اور پانچ سو روپے سے ایک پائی کم نہ لوں گا۔ میں بہت چھوٹا اور حفیظ صاحب لاکھ بڑے شاعر سہی، لیکن یاد رکھیے دودھ کتنی مفید اور عمدہ شے ہے، لیکن گلی گلی میں فروخت ہوتا ہے اور شراب انتہائی بدنام اور مہلک ہونے کے باوجود اپنے مقام ہی پر بکتی ہے۔''

ایک محفل میں جہاں عطش درانی بھی شریک تھے، مقبول جہانگیر نے سیّد عشرت زیدی کی وفات کی خبر سناتے ہوئے احسان دانش سے کہا: ''جوش صاحب تو ضرور اس کے جنازے پر آئے ہوں گے؟'' اس پر احسان صاحب چہک کر بولے: ''اونہہ! وہ شخص تو اپنے جنازے پر نہ آئے گا، عشرت کے جنازے پر اُسے کیا خاک آنا ہے؟''

اسی محفل میں کسی جھوٹے شخص کا ذکر چھڑا تو احسان دانش فرمانے لگے:

''اجی اُس کی کیا بات کرتے ہیں، وہ شخص تو صرف اتنا جھوٹ بولتا ہے، جتنا نمک میں آٹا!'' اور ساری محفل اسی نئی ترکیب ''نمک میں آٹا'' کو سن کر کشتِ زعفران بن گئی۔

ڈاکٹر تاثیر اور احسان دانش ریل میں اکٹھے سفر کر رہے تھے۔ ایک اسٹیشن پر تاثیر کے ایک دوست اسی ڈبے میں داخل ہوئے۔ تاثیر نے ان سے احسان دانش کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ آپ ہیں اُردو کے مشہور شاعر، مصورِ فطرت، شاعرِ مزدور، حضرت احسان دانش کاندھلوی۔ اس دوست نے پوچھا وہی جو مزدوروں کے بارے میں نظمیں لکھتے رہتے ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں وہی۔ وہ دوست کہنے لگا: ''خدا کی قسم! ان کی نظمیں پڑھ کر یہ جی چاہتا ہے کہ صبح کو اٹھتے ہی ہر مزدور کے سر پر سو جوتے لگائے جائیں۔''

شروع میں احسانؔ دانش اپنا نام احسانؔ بن دانش لکھا کرتے تھے (یعنی پسرِ دانش، جو ان کے والد کا نام تھا) ایک مشاعرے میں (جب احسان ابھی زیادہ مشہور نہیں ہوئے تھے) ان کی ملاقات ایک اور شاعر سے ہوئی، تو انھوں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے اپنا نام احسان بن دانش بتایا۔ اس پر وہ صاحب بولے: ''تخلص تو میرا بھی احسانؔ ہے، لیکن الحمدللہ میں ''بن دانش'' نہیں ہوں۔ غالباً اسی کے بعد احسانؔ نے ''بن'' کا لفظ نام سے نکال دیا اور نام احسانؔ دانش ہو گیا۔

راجندر سنگھ بیدی

ولادت: ۱؍ستمبر ۱۹۱۵ء (سیالکوٹ)

وفات: نومبر ۱۹۸۴ء (ممبئی)

مشہور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی ریل میں سفر کر رہے تھے۔ دورانِ سفر ٹکٹ چیکر نے ان سے ٹکٹ مانگا تو بیدی صاحب نے اپنی جیبیں ٹٹولیں مگر ٹکٹ کا پتا نہیں تھا۔

ٹکٹ چیکر بیدی صاحب کو پہچانتا تھا۔ کہنے لگا ''مجھے آپ پر بھروسہ ہے، آپ نے یقیناً ٹکٹ خریدا ہوگا۔''

بیدی صاحب پریشانی سے بولے: ''بھائی! بات آپ کے بھروسے کی نہیں، مسئلہ تو سفر کا ہے۔ اگر ٹکٹ نہ ملا تو یہ کس طرح معلوم ہوگا کہ مجھے اُترنا کہاں ہے؟''

راجندر سنگھ بیدی کی باتیں بہت دلچسپ اور بے ساختہ ہوتی تھیں۔ ایک بار دہلی کی ایک محفل میں بشیر بدر کو کلام سنانے کے لیے بلایا گیا تو بیدی صاحب نے جو میرے برابر بیٹھے تھے۔ اچانک میرے کان میں کہا:

''یار! ہم نے دربدر، ملک بدر اور شہر بدر تو سنا تھا، یہ بشیر بدر کیا ہوتا ہے؟''

لاہور میں راجندر سنگھ بیدی کے گھر کے آگے ایک بھینس بندھی رہتی تھی، جس پر ان کے دوستوں کو اعتراض تھا۔

ایک دن ایک دوست نے سختی سے اعتراض کیا تو انھوں نے کہا:

''بھئی، ہندو کا محبوب جانور گائے ہے اور مسلمانوں کا محبوب جانور اونٹ ہے۔ کیا ہم سکھوں کو اپنے محبوب جانور بھینس کو پالنے کا حق نہیں ہے؟''

راجندر سنگھ بیدی نے اپنی فلم پھاگن میں وحیدہ رحمان کو ماں کا رول دیا تو فلم ریلیز ہونے کے بعد وحیدہ رحمان نے بیدی صاحب سے شکایتاً کہا کہ آپ نے مجھ پر ایسا ٹھپہ لگا دیا ہے اب میں آیندہ کسی فلم میں لیڈنگ رول میں نہیں آسکوں گی۔

اس پر بیدی صاحب نے جواب دیا:

''میں نے تمھیں صرف فلم میں ماں بنایا ہے، حقیقی زندگی میں ہرگز نہیں۔''

ایک بار راجندر سنگھ بیدی کے ایک مسلمان دوست نے بڑے بھولپن سے پوچھا:

''بیدی صاحب! یہ جو سکھوں کے بارہ بجتے ہیں، اس میں کہاں تک صداقت ہے؟''

بیدی صاحب نے اقرار کیا کہ کافی صداقت ہے۔

''پھر تو آپ کے بھی بارہ بجتے ہوں گے؟''

''ضرور بجتے ہیں۔'' بیدی صاحب نے جواب دیا۔

''اس وقت کیا ہوتا ہے؟''

''یہی کہ کوئی غلط حرکت کرنے کو جی چاہتا ہے۔''

مسلمان دوست مسکرایا:

''اچھا، اب یہ بتائیے کہ یہ بارہ دوپہر کے وقت بجتے ہیں یا رات کو؟''

بیدی صاحب نے صداقت بیان کرتے ہوئے کہا:

''دوپہر کو، کیوں کہ اس وقت گرمی بہت ہوتی ہے اور گرمی میں سر کے لمبے لمبے بالوں اور پگڑی کی وجہ سے ہر سکھ بوکھلا سا جاتا ہے۔''

مسلمان دوست نے محظوظ ہوتے ہوئے کہا:

''لیکن ہمارے محلے میں ایک سکھ رہتا ہے، وہ تو رات کے بارہ بجے بوکھلاتا ہے۔''

''وہ اصلی سکھ نہیں ہوگا۔''

بیدی صاحب نے جواب دیا:

''مسلمان سے سکھ بنا ہوگا۔''

سیّد ضمیر جعفری

ولادت: ۱ جنوری ۱۹۱۶ء (جہلم، پنجاب)

وفات: ۱۲ مئی ۱۹۹۹ء (اسلام آباد)

ایک تقریب میں پاکستان کے فوجی حکمراں جنرل ضیاء الحق کی فرمائش پر ضمیر جعفری نے ایک شعر سنایا۔ قریب کھڑے افراد نے شعر کی تعریف کی، لیکن حفیظ جالندھری گویا ہوئے:

''یار ضمیر! جب تم میرے ماتحت کام کرتے تھے، اس وقت تو اتنے اچھے شعر نہیں کہہ پاتے تھے۔''

''جی ہاں! یہ سب آپ سے دُوری کا فیض ہے۔'' ضمیر جعفری نے برجستہ جواب دیا۔

مشہور مزاح نگار سیّد ضمیر جعفری اور ان کے چند ساتھی فوجی افسر اپنا طبی معائنہ کروانے کے لیے ایک ملٹری ہاسپٹل میں شریک ہوئے تو انہیں اچنبھا ہوا کہ ایک ہفتہ گزرنے کے باوجود اُن کے وارڈ میں کسی نرس کا گزر نہیں ہوا۔ اتفاق سے جب ایک میٹرن وہاں سے گزری تو ضمیر جعفری نے پوچھا کہ ''بڑی بی کیا بات ہے ہم لوگ ایک ہفتہ سے اس وارڈ میں ہیں لیکن تم نے آج تک کسی نرس کو اس وارڈ میں نہیں بھیجا۔'' یہ سن کر میٹرن نے کہا: ''میں خوب جانتی ہوں اس وارڈ میں جتنے بھی لوگ ہیں وہ سب کے سب تندرست اور توانا ہیں۔''

سیّد ضمیر جعفری صاحب ایک روز عبدالعزیز خالد کے مہمان ہوئے اور وہاں کچھ لکھنے کے لیے انہوں نے خالد صاحب سے ان کا قلم مستعار لیا، مگر تین چار دفعہ کوشش کے باوجود یہ قلم ان سے نہ چل سکا۔ اس پر انہوں نے خالد صاحب کو قلم واپس کرتے ہوئے کہا: ''یہ آپ رکھ لیجیے، اسے غالباً آسان اردو لکھنے کی پریکٹس نہیں ہے۔'' (عبدالعزیز خالد خاصی مشکل زبان استعمال کرتے ہیں۔)

ایک بار ضمیر جعفری نے ایک کالم لکھ کر حسرت کو دکھایا۔ وہ کالم چراغ حسن حسرت کو پسند نہ آیا۔ ضمیر جعفری نے کسی احتجاج کے بغیر وہ کالم پرزے پرزے کر ڈالا۔ اگلے روز جب چراغ حسن حسرت نے اخبار دیکھا تو ضمیر جعفری سے دریافت کیا: ''حضرت وہ آپ کا کالم کہاں ہے؟''

اس پر ضمیر جعفری نے انھیں بتایا کہ انھوں نے حسرت کی ناپسندیدگی کی بنا پر اُسے ضائع کر دیا۔ تب میجر حسرت نے سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر کہا: ''کیا فرق پڑتا ہے مولانا!...... چھاپ دیتے...... دیگر لغویات بھی تو چھپتی ہی رہتی ہیں۔''

ایک دن ضمیر جعفری صاحب بک کارنر پر تشریف لائے، دیوہیکل پرسنالٹی اور بوسکی کا تروتازہ شلوار قمیص سوٹ پہنے، خوشبوئیں لگائے مہک رہے تھے۔ شاہد حمید پوچھنے لگے:

''شاہ جی! آج کدھر کی تیاری ہے؟''

بولے: ''تجھے نہیں پتہ آج میں گورنمنٹ گرلز کالج کے فنکشن میں مہمانِ خصوصی ہوں۔ بوڑھا ہوں تو کیا ہوا، جانا تو خواتین کی محفل میں ہے۔'' اور پھر اپنا یہ شعر سنا دیا:

ربط ہے تازہ ہر اِک چہرے ہر اِک منظر کے ساتھ
میں بڑھاپے کو نہ آنے دوں کا کیلنڈر کے ساتھ

لاہور ایئرپورٹ پر روانگی سے قبل سیّد ضمیر جعفری صاحب نے ایک دوست کا ایڈرس نوٹ کرنے کے لیے اپنی جیبیں ٹٹولیں مگر قلم ان کے پاس نہیں تھا۔ پاس کھڑے عبدالعزیز خالد نے جعفری صاحب کی ضرورت کو بھانپتے ہوئے اپنا قلم پیش کیا۔ جعفری صاحب نے نوٹ بک کھولی مگر قلم نہ چلا۔ دو ایک بار چھڑک کر بھی دیکھا لیکن قلم نے کام نہ کیا۔ پاس کھڑے منیر نیازی نے پوچھا: ''کیوں، اس میں روشنائی نہیں ہے کیا؟'' جعفری صاحب بولے: ''شاید سیاہی خشک ہوگئی ہے۔''

اس پر منیر نیازی نے شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ عبدالعزیز خالد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ''نہیں روشنائی تو ہے لیکن شاید یہ آسان اُردو نہیں لکھتا۔'' (عبدالعزیز خالد صاحب خاصی مشکل زبان استعمال کرتے ہیں۔)

سیّد ضمیر جعفری جن دنوں سیٹلائٹ ٹاؤن میں رہتے تھے۔ ایک جیسے مکانوں کے نقشے کی وجہ سے ایک شام بھول کر کسی اور کے دروازے پر دستک دے بیٹھے۔ دروازہ کھلنے پر دوسری عورت کو دیکھ کر جعفری صاحب کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ فوراً واپس پلٹے۔ اس فعل کا ذکر جب جعفری صاحب نے اپنے ایک دوست سے کیا تو اس نے سوال کیا:

''جعفری صاحب! آپ کو غلط گھر کا دروازہ کھٹکھٹانے پر شرمندگی نہیں ہوئی؟''

جعفری صاحب نے جواب دیا:

''مجھے اس فعل پر تو کوئی شرمندگی نہیں ہوئی، لیکن یہ دیکھ کر ضرور تکلیف ہوئی کہ دروازہ کھولنے والی عورت میری بیوی سے بھی بدصورت تھی۔''

مجید لاہوری

ولادت: ۱۹۱۷ء (گوجرانوالہ)

وفات: جون ۱۹۵۷ء (کراچی)

مجید لاہوری خاصے بھاری بھرکم جثے کے مالک مزاحیہ شاعر ہیں۔ ان سے کسی دوست نے پوچھا:

''مجید صاحب ! آپ دنیا بھر کے لوگوں کا مضحکہ اڑاتے ہیں، کبھی آپ کا بھی کسی نے یوں مذاق اڑایا ہے۔''

''ہاں ....ایک بار ....'' مجید نے جواب دیا۔

''ہوا یوں کہ میں دفتر سے نکلا سڑک پر آیا، ایک رکشہ والے کو ہاتھ کے اشارے سے روکا اور کہا کیماڑی لے چلو گے؟''

رکشہ والے نے میرے تن وتوش کو غور سے دیکھا، یوں جیسے وزن کر رہا ہو اور پھر بولا:

''لے چلوں گا مگر دو پھیروں میں۔''

تقسیم ملک کے بعد ہند و پاک مشاعرے میں شرکت کے لیے مجید لاہوری پہلی بار دلی آئے تو ان کے شاعر دوستوں نے نہایت گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا۔ ایک حاکم قسم کے شاعر نے پیش کش کی۔ ''مجید صاحب! اگر آپ فرمائیں تو کل اپنی گاڑی میں بٹھا کر آپ کو یہاں کا مغل گارڈن دکھالاؤں۔''

مجید صاحب اس وقت سرور کے عالم میں تھے، قریب ہی کھڑے مولانا بسمل

شاہجہانپوری کے شانے پر اپنا بھاری بھرکم ہاتھ رکھتے ہوئے بولے: ''تمہارا مغل گارڈن تو میں نے یہیں دیکھ لیا ہے میرے بھائی! اس شاعر کو دیکھو، ظالم مغل بھی ہے۔'' .... اور مولانا کی غیر معمولی طور پر گھنی داڑی کی طرف اشارہ کرتے اپنی بات مکمل کر دی............ اور............گارڈن بھی............''

ایک نوجوان شاعر نے لاہور کے مشاعرے میں حضرت مجید لاہوری سے متعارف ہوتے ہوئے درخواست کی۔ ''حضرت اپنا پتا تو بتا دیجیے تا کہ جب کبھی کراچی آنا ہوتو ملاقات سے محروم نہ رہوں۔'' مجید لاہوری مرحوم بری سنجیدگی سے بولے: ''نوٹ کر لیجیے۔'' ''ارشاد!'' شاعر نے اپنی ڈائری کھولی۔ ''شاعر نمبر ایک ہزار تین سو چالیس'' مجید لاہوری نے جواب دیا۔

ایک بار دہلی میں پاکستان کے اخبار نویسوں کا استقبال بڑے تپاک سے کیا گیا۔ وہاں گوپی ناتھ امن نے ایک استقبالیہ نظم پڑھی، جس میں ایک شعر تھا۔ ؎

اسیرِ دام محبت ہیں سارے دل والے
ہمارے گھر میں وہی دام لے کے آئے ہیں

اس پر مجید لاہوری نے کہا: ''نیا جال لائے پرانے شکاری۔''

مجید لاہوری مرحوم بہت موٹے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک لطیفہ ہوا۔ رشید اختر ندوی اور وہ ایک سائیکل رکشہ پر بیٹھے کہیں جا رہے تھے۔ ایک تو مجید لاہوری بذات خود گوشت پوست کا پہاڑ تھے دوسرا رشید اختر ندوی بھی ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ بے چارہ رکشہ والا رکشہ کھینچتے کھینچتے تھک گیا اور ہانپنے لگ گیا۔

راستے میں ایک جگہ مجید نے رکشہ رکوایا اور اُتر کر پان لینے لگ گئے۔ رشید اختر کو نہ جانے کیا سوجھی وہ بھی رکشہ سے اتر کر ٹہلنے لگ گئے۔ رکشہ والے نے یہ موقع غنیمت جانا۔ پیڈل پر جلدی سے پاؤں مارا اور یہ جا، وہ جا۔ مجید نے اسے یوں فرار ہوتے دیکھا تو پکار کر کہا: ''ارے بھائی کہاں جا رہے ہو، اپنے پیسے تو لیتے جاؤ۔'' اس پر رکشہ والے نے پیچھے دیکھے بغیر کہا: ''صاحب اگر زندگی رہی تو کہیں اور سے کما لوں گا۔''

جگن ناتھ آزاد

ولادت: ۵ دسمبر ۱۹۱۸ء (عیسیٰ خیل، ضلع میانوالی)

وفات: ۲۴ جولائی ۲۰۰۴ء (نئی دہلی)

جگن ناتھ آزاد اٹلانٹا تشریف لے گئے تو چائے دیتے ہوئے میزبان نے پوچھا کہ آزاد صاحب چینی کتنی لیں گے؟

جواب دیا: ''اپنے گھر تو ایک ہی چمچ لیتا ہوں لیکن باہر چائے پینے پر ۳، ۲ چمچ سے کم چینی نہیں لیتا۔''

اس پر میزبان نے ایک چمچ چینی ان کی چائے میں ڈالتے ہوئے کہا:

''آزاد صاحب، اسے اپنا ہی گھر سمجھئے۔''

اٹلانٹا میں جگن ناتھ آزاد، محسن بھوپالی اور حمایت علی شاعرؔ اسٹون فاؤنڈیشن دیکھنے نکلے اور وہاں تصویریں لینے لگے۔ حمایت علی شاعر نے تصویر لیتے ہوئے کہا کہ کیمرہ تصویر تو لے لے گا، لیکن ہے ذرا پُرانا۔

آزاد نے برجستہ کہا:

''ہمیں کون سا خریدنا ہے۔''

جگن ناتھ آزاد پہلی دفعہ پاکستان پہنچے۔ مدیر ''نقوش'' محمد طفیل نے ان کے اعزاز میں دعوت دی جس میں احتراماً صرف سبزیاں ہی رکھی گئیں۔ کھانا ختم ہونے کے بعد جگن ناتھ آزاد نے طفیل صاحب کو مخاطب کر کے کہا:

''اگر آپ کو سبزیاں ہی کھانی تھیں تو پھر آپ کو پاکستان بنانے کی کیا ضرورت تھی؟''

جگن ناتھ آزاد کے پاکستان تشریف لے جانے پر ان کے اعزاز میں ''شام ہمدرد'' کا اہتمام کیا گیا۔ اسٹیج پر آغا بابر اور ڈاکٹر زمان غزنوی بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ مولوی محمد سعید نے اپنی کتاب ''آہنگ بازگشت'' جو ان دنوں شائع ہوئی تھی، آزاد صاحب کو پیش کرنے کے لیے بریگیڈیئر گلزار احمد سے گزارش کی۔ بریگیڈیئر صاحب نے ڈاکٹر زمان غزنوی کو آزاد سمجھتے ہوئے نہ صرف مولوی صاحب کی کتاب پیش کر دی، بلکہ ان کی ادبی خدمات کے ذکر کے علاوہ ان کے والد محترم تلوک چند محرومؔ کے شعر

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے
کہتے ہیں یہ آرام گہ نور جہاں ہے

کی تعریف کرتے رہے اور جگن ناتھ آزادؔ پاس بیٹھے مسکراتے رہے۔

جگن ناتھ آزاد، بسمل سعیدی ٹونکی، ساحرؔ ہوشیار پوری اور کچھ دوسرے شعرا مدراس کے ایک مشاعرے میں شمولیت کے لیے ریل کے ڈبے میں سفر کر رہے تھے۔ آزاد صاحب درمیان میں لیٹے ہوئے تھے۔ انہوں نے آواز دے کر نیچے لیٹے بسملؔ صاحب سے کہا: ''کچھ پڑھنے کے لیے دیجیے۔'' بسملؔ صاحب نے اپنا مجموعہ کلام ''نشاط غم'' انہیں پیش کر دیا۔

آزاد صاحب نے ورق گردانی کی اور پسند نہ آنے پر کتاب بند کر دی۔ دوبارہ سامنے لیٹے ہوئے شاعر سے کوئی کتاب مانگی۔ انہوں نے جو کتاب پیش کی وہ راجستھانی شاعروں کے بارے میں تھی۔ وہ کتاب بھی آزادؔ صاحب کو پسند نہ آئی، لہٰذا واپس کرتے ہوئے بے خیالی میں یہ کہا:

''اس سے تو ''نشاط غم'' ہی بہتر تھی۔''

صابر کرائیلا کو جب علم ہوا کہ عنقریب ہمارے اور حمایت علی شاعر کے صاحبزادگان بھی تعلیم کی غرض سے امریکا آنے والے ہیں تو انہوں نے اطلاعاً بتایا کہ جاں نثار اختر کے بیٹے ڈاکٹر سلمان بھی یہاں رہتے ہیں اور بہت کامیاب ڈاکٹر ہیں۔ جگن ناتھ آزاد کہنے لگے: ''بہت پہلے کی بات ہے، بمبئی میں جاں نثار اختر کے یہاں میں اور بڑے بھائی بیٹھے تھے۔ اتنے میں سلمان آ گیا۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ وہ ڈاکٹر ہے۔ میں نے اسے فوراً اپنی تکلیف بتائی، بیٹا میری دائیں پنڈلی میں کبھی کبھی شدید درد اٹھتا ہے۔ اُس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا: ''انکل، میں تو دماغی امراض کا ڈاکٹر ہوں۔'' میں نے یہ سن کر کہا: ''اچھا، تو جاؤ اپنے ابا کا علاج کرو۔''

قتیل شفائی

ولادت: ۲۴ دسمبر ۱۹۱۹ء (ہری پور ہزارہ)

وفات: ۱۱ جولائی ۲۰۰۱ء (لاہور)

ہری پور ہزارہ میں قتیل شفائی اور ان کے دوستوں نے 1939ء میں ڈاکٹر اقبال کی پہلی برسی کے سلسلے میں مشاعرے کا اہتمام کیا۔ چندہ اکٹھا کرنے کے سلسلے میں جب ایک دکان دار کو انہوں نے بتایا کہ ڈاکٹر اقبال کی برسی کے سلسلے میں یہ مشاعرہ ہو رہا ہے تو اس نے آب دیدہ ہو کر پوچھا، ''کیا سچ مچ ڈاکٹر اقبال وفات پا گئے ہیں؟''

اس پر قتیل شفائی نے حیران ہو کر پوچھا، ''کیا آپ انہیں جانتے تھے؟''

اس پر انہوں نے فرمایا، ''کیوں نہیں۔ ابھی دو سال پہلے میری بھینس بیمار ہو گئی تھی، انہوں نے بڑی توجہ سے اس کا علاج کیا تھا۔''

یہ سننا تھا کہ سب کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔

قتیل شفائی نے ایم اسلم سے اپنی اولین ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے کہا:

''کتنی عجیب بات ہے کہ میں اسلم صاحب کی کوٹھی میں ان سے ملنے گیا، لیکن اس کے باوجود ان کا تازہ افسانہ سننے سے بال بال بچ گیا۔''

''یہ ناممکن ہے۔'' ''سنیئے تو؟..........'' قتیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہوا یوں کہ انتہائی خاطر و مدارت کے بعد جب اسلم صاحب اپنا نیا افسانہ سنانے کے موڈ میں آنے لگے تو انہوں نے کہا:

''قتیل صاحب! آپ کی کچھ نظمیں ادھر میری نظر سے گزری ہیں، آپ تو خاصے معقول شاعر ہیں، مگر نہ جانے عام لوگ ہر ترقی پسند شاعر کے بارے میں کیوں بدگمانی کا شکار ہیں۔''

اور اسلم صاحب کی اس بات کے جواب میں مَیں نے نہایت انکسار سے کام لیتے ہوئے کہا:

''جی ہاں! واقعی عام لوگ بہت غلط فہمیاں پیدا کر دیتے ہیں، دیکھئے نا! اب آپ کے بارے میں بھی یوں تو یہی بات مشہور ہے کہ آپ ہر نو وارد مہمان کی تواضع کرنے کے بعد اپنا کوئی نیا افسانہ ضرور سناتے ہیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔''

قتیل شفائی سے ایک شاعر نے طنزیہ لہجے میں پوچھا:

''کیوں صاحب آپ مشاعرے میں گا کر پڑھتے ہیں۔''

قتیل شفائی نے ان کا سوال کا جواب دینے کے بجائے خود انھیں کے لہجے میں سوال کر دیا۔

''اور کیا آپ رو کر پڑھتے ہیں؟''

چند بے تکلف شعرا میں پیروڈیوں کا ذکر ہو رہا تھا، ایک صاحب کہنے لگے:

''پیروڈیوں میں اصل لطف یہ ہے کہ اصل شعر میں معمولی سے تصرف کے بعد مزاح پیدا کیا جائے۔''

قتیل شفائی نے یہ سنا تو بولے:

''میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں، پیروڈی میں ایک آدھ لفظ کی ترمیم ہی سے نئی بات پیدا کرنی چاہیے، عدم کا ایک شعر ہے۔ ؎

شاید مجھے نکال کے پچھتا رہے ہوں آپ
محفل میں اس خیال سے پھر آ گیا ہوں میں

میں نے اس کی پیروڈی یوں کی ہے۔

شاید مجھے نکال کے کچھ کھا رہے ہوں آپ
محفل میں اس خیال سے پھر آ گیا ہوں میں

یہ شعر سن کر سبھی شاعر کھلکھلا کے ہنس دیئے لیکن چند لمحوں بعد ایک شاعر قتیل صاحب سے مخاطب ہوکر گویا ہوئے۔

''قتیل صاحب! آپ کا ایک شعر ہے:

اڑتے اڑتے آس کا پنچھی دُور افق میں ڈوب گیا
روتے روتے بیٹھ گئی آواز کسی سودائی کی

میں نے اس کی پیروڈی کی ہے لیکن ایک کی بجائے دو لفظوں میں ترمیم کی ہے:

اڑتے اڑتے آس کا پنچھی دُور افق میں ڈوب گیا
روتے روتے بیٹھ گئی آواز قتیل شفائی کی

سوریا سے ایک شاعر صلاح الاسیر تشریف لائے، قتیل شفائی نے جوان دنوں پاکستان رائٹرز گلڈ کے سکریٹری تھے، ان کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ میں نے دیکھا ہے کہ اسیر بے زنجیر بھی ہوتے ہیں اس پر اسیر صاحب نے برجستہ جواب دیا:

''میں نے بھی پہلا قتیل دیکھا ہے جو قتل ہونے کے بعد بھی زندہ ہے۔''

دورِ ایوب شاہی میں قتیل شفائی، فارغ بخاری اور رضا ہمدانی ''ماہنامہ سنگ میل'' نکالا کرتے تھے۔ ایک مضمون کی اشاعت پر پاکستان سرکار بوکھلا اٹھی تو وارنٹ گرفتاری جاری

ہو گئے۔ پولیس نے تینوں کو گرفتار کرنے کے بعد حکام پاکستان کو رپورٹ بھیجی کہ تینوں ایڈیٹر گرفتار کر لیے گئے لیکن ہنوز ادارہ تحریر مفقود الخبر ہے اس کی تلاش جاری ہے۔

فلم اسٹار انیل کپور کے ہاں ایک دعوت میں قتیل شفائی، اظہر جاوید اور جاوید اختر شریک تھے۔ دورانِ گفتگو جاوید اختر قتیل سے کہنے لگے کہ پنجاب کے لوگوں نے اُردو زبان کا بیڑہ غرق کر دیا ہے۔ مثلاً ہم لوگ کہتے ہیں کہ ''کھانا کھایئے'' اسی کو پنجاب کے لوگ کہیں گے۔ ''کھانا کھائیں'' اس پر قتیل صاحب نے برجستہ جواب دیا کہ کھانا کھائیں کہنے سے کھانے کے ذائقہ میں کیا کوئی فرق پڑ جاتا ہے۔ اس پر سب لوگ کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔

کراچی میں چند دوست بیٹھے ہوئے گپ شپ لگا رہے تھے۔ ان میں نسیم درانی ایڈیٹر ''سیپ'' کراچی، عبید اللہ علیم، جمیل اختر خاں، سرشار صدیقی اور لاہور سے وہاں گئے ہوئے اظہر جاوید ایڈیٹر ''تخلیق'' بیٹھے تھے۔ ادھر ادھر کی باتوں میں ذکر چلا اردو زبان و بیاں کے سلسلے میں۔

''ہمیں یہ اعتراف ہے کہ پنجاب والوں نے بہت خدمات کی ہیں اور اردو زبان کو وقار بخشا ہے، مگر یار! ان میں سے بڑے بڑے لکھنے والوں کا شین قاف درست نہیں ہوتا۔''

اظہر جاوید نے کہا، ''مجھے یہ تو نہیں پتا کہ شین قاف درست ہے یا نہیں، مگر ہمارا قاف شین درست ہی نہیں، ماشاء اللہ تن درست بھی ہے۔''

سب نے چونک کر پوچھا، ''قاف شین......؟ کیا مطلب؟''

اظہر جاوید نے بڑے اطمینان سے جواب دیا، ''قاف شین، یعنی قتیل شفائی۔''

مشاعروں میں 'ہوٹنگ' ایک روایت چلی آ رہی ہے۔جب سامعین میں ادبی ذوق کا رچاؤ بھی ہو تو 'ہوٹنگ' بھی پُرلطف بن جاتی ہے۔ایک مشاعرے میں قتیل شفائی اپنی غزل سنا رہے تھے۔

انگڑائی پہ انگڑائی لیتی ہے رات جدائی کی

اتفاقاً ایک مصرعہ اٹھاتے وقت آواز پھٹ گئی،مجمع میں سے برجستہ آواز آئی:

گاتے گاتے بیٹھ گئی آواز قتیل شفائی کی

ساری محفل میں بیٹھے لوگ ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہونے لگے۔
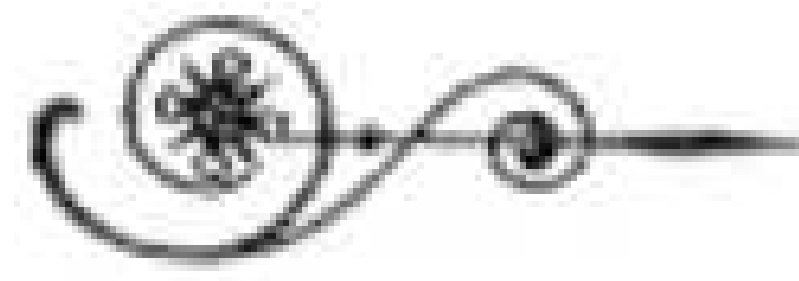
ساحر لدھیانوی

ولادت: ۸ مارچ ۱۹۲۱ء (لدھیانہ)

وفات: ۲۵ اکتوبر ۱۹۸۰ء (بمبئی)

مجروح سلطان پوری نے ساحر لدھیانوی کی کسی بات پر برہم ہوتے ہوئے کہا: ''یاد رکھو ساحر! جب تم مر جاؤ گے تو اردو کا کوئی ترقی پسند ادیب تمہارے جنازے کے ساتھ نہیں جائے گا۔'' ساحر نے فی الفور جواب دیا: ''مجھے اس کا کوئی غم نہیں، لیکن میں پھر بھی ہر ترقی پسند ادیب کے جنازے میں شریک ہوں گا۔''

ساحر لدھیانوی کے کسی دوست نے اس سے کہا: ''یار ساحر اب تو تمہاری زندگی ہر اعتبار سے آسودہ ہے، اب تمہیں شادی کر لینی چاہیے۔'' ساحر نے غیر معمولی طور پر سنجیدہ ہو کر جواب دیا: ''چاہتا تو میں بھی ہوں، لیکن کسی ایسی خاتون کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں، جو کنواری ہونے کے ساتھ ساتھ انٹلیکچوایل بھی ہو، لیکن ٹریجڈی یہ ہے کہ دونوں صفات ایک ہی وقت میں کسی ایک لڑکی میں نہیں ملتیں، یا تو وہ کنواری ہوتی ہے یا انٹلیکچوایل۔''

ساحر لدھیانوی نے جاں نثار اختر سے کہا: ''یار جاں نثار! اب تم کو ''پدم شری'' خطاب مل جانا چاہیے۔'' جاں نثار نے پوچھا: ''کیوں؟'' ساحر نے جواب دیا: ''اب مجھ سے اکیلے یہ ذلت برداشت نہیں ہوتی۔''

ساحر لدھیانوی نے اپنی نظم ''فن کار'' کے ایک شعر میں عرصہ گاہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ کسی نے اس لفظ پر اعتراض کیا تو ساحر نے ایک صاحب کی معرفت علامہ تاجور نجیب آبادی سے استفسار کیا۔ علامہ تاجور نے کہا: ''اگر کسی دوست نے استعمال کیا ہے تو صحیح ہے، اگر کسی دشمن نے لکھا ہے تو غلط ہے، میں دونوں طرح ثابت کر سکتا ہوں۔''

دو ادیب آپس میں بحث کر رہے تھے، ایک کہہ رہا تھا شاعر اور ادیب کو ہمیشہ اپنی چشم دید چیزوں ہی کے متعلق لکھنا چاہیے، ورنہ اس کا ادب حقیقت سے دُور ہو گا۔

ساحر لدھیانوی نے یہ بات سنی تو مسکرا کر کہا:

''میرا چشم دید تجربہ ہے کہ اُردو ادیبوں کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔''

وہ ادیب صاحب ساحر کی طرف دیکھنے لگے تو ساحر نے اپنی بات کو آگے بڑھتے ہوئے کہا: ''اُردو میں صرف دو ہی چیزیں کام کی لکھی گئی ہیں، کہانیوں میں قحطِ بنگال کے متعلق کرشن چندر کی کہانی ''ان داتا'' اور نظموں میں ساحر لدھیانوی کی نظم ''تاج محل''۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ کبھی کرشن چندر بنگال گئے ہیں اور نہ میں نے ابھی تک تاج محل دیکھا ہے۔''

ساحر لدھیانوی کی مالی حالت شروع میں بہت اچھی نہ تھی۔ دوستوں کو بھی جب کوئی ضرورت ہوتی تو ساحر سے بے تکلف مدد مانگ لیا کرتے تھے۔

ایک دوست نے جب ایک دن ساحر سے ایک نئی کہانی کے لئے کچھ پیسوں کا ارادہ ظاہر کیا تو چٹکی لینے کے لئے ساحر نے تپاک سے مسکراتے ہوئے جواب دیا:

''دوستو، کبھی کبھی صرف مجھ سے ملنے کے لیے بھی آجایا کرو۔''

جاں نثار اختر، سردار جعفری کے پاس عرب بلڈنگ گئے ہوئے تھے۔ سردار جعفری نے خبر سنائی کہ جذبی کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل گئی ہے۔ ساحر نے برجستہ کہا:

"بالآخر ہر مریض ڈاکٹر بن جاتا ہے۔"

سردار جعفری نے پوسٹ کارڈ اٹھایا اور جذبی کو لکھا کہ تمہارے بارے میں ساحر نے ایسا کہا اور پھر ساحر سے کہا تم تصدیق کے لیے دستخط کر دو۔ ساحر نے دستخط کر دیئے اور وہ کارڈ اسی وقت پوسٹ کر دیا۔

اس بات کے دو سال بعد جب جاں نثار اختر اور ساحر، علی گڑھ گئے تو مسعود علی ذوقی نے سب کی دعوت کی، وہاں جذبی بھی موجود تھے لیکن ساحر سے بات نہیں کر رہے تھے۔ ساحر کو یاد آیا تو اس نے جذبی سے ہلکے پھلکے انداز میں معذرت کی تب کہیں جا کے جذبی کا غصہ فرو ہوا۔

تقسیم کے بعد ساحر لدھیانوی کو چوہدری نذیر احمد صاحب کی ہی بدولت ایبٹ روڈ پر ایک بہتر بڑا سرخ رنگ کا مکان ملا، جو کہ ایک دم "نشاط سنیما" کے سامنے تھا۔ ساتھ میں ابن انشا، حمید اختر، عبدالحمید اور احمد راہی نے بھی رہنا تھا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی ساحر نے اونچی چھت اور پرانی کھڑکیوں کو دیکھ کر ابن انشا سے کہا، "دوست یہ تو مجھے کوئی بھوت گھر لگتا ہے۔"

ابن انشا نے اپنی موٹے شیشوں والی عینک کے پیچھے سے آنکھیں گھماتے ہوئے کہا، "اب اس میں بھوت ہی رہیں گے۔"

ساحر لدھیانوی اور اسرار الحق مجازؔ جب ممبئی پہنچے تو یہاں کی رونق اور عالی شان عمارتیں دیکھ کر حیرت میں تھے۔

ساحر نے اپنی پتلی پتلی، لمبی لمبی انگلیوں کو فضا میں لہرا کر نہایت سنجیدہ انداز میں اور تھوڑا جذباتی ہو کر مجازؔ سے کہا ''دیکھو مجازؔ! یہ بمبئی کا ریلوے اسٹیشن ہے۔ کتنی عالی شان عمارت ہے؟ کس طرح بڑے بڑے کھلے اور روشن کمرے ہیں جبکہ اسی بمبئی میں ہزاروں بلکہ لاکھوں مزدور، کیڑے مکوڑوں کی طرح تنگ اور اندھیری کھولیوں میں رہنے پر مجبور ہیں۔ اُنہیں رہنے کے لیے نہ جانے ایسے کمرے کب بنیں گے؟''

مجازؔ نے ساحر ہی کے انداز میں اُداس ہو کر کہا:

''جی ہاں یار ساحرؔ! تم نے ٹھیک ہی تو کہا ہے:

ریلوے والوں نے دولت کا سہارا لے کر

ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

''ادبِ لطیف'' کی ایڈیٹری کا زمانہ ساحر لدھیانوی نے اپنے دوستوں کے ساتھ اسی سرخ مکان کی منزل میں گزارا تھا۔ رات کو فکر تونسوی صوفے پر، عارف عبدالمتین اور ساحر زمین پر اور عبدالحمید اور احمد راہی پلنگ پر سوتے تھے۔

یہ رہائش محض ایک ڈرائنگ روم اور چھوٹا سا کمرہ تھا، جس میں ایک صوفہ سیٹ اور پلنگ کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ ایک کانسی کا بڑا سا پیالہ اور تھا جس میں سارے باری باری پانی پیا کرتے تھے۔

ایک روز ابن انشا آیا تو اس پیالے کو دیکھ کر کہنے لگا۔ ''ارے! یہ تو وہی پیالہ ہے جس میں سقراط نے زہر پیا تھا۔''

جاں نثار اختر لکھتے ہیں:

ساحر کی سب سے مقبول نظم ''تاج محل'' ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ساحر نے جب یہ نظم کہی تھی اس وقت تک صرف تاج محل کی تصویر ہی دیکھی تھی۔ یہ نظم سب سے پہلے ''آج کل'' رسالہ میں شائع ہوئی اور وہ بھی آرٹ پیپر پر۔ نظم تو شائع ہو گئی لیکن ساتھ ہی یعقوب دواشی کا خط بھی موصول ہوا جو اس وقت ''آج کل'' کے ایڈیٹر اور ساحر کے والد کے دوست تھے، جس میں انہوں نے ''برخوردار'' کو ایک طویل فہرست تاریخی عمارات کی بھیجی تھی اور فرمائش کی تھی کہ اب سب باقی عمارتوں پر بھی نظمیں لکھ کر بھیج دو کیوں کہ تاریخی عمارتوں پر تم سے اچھا کوئی نہیں کہہ سکتا۔ اس کے بعد ساحر نے ''نور جہاں کے مزار پر'' تو ایک نظم ضرور کہی لیکن ساری عمارتوں اور مقبروں کا ٹھیکہ وہ ہی کیوں لیتا۔

حال ہی میں بک کارنر جہلم کے پلیٹ فارم سے پہلی مرتبہ شائع ہونے والی ساحر لدھیانوی کی خودنوشت سوانح ''میں ساحر ہوں'' سے چند واقعات ملاحظہ کیجیے:

چودھری صاحب جو رسالہ کے مالک تھے، نے جب پرچہ نکالا تو پہلے صفحے پر ہم دونوں کے نام کچھ اس طرح چھاپے......

ادارت

احمد ندیم قاسمی، ساحر لدھیانوی

''سویرا'' ترقی پسند مصنّفین کا رسالہ تھا اور جیسا کہ میں نے کہا، ہم لوگوں کی سرگرمیوں پر پاکستانی حکومت کی نظر رہتی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ہم لوگ حکومت کے مزاج کے مطابق نہیں لکھتے تھے۔ اس وجہ سے ہر ترقی پسند مصنف کے اوپر حکومت کا عذاب نازل ہوا کرتا تھا۔ انہی دنوں خفیہ پولیس کا ایک آدمی چودھری نذیر کے پاس آیا اور پوچھنے لگا۔

''چودھری صاحب! میں تو پریشان ہو گیا ہوں ڈھونڈتے ڈھونڈتے، وہ جن کے چہرے پر زخم ہے اور عینک لگاتے ہیں، ان کا پتہ تو چل گیا ہے، وہ احمد ندیم قاسمی ہیں اور وہ

دُوسرے جن کا قد لمبا ہے اور چہرے پر معمولی چیچک کے سے داغ ہیں، وہ ہیں ساحرؔ لدھیانوی۔ لیکن اتنے دن ہو گئے مجھے تلاش کرتے کرتے، کمبخت تیسرے آدمی کا پتہ ہی نہیں چل رہا۔''

''بھئی تیسرا کون ہے؟'' چودھری صاحب نے پوچھا۔

''مجھے ابھی تک ادارت نہیں ملا۔'' اس نے جواب دیا۔

جن دنوں ادب میں استحکام کو لے کر بحث چل رہی تھی اور اُردو ادب میں ہو رہی نعرے بازی اور نمائشی شاعری کا تجزیہ کیا جا رہا تھا۔ میں نے کیفی اعظمی کی شاعری پر ایک بھرپور تنقیدی مضمون لکھا اور ادبی ثبوت دے کر یہ ثابت کر دیا کہ کیفی اعظمی پہلے تو شاعر ہی نہیں، اور اگر مان بھی لیں کہ شاعر ہیں تو تیسرے درجے کے۔ یہ مضمون میں نے ''ترقی پسند مصنّفین کی انجمن'' کی ایک میٹنگ کے ہفتہ وار جلسے میں پڑھا۔ جناب سردار جعفری اس جلسہ کے صدر تھے۔ مضمون حیرت انگیز ہونے کے باوجود، خوب پسند کیا گیا۔ سردار جعفری نے اس مضمون کا اثر کم کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی، لیکن ہوا کا رُخ بدل چکا تھا۔ ساری محفل میرے رنگ میں رنگی تھی اور میرے حق میں بھی تھی۔

اگلے ہفتے ترقی پسند مصنّفین کی انجمن کی ایک میٹنگ میں جناب سردار جعفری نے میری شاعری پر ایک مضمون پڑھا۔ اس مضمون میں انہوں نے میری معروف نظم ''تاج محل'' کے بارے میں کہا کہ میری شاعری پر نچلے درجے کی اور گھٹیا شاعری ہے اور تاج محل کو عزت کی نظروں سے دیکھا جانا چاہئے کیونکہ یہ ہمارے قومی ورثے کی علامت ہے۔ میں نے مضمون کو بہت ہی ٹھنڈے دماغ سے سنا (اس دوران تمام سننے والوں میں یہ خوف پیدا ہو چلا تھا کہ اب میرا جواب کیا ہوگا) اور مضمون مکمل ہونے پر میں نے ان سے ٹھنڈے لہجے میں کہا:

''جناب سردار جعفری صاحب! اس مضمون سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ میں شاعر ہی

نہیں ہوں یا گھٹیا شاعر ہوں، لیکن اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ کیفی اعظمی بڑے اور اول درجے کے شاعر ہیں۔''

میرے اس دوٹوک ٹھنڈے مگر زہر آلود طنز سے محفل زعفران زار ہو گئی اور سردار جعفری اور کیفی پر اس کا اثر بہت تیز ہو گیا۔

جب ''کبھی کبھی'' کی کامیابی کا یش جی نے بہت بڑا جشن منایا۔ اس پارٹی میں جب پامیلا چوپڑا نے لتا کے گلے میں ہار ڈالا اور میں نے محسوس کیا کہ یہ تو وہی بات ہوئی کہ میرے الفاظ کو سرے سے نظر انداز کر دیا گیا اور بھری محفل میں صرف آواز کو سراہا گیا ہے۔ میرے ہاتھ میں جام تھا اور میری آواز میں اک ترنگ، میں نے پامیلا سے کہا:

''آپ کو صرف ماں نظر آئی اور یہاں باپ کھڑا ہوا ہے، وہ نظر نہیں آیا۔''
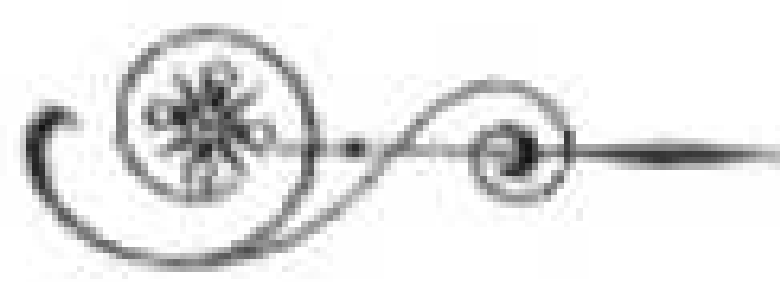
مجتبیٰ حسین

ولادت: ۱؍جولائی ۱۹۲۱ء (سنجر پور، جونپور)

وفات: ۱؍اپریل ۱۹۸۹ء (کراچی)

کنول پرشاد کنول سے ملنے ایک دن مجتبیٰ حسین ان کے دفتر میں گئے تو وہ بہت افسردہ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں اس قدر افسردہ دیکھ کر مجتبیٰ حسین نے دریافت کیا: ''کنول صاحب! کیا بات ہے۔ آج اس قدر افسردہ کیوں ہیں؟''

کنول صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا: ''کیا کہوں یار! کل کی بارش ہمارے علاقے میں اس قدر زیادہ ہوئی کہ ایک سیلاب سا آ گیا اور میرا سارا دیوان بہا لے گیا۔''

اس پر مجتبیٰ حسین نے کہا: ''کنول صاحب! اگر آپ پہلے ہی اپنے دیوان کو دریابُرد کر دیتے تو سیلاب کیوں آتا؟''

مدینہ ہوٹل حیدرآباد کے قریب ہیجڑوں کی بستی تھی۔ چین کے حملے کے بعد فوج میں بھرتی کا دور آیا تو مجتبیٰ حسین بھرتی کرنے والے آفیسر کے پاس بیٹھے تھے۔ کچھ ہیجڑے بھی وہاں گھوم رہے تھے۔ مجتبیٰ نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آفیسر سے کہا:

''آپ ان مشٹنڈوں کو جنگ کے محاذ پر کیوں نہیں بھیجتے؟''

''اگر ہم محاذ پر چلے گئے تو کیا ہمارا کام آپ کریں گے۔'' ہیجڑے نے کولہے مٹکاتے ہوئے مجتبیٰ حسین کو جواب دیا۔

مجتبیٰ حسین نے ایک شخص سے کہا: ''میں نہ ہندو ہوں نہ مسلمان، میں تو صرف ایک انسان ہوں۔''

اس پر وہ شخص بولے: ''جب تک آدمی ہندو یا مسلمان نہ ہو، وہ انسان کیسے بن سکتا ہے؟''

تب مجتبیٰ حسین کہنے لگے: ''لیکن ہندو اور مسلمان بننے کے بعد تو انسان کہاں باقی رہ جاتا ہے۔ گاجر اور مولی میں تبدیل ہو کر رہ جاتا ہے۔''

مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین اپنے اور اجیت کور کے بارے میں ''الغرض'' میں لکھتے ہیں:

پنجابی کی مشہور ادیبہ اور ہماری دوست اجیت کور نہ جانے کیا کیا کرتی رہتی ہیں۔ ایک دن صبح صبح آٹھ بجے، جو ہماری گہری نیند کا وقت ہے، ہمیں فون کیا اور پوچھا: ''یہ بتاؤ، آنے والی کل رات تمہیں بھوک لگے گی یا نہیں؟''

ہم نے کہا: ''اجیت کور جی! یہ آج آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ سویرے سویرے بڑا عجیب وغریب سوال پوچھ رہی ہیں۔ اب ہم نہار منہ آپ کے اس سوال کا کیا جواب دیں۔''

درشت لہجے میں بولیں: ''ہم سکھوں کے پاس ایک شے ہوتی ہے، جسے عقل سلیم کہتے ہیں، وہ تمہارے پاس بالکل نہیں ہے۔ میرے اس آسان سے سوال کا آسان مطلب یہ ہے کہ کل رات کا کھانا تم میرے گھر کھاؤ گے۔''

ہم نے کہا: ''ہم آپ کے گھر کھانا ضرور کھائیں گے، کیونکہ اکثر کھاتے ہی رہے ہیں، لیکن یہ تو بتائیے کہ اس کھانے کا عنوان کیا ہے؟''

بولیں، ''مسٹر! یہ کھانا ہے، میرا افسانہ نہیں کہ تم اس کا عنوان تلاش کرنا شروع کر دو۔''

ہم نے کہا، ''عنوان کا مطلب ہے کہ یہ تقریب سعید یا آپ کی پنجابی میں یہ ''کھانا شانا'' کس سلسلے میں ہو رہا ہے؟''

بولیں: ''کل رات خود آ کر دیکھ لو۔''

ہم نے کہا: ''مگر اس سے پہلے ذرا اشارہ ہو جائے تو کیا قباحت ہے، تاکہ ہمیں اندازہ ہو جائے کہ اپنی بھوک کو کتنا چمکانا اور مانجھنا ہے؟''

اجیت کور نہایت درشت لہجے کے ساتھ پنجابی میں بولیں، ''ہن توں بک بک بند کر۔ توں کل شام ساڈے گھر روٹی شوٹی کھانی آ۔ ہور میں کچھ نہیں سننا چاہوندی۔''

اجیت کور جب ''تم'' سے ''تو'' پر اتر آتی ہیں تو ہم خاموش ہو جاتے ہیں، کیونکہ اس کے بعد وہ پنجابی میں بے نقط سنانے لگتی ہیں، لہٰذا ہم نے زباں دانی میں ان کا ساتھ دیتے ہوئے کہا، ''ہن تسی چنتا نہ کرو جی۔ میں ضرور آواں گا۔''

پھر شرافت کے ساتھ اردو میں بولیں، ''کل ٹھیک چھ بجے آ جانا۔ یاد رہے گا یا بولوں پنجابی میں؟''

مجتبیٰ حسین نے سویڈن کے سابق نائب وزیر اعظم مسٹر اہلمارک سے پوچھا:

''یہ بتایئے آپ کے ہاں مشاعرہ ہوتا ہے یا نہیں؟''

مسٹر اہلمارک نے پوچھا: ''یہ مشاعرہ کیا چیز ہوتا ہے؟''

مجتبیٰ حسین نے کہا: ''بہت بڑی چیز ہوتا ہے۔ بہت سے شاعر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر شعر سناتے ہیں اور ہم جیسے بے وقوف انہیں صرف سنتے ہیں، بلکہ شعر سمجھ میں نہ آئے تو داد بھی دیتے ہیں۔''

اہلمارک بولے: ''ہمارے سارے شاعر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر شعر نہیں سناتے۔ ایک شاعر شعر سناتا ہے اور پچاس ساٹھ آدمی اسے سنتے ہیں۔''

مجتبیٰ حسین نے کہا: ''ہمارے ہاں بعض اوقات معاملہ اُلٹا ہوتا ہے، یعنی پچاس

ساٹھ شاعر پلیٹ فارم پر جمع ہوتے ہیں اور ایک دو سامعین انہیں سنتے ہیں۔''

مسٹر اہلمارک نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ دیں اور پوچھا: ''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

مجتبیٰ حسین کہنے لگے: ''اگر آپ اُردو کے شاعر ہوتے تو ہمارے بیان پر اس طرح اظہارِ حیرت نہ کرتے۔ اچھا یہ بتایئے، آپ کے یہاں شاعر ترنم سے کلام سناتے ہیں یا نہیں یعنی شعروں کو گا کر سناتے ہیں یا نہیں؟''

اہلمارک بولے: ''اگر شاعر بھی گانے لگ جائیں تو بے چارے موسیقاروں کا کیا ہوگا؟ ہم گانے کو شاعری سے الگ فن سمجھتے ہیں۔ تاہم ادھر کچھ برسوں سے ہمارے شاعر اپنا کلام سنانے کے لیے اداکاروں کی خدمات حاصل کر رہے ہیں تاکہ اداکار ان کے کلام کو موثر انداز میں پڑھ سکیں۔ کیا آپ کے ہاں بھی شاعر اداکاروں کی خدمات سے استفادہ کرتے ہیں؟''

مجتبیٰ حسین نے کہا: ''جی نہیں، ہمارا ہر شاعر اداکار بھی ہوتا ہے۔''

اہلمارک نے پریشان ہو کر کہا: ''تب تو اُردو میں شاعری کرنا بہت دشوار ہے، کیونکہ آدمی کو بہ یک وقت شاعر، گویے اور اداکار، تینوں کے رول ادا کرنے پڑتے ہیں۔''

مجتبیٰ حسین نے کہا:

''یہی اُردو شاعر کی خوبی ہے۔''

مجتبیٰ حسین ''بہرحال'' میں لکھتے ہیں:

میں فلمیں اور وہ بھی ہندوستانی فلمیں دیکھنے سے بہت گھبراتا ہوں کیونکہ ہندوستانی فلمیں نہ ہندوستانی ہوتی ہے اور نہ ''فلمیں۔'' اس لیے جب بھی کوئی مجھے فلم دیکھنے کی دعوت دیتا ہے تو میں اس کے پاؤں پکڑ لیتا ہوں اور گڑ گڑا کر کہتا ہوں: ''بھائی میرے! آخر میں نے ایسا کون سا قصور کیا ہے کہ تم مجھے فلم دکھانے لے چلے ہو۔ میں تو تمہیں آج تک اپنا دوست سمجھتا آیا ہوں، پھر تم مجھے آخر کس جرم میں تین گھنٹے کی ''قید بامشقت'' سے گزارنا چاہتے ہو۔

اگر مجھے سزا دینا ہی چاہتے ہو تو پھانسی کے تختے پر چڑھا دو، مگر فلم نہ دکھاؤ، کیونکہ پھانسی کے تختے پر آدمی کا دم فوراً نکل جاتا ہے، فلم دیکھتے وقت آدمی کا دم گھٹتا ہے، مگر وہ نکلتا نہیں اور یہ کیفیت بڑی اذیت ناک ہوتی ہے۔''

غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں شاعری کی ایک کتاب کے اجرا کے سلسلے میں مجتبیٰ حسین نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کتاب کی مقبولیت اس سے زیادہ کیا ہوسکتی ہے کہ چھ ماہ میں ہی اس کا دوسرا ایڈیشن منظر عام پر آگیا ہے۔ اس موقع پر خصوصی رعایت کا اعلان بھی کیا گیا ہے۔ دوسرے ایڈیشن کی ایک جلد خریدنے والے کو اس کے پہلے ایڈیشن کی دو جلدیں مفت دی جائیں گی۔

مجتبیٰ حسین ''مزاح پلس'' میں لکھتے ہیں:

ان دنوں بیشتر اصحاب فیشن کے طور پر اردو الفاظ کا استعمال کرنے لگے ہیں۔ ہمارے ایک بنگالی دوست مسٹر بزجی ہیں، جو اردو بہت کم جانتے ہیں۔ ایک دن ہم ان کے گھر گئے، تو ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور دروازہ کھولتے ہوئے بولے: ''خدا حافظ! کیسے آنا ہوا؟'' ہم نے کہا، ''یار! خدا حافظ اس وقت کہا جاتا ہے جب تم کسی مہمان کو گھر سے رخصت کرنے لگو۔ تم نے یہاں آتے ہی ہمارے الٹے پاؤں لوٹ جانے کی صورت پیدا کردی۔'' بولے، ''مجھے کیا معلوم کہ یہ لفظ کب بولا جاتا ہے، مگر ''خدا حافظ'' مجھے اچھا لگتا ہے، اس لیے استعمال کر رہا ہوں۔ پھر تم میرے ایسے دوست ہو جسے میں جو چاہوں کچھ بھی کہوں، وہ واپس نہیں جاسکتا۔ اس بات پر اندر آؤ، خدا حافظ۔''

کسی شاعر نے ایک بار مجتبیٰ حسین سے ملامت کے لہجے میں کہا:

''بھائی ہر شخص خاکے کے لائق کب ہوتا ہے تم تو سب ہی کے سر پر خاکے کی ٹوپی فٹ کر دیتے ہو۔''

مجتبیٰ حسین بولے:

''کیا کروں جس طرح مشاعروں میں تمہاری شاعری سے زیادہ تمہاری نظامت کا چسکا لوگوں کو پڑ گیا ہے اسی طرح لوگ میری خاکہ سازی (نگاری نہیں) کے رسیا ہو گئے ہیں۔''

ایک دن اس نے مجتبیٰ حسین کو اسی طرح کریدا:

''یہ کیا بات ہے کہ تم نے صرف مرد ادیبوں کے ہی سراپے لکھے ہیں۔''

مجتبیٰ فوراً بولے:

''دوسرے سراپے کے لیے غزل جو موجود ہے۔''

عابد روڈ پر اورینٹ ہوٹل حیدرآباد کے ادبا وشعرا کی آماج گاہ ہوا کرتا تھا۔ سرِ شام اکثر احباب وہاں ایک دوسرے سے ملنے اور اپنے اپنے کارناموں کی خبر دینے کو پہنچ جاتے۔ ایک بار مرحوم شاذ تمکنت کو کشمیر سے مشاعرے کا دعوت نامہ ملا اور اس کے ساتھ ہی ہوائی جہاز کے آنے جانے کے ٹکٹ بھی ارسال کیے گئے۔ شاذ تمکنت اورینٹ ہوٹل آئے اور احباب کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ان میں مجتبیٰ حسین بھی تھے۔ انھوں نے ہوائی جہاز کے ٹکٹ میز پر رکھ دیئے اور ہر آنے جانے والے کو ہوشیار کرتے:

''بھئی ذرا دیکھ کے، یہاں ہوائی جہاز کے ٹکٹ رکھے ہوئے ہیں۔''

بیرا جب بھی آتا، شاذؔ اُسے آگاہ کرتے، بار بار یہی واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد برابر کی میز سے ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا: ''مجتبیٰ نے فوراً آواز لگائی! ''بھئی، ذرا آہستہ ہنسو، یہاں ہوائی جہاز کے ٹکٹ رکھے ہوئے ہیں۔''

حیدرآباد میں عمیق حنفی صاحب کے ایک دوست مجاز انصاری تھے وہ عمیق حنفی کے ناقابل علاج مدّاح تھے۔ ہر دوسرے تیسرے جملے کے بعد کہتے: ''عمیق حنفی بڑے قادرالکلام شاعر ہیں۔'' مجتبیٰ حسین نے کئی مرتبہ انھیں اس بات سے ٹوکا۔ ایک دن گفتگو کا رُخ پھر عمیق حنفی کی طرف مڑنے لگا تو مجتبیٰ حسین بولے: ''میں بھی عمیق حنفی کا قائل ہوں، بلکہ تم تو انھیں صرف قادرالکلام شاعر سمجھتے ہو، میں انھیں عبدالقادرالکلام شاعر سمجھتا ہوں۔'' اس دن کے بعد مجاز انصاری نے کبھی قادرالکلامی کو زحمت دینے کی کوشش نہیں کی۔
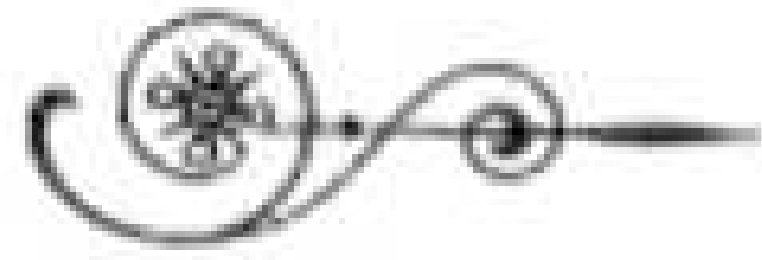
مشتاق احمد یوسفی

ولادت: ۲۳ر ستمبر ۱۹۲۳ء (ٹونک راجستھان)

ایک دن موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ مشتاق احمد یوسفی تھکے ماندے بارش میں شرابور گھر پہنچے تو دیکھا کہ تین مرغے اُن کے پلنگ پر باجماعت اذان دے رہے ہیں۔ سفید چادر پر جا بجا پنجوں کے تازہ نشان تھے البتہ ان کی قبل از وقت واپسی کے سبب جہاں جہاں جگہ خالی رہ گئی وہاں سفید دھبے نہایت بدنما معلوم ہو رہے تھے۔

یوسفی صاحب نے بیگم سے ذرا دُرشتی سے سوال کیا:

''آخر یہ گلا پھاڑ پھاڑ کے کیوں چیخ رہے ہیں۔''

بولیں: ''آپ تو خوامخواہ الرجک ہو گئے ہیں۔ یہ بے چارے چونچ کھولیں تو آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے چڑا رہے ہیں۔''

یوسفی صاحب کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا، بولے:

''بس ہو چکا، آؤ آج دوٹوک فیصلہ ہو جائے، اب گھر میں یا تو یہ رہیں گے یا میں ......''

بیگم کی آنکھوں میں سچ مچ آنسو بھر آئے، ہراساں ہو کر کہنے لگیں:

''اتنی تیز بارش میں آپ کہاں جائیں گے۔''

مشتاق احمد یوسفی نے کسی کی آپ بیتی احمد فراز کو بذریعہ ڈاک بھیجی۔ ساتھ میں ایک سطری رقعہ لکھا:

''مطلوبہ آب بیتی ارسال خدمت ہے۔ سنائیں آپ اپنی ''پاپ بیتی'' کب لکھ رہے ہیں؟''

مارچ ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے۔ بی اے کے امتحان میں ابھی ایک ہفتہ باقی تھا۔ مشتاق احمد یوسفی روہیلوں کی لڑائیوں سے فارغ ہو کر مرزا عبدالوُدود بیگ کے پاس پہنچے تو دیکھا وہ جھوم جھوم کر کچھ رٹ رہے تھے۔

پوچھا: ''خیام پڑھ رہے ہو؟''

کہنے لگے: ''نہیں تو، ہسٹری ہے۔''

''مگر آثار تو ہسٹریا کے ہیں۔'' یوسفی نے کہا۔

یوسفی صاحب لکھتے ہیں:

''اپنی اپنی جگہ دونوں سچے تھے انہوں نے غلط نہیں کہا۔ اگرچہ میرا خیال بھی صحیح نکلا کہ وہ شعر سے شغل فرما رہے ہیں، البتہ شعر پڑھتے وقت چہرے پر مرگی سی کیفیت میں نے قوالوں کے سوا کسی اور کے چہرے پر اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔''

یوسفی صاحب ابوالکلام کی نثر کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں:

''مولانا ابوالکلام آزاد اپنا سن پیدائش اس طرح بتاتے ہیں۔

''یہ غریب الدیارِ عہد، نا آشنائے عصر، بیگانہ خویش، نمک پروردہ ریش، خرابہ حسرت کہ موسوم بہ احمد، مدعو بابی الکلام 1888ء مطابق ذوالحجہ 1305ء میں ہستیِ عدم سے اس عدمِ ہستی میں وارد ہوا اور تہمتِ حیات سے مہتم۔''

اب لوگ اس طرح نہیں لکھتے۔ اس طرح پیدا بھی نہیں ہوتے۔ اتنی خجالت، طوالت واذیت تو آج کل سیزیرین پیدائش میں بھی نہیں ہوتی۔

اسی طرح نوطرز مرصع کا ایک جملہ ملاحظہ فرمایئے۔

''جب ماہتاب عمر میرے کا بدرجہ جہاردوسالگی کے پہنچا، روز روشن ابتہاج اس تیرہ بخت کا تاریک تر شب یلدہ سے ہوا، یعنی پیمانہ عمر وزندگانی مادرو پدر بزرگوار حظوظ نفسانی سے لبریز ہو کے اسی سال دست قضا سے دہلا۔''

کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ کہ جب میں چودہ برس کا ہوا تو ماں باپ فوت ہو گئے لیکن پیرایہ ایسا گنجلک اختیار کیا کہ والدین کے ساتھ مطلب بھی فوت ہو گیا۔

ایس ایم معین صاحب کی کمر میں درد رہتا ہے، ایک کشن ہر وقت ان کے ہمراہ رہتا ہے، ایک روز ان کے مکان پر مشاعرے میں مشتاق احمد یوسفی بھی تشریف فرما تھے، انہوں نے فرمایا: ''معین صاحب کی کمر پر کوئی شعر ہو جائے۔''

تو میں نے یہ قطعہ پڑھا:

ان کی کمر کو کیا ہوا کیوں ٹیڑھے ہو گئے
کیا کثرت گناہ سے رہنے لگا ہے درد

بولے:

گناہ اپنی تو قسمت ہی میں نہیں
اب حسرت گناہ سے رہنے لگا ہے درد

ابراہیم جلیس

ولادت: ۲۲/اگست ۱۹۲۴ء (بنگلور)

وفات: ۲۶/اکتوبر ۱۹۷۷ء (کراچی)

وہ ۱۹۵۰ء کی پہلی مارچ کا نہایت خوشگوار اور منحوس دن تھا۔ ابراہیم جلیس بچوں کے لیے چاکلیٹ اور مٹھائی وغیرہ لینے گھر سے باہر نکل گئے۔ ''باب لیاقت'' تک پہنچے تھے کہ پیچھے سے پتلون اور قمیص میں ملبوس ایک شخص آیا اور اس نے ابراہیم جلیس سے کہا:

''ذرا ایک بات تو سنیئے۔''

ابراہیم جلیس سمجھے ان کا کوئی دوست ہے یا کوئی پرستار جو الگ جا کر ان کی ادبی صلاحیتوں کو خراجِ تحسین پیش کرنا چاہتا ہے اور شاید آٹوگراف بھی لینا چاہتا ہے۔

ابراہیم جلیس اس کے ساتھ فٹ پاتھ پر ایستادہ ہجو کے پیچھے چلے آئے۔ اس شخص نے کہا:

''مجھے افسوس ہے لیکن کیا کروں مجبور ہوں، آپ خود ہی سامنے آ گئے۔ ابھی تین چار روز تک میرا ارادہ نہیں تھا۔ ہم شاہِ ایران کی آمد کے سلسلے میں بہت مصروف تھے۔ اچھا خیر...... لیجیے یہ آپ کا وارنٹ گرفتاری ہے۔ اس پر دستخط کر دیجیے!''

آٹوگراف!!!...... دو تین لمحے کے لیے تو ابراہیم جلیس کو محسوس ہوا کہ اس کے پیروں تلے زمین نکل گئی ہے یا پھر وہ بغیر پیراشوٹ کے کسی گرتے ہوئے ہوائی جہاز سے کود پڑا ہو۔ ابراہیم کے حواس جو دُور خلاؤں میں پرواز کر گئے تھے، پھر واپس آئے اور اس نے چہرے پر مصنوعی اطمینان کی جھلک پیدا کرتے ہوئے وارنٹ لیا اور ساتھ چل دیئے۔

ابراہیم جلیس کو پبلک سیفٹی اور امن عامہ کے خلاف حرکات سے باز رکھنے کے لیے چھ ماہ تک حراست میں رکھنے کا آرڈر تھا۔

ابراہیم جلیس کو لاک اَپ میں لے جایا گیا، جیسے ہی لاک اَپ کا دروازہ کھولا گیا، اندر سے غنڈوں کی آوازیں آئیں:

''لے بھئی! ایک جنٹل مین ڈاکو آ گیا۔''

اندر بارہ غنڈے تھے۔ سب کے سب ابراہیم جلیس کو دیکھ کر ہنسنے لگے۔ لاک اَپ کوئی تقریباً بیس فٹ لمبا اور بارہ فٹ چوڑا تھا۔ ان میں سے ایک نے بڑی بے تکلفی سے ابراہیم جلیس کی ران پر ہاتھ مار کر پوچھا:

''کچھ ہمیں بھی بتاؤ یار...... کسی کی جیب کاٹی، کدھر پکڑا گیا...... کیسے پکڑا گیا......؟''

ابراہیم جلیس نے کوئی جواب نہ دیا اور سخت پیچ وتاب کھانے لگا اور سوچنے لگا:

''الٰہی! میں پاکستان کا اور ہندوستان کا اتنا عظیم المرتبت ادیب اور میرے ساتھ یہ سلوک!''

خاموش دیکھ کر دوسرے غنڈے نے جواب دیا:

''معلوم ہوتا ہے، بابو ابھی نوا شکاری (نیا شکاری) ہے۔''

ایک غنڈہ کہنے لگا:

''بابو! تُو ادھر لالوکھیت میں رہتا ہے ناں! ...... میں نے دیکھا ہے تُو عبدالستار کی جورو کے جھگڑے میں اندر آیا ہے۔ وہ سالی ہے بڑی حرام جادی۔''

ابراہیم جلیس نے ذرا کرخت لہجے میں جواب دیا:

''میں نہ لالوکھیت میں رہتا ہوں، نہ عبدالستار کو جانتا ہوں اور نہ اس کی جورو کو، اور ...... میں ...... میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ خاموش رہو، مجھے تنگ نہ کرو۔''

اس پر ایک بھیانک شکل کے غنڈے نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا:

''یارو...... ان کے ساتھ مذاق نہ کرو، یہ نازک پریجان ہیں۔''

اور ہی ہی ہو ہو کرنے لگا۔

ابراہیم جلیس کا جی چاہا اس غنڈے کی جان ایک کر دے لیکن یہاں تو خود اس کی

اپنی جان ہی پر بنی ہوئی تھی۔ ایک غنڈے کو اس پر ترس آیا اور بولا:

''بابو، باہر تُو کیا کرتا تھا؟''

ابراہیم جلیس نے اس کے لہجے میں ذرا سی ہمدردی کی آمیزش پا کر جواب دیا:

''ایک اخبار میں کام کرتا تھا۔''

اس نے پوچھا:

''کیا وہاں کچھ رقم میں گڑبڑ کر دی؟''

ابراہیم جلیس نے جواب دیا:

''نہیں رقم سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا...... غالباً ایک مضمون لکھنے کے جرم میں مجھے گرفتار کیا گیا ہے۔''

ابھی ابراہیم جلیس نے جملہ بھی ختم نہ کیا تھا کہ سارے سارے بارہ غنڈے ہنسنے لگے۔ ایک بولا:

''ابے جا...... کس کو اُلو بناتا ہے، مضمون لکھے تو کوئی گرفتار ہوتا ہے...... شرماتا کیوں ہے، مرد کا بچہ ہو کر بولتا کیوں نہیں، صاف صاف بول! ...... ہاں، جیب کاٹی ہے، یا چوری کی ہے یا فلاں کی عورت کو زبردستی خراب کیا ہے۔ ارے میاں شیر کے بچے ہی پنجرے میں پھنستے ہیں۔''

ابراہیم جلیس نے بڑے سخت لہجے میں اسے ڈانٹا:

''تو کیوں بکواس کر رہے ہو۔ تمہیں بات کرنے تک کا سلیقہ نہیں، جب تم اب تب بک رہے ہو۔''

اس غنڈے نے بڑے مسخرے پن سے عورت کی طرح ناک پر انگلی رکھ کر کہا:

''اوئی میری ماں، یہ موا تو مجھے کاٹتا ہے۔ میری توبہ، اوئی۔''

دوسرے غنڈے زور زور کے قہقہے مار کر ہنسنے لگے۔

ابراہیم جلیس کو جھوٹ بولنے کی بہت عادت تھی۔ ایک دن حمید اختر نے جلیس سے کہا: ''میں نے زندگی میں بڑے بڑے جھوٹے آدمی دیکھے ہیں مگر تم سے بڑا کوئی نہیں ملا۔ تمہاری نظر میں کوئی ہے کیا جو اس میدان میں تم سے آگے ہو؟''

''ہاں ہے۔'' جلیس نے جواب دیا۔

حمید نے پوچھا: ''کون؟''

''میرے والد صاحب'' جلیس نے کہا۔ ''میں بی۔ اے میں ایک نمبر سے پاس ہوا یعنی مارجن پر اور والد صاحب نے سارے حیدر آباد کی دعوت کر دی کہ لڑکا یونیورسٹی میں ایک نمبر پر آیا ہے (یعنی اوّل آیا ہے)۔

رفیق چوہدری کے افسانوں کا مجموعہ ''محبتوں کے چراغ'' شائع ہوا۔ اگر پر دیباچہ ابراہیم جلیس نے لکھا تھا۔ مصنف اور دیباچہ نگار دونوں کو پاکستان حکومت نے فحاشی کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ مقدمہ چلا اور دونوں کو تین ماہ قید اور تین ہزار روپے جرمانہ کی سزا سنائی گئی۔ اس واقعہ کے بعد ابراہیم جلیس نے چوہدری رفیق سے کہا:

''آئندہ تم ناول لکھنا بند کر دو اور میں دیباچے لکھنا تا کہ دوبارہ یہ دن نہ دیکھنا پڑے۔''

ایک محفل مشہور صحافی احمد علی اور ان کی اہلیہ ہاجرہ مسرور (جو بہت مشہور ادیبہ ہیں)، ابراہیم جلیس اور بہت سے ادیب جمع تھے۔ اچانک ایک صاحب نے ابراہیم جلیس سے سوال کیا: ''صاحب یہ بتائیے کہ صحافت اور ادب میں کیا رشتہ ہے؟''

اس پر جلیس مسکرائے اور احمد علی اور ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''جو احمد علی اور ہاجرہ مسرور میں ہے۔''

احمد ندیم قاسمی کراچی گئے تو ابراہیم جلیس نے ان سے پوچھا: ''قاسمی صاحب! آپ لاہور کب جا رہے ہیں؟'' ''پرسوں ٹرین سے بکنگ کروا رکھی ہے۔'' قاسمی صاحب نے جواب دیا تو ابراہیم جلیس نے کہا: ''کمال ہے صاحب! اس سے اگلے دن آپ کی دعوت کا میں نے اہتمام کیا ہوا تھا۔ اس کا مطلب ہے اس بار بھی آپ مجھے میزبانی کا شرف نہیں بخشیں گے۔''

ابراہیم جلیس کراچی میں قیام پذیر تھے۔ قتیل شفائی، احمد ندیم قاسمی کے علاوہ کچھ اور دوست جب کراچی تشریف لے جاتے تو جلیس ملتے ہی پوچھتے ''کب تک قیام ہے؟'' اور جب ملاقاتی کہتا کہ فلاں تاریخ تک ہے تو فوراً جواب دیتے کہ اس دن تو میں آپ کی دعوت کرنا چاہتا تھا۔ دو چار دفعہ جب ایسا ہی ہوا تو قتیل معاملہ کو بھانپ گئے۔ اس دفعہ جب قتیل شفائی اور قاسمی صاحب کراچی پہنچے تو حسب معمول جلیس نے پوچھا کہ قیام کب تک ہے؟ قتیل نے جواب دیا: ''اس بار ہم فیصلہ کر کے آئے ہیں کہ آپ کی دعوت کے بعد ہی لاہور واپس جائیں گے۔''

ابراہیم جلیس اپنی ہی عظمت کے گن گا رہے تھے: ''صدر ایوب نے کابینہ کے اجلاس میں میرا ذکر کیا اور کہا یہ لفنگا ابراہیم جلیس اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے......'' جس پر ڈرامہ نگار خواجہ معین بے ساختہ ہنس پڑے تو جلیس نے کہا: ''تمہیں شک ہے اس پر؟''

''نہیں، نہیں......'' خواجہ صاحب نے کہا: ''مجھے ہنسی اس بات پر آئی ہے کہ میں ایوب خان کی مردم شناسی کا قائل نہ تھا، آج پتہ چلا کہ وہ کتنے مردم شناس تھے۔''
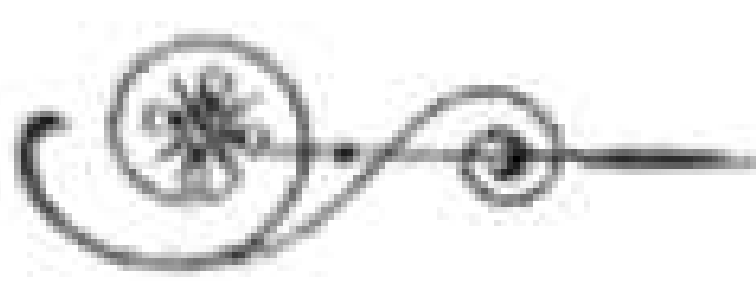
منیر نیازی

ولادت: ۹/اپریل ۱۹۲۷ء (ہوشیار پور)

وفات: ۲۶/دسمبر ۲۰۰۶ء (لاہور، پاکستان)

ڈاکٹر اجمل نیازی ایک واقعہ کا ذکر یوں کرتے ہیں کہ:

منیر نیازی ایک دفعہ کراچی گئے تو جون ایلیا نے انہیں کہا کہ ''منیر خان! تمہارے بال سفید ہو گئے ہیں۔''

منیر نیازی نے جواب دیا:

''بچّو! جو مجھ پر گزری ہے تم پر گزرتی تو تمہارا خون سفید ہو جاتا۔''

لندن کی ایک بین الاقوامی اردو کانفرنس میں جگن ناتھ آزاد اپنا انگریزی مقالہ پڑھ کر ڈائس سے نیچے اترے تو اگلی رو کے سامعین میں شامل منیر نیازی نے انہیں داد دیتے ہوئے کہا، ''آزاد! تم تو انگریزی یوں فرفر بولتے ہو، جیسے کشور ناہید فرفر جھوٹ بولتی ہے۔''

ساتھ بیٹھی ہوئی کشور ناہید نے یہ سنا اور منیر نیازی کو بے نقط سنانی شروع کر دی۔

منیر نے ہنستے ہوئے کہا، ''کیوں، میں نے غلط کہا ہے، لیکن یہ فرفر سچ ہے، جھوٹ نہیں۔''

نامور شاعر منیر نیازی ایک مرتبہ رکشے میں جا رہے تھے اور خیالات میں گم تھے کہ اچانک رکشہ رک گیا۔ انہوں نے رکشہ کے ڈرائیور سے پوچھا۔ ''کیا معاملہ ہے۔'' جواب ملا، جنازہ گزر رہا ہے۔ منیر نیازی جو جملہ سازی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے بولے۔ ''ظالمو! تم بھی کیا لوگ ہو، زندہ انسان کو کچل کر گزر جاتے ہو اور جنازے کے احترام میں رکشا کو روک لیتے ہو۔''

میانوالی میں ایک مشاعرے کے بعد بہت سے شعرا چائے کے کپ پر محمد طفیل نقوش کی غیبت میں مصروف تھے کہ اُن دونوں طفیل صاحب رائٹرز گلڈ کے سیکرٹری جنرل تھے اور رائٹرز گلڈ عروج پر تھی۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ گلڈ کے ذریعے طفیل نے کئی غیر شاعروں کو پلاٹ دلوا دیئے، کوئی کہہ رہا تھا کہ گلڈ کے تعلقات استعمال کر کے موصوف نے اپنا پبلشنگ ہاؤس قائم کر لیا ہے، کوئی بتا رہا تھا کہ طفیل صاحب بہت سیانے آدمی ہیں، ہمیشہ اپنا ہی فائدہ سوچتے ہیں۔ جب کافی دیر ہوگئی تو ایک کونے میں بیٹھے ہوئے منیر نیازی بولے:

''اس شخص کے سیانا ہونے کا اندازہ تو اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اپنی غیر موجودگی میں بھی اپنی باتیں کرواتا اور ہمارا وقت ضائع کرواتا ہے۔''

ایک بار احمد بشیر نے کہا پتا نہیں، کیا بات ہے اب تو میں جب شراب پیتا ہوں، جسم پر ''دھپڑ'' نکل آتے ہیں۔

منیر نیازی بولے:

''اصل میں شراب کو بھی پتا چل جاتا ہے کہ اسے کون پی رہا ہے۔''

صابر ظفر نے آج سے پندرہ سال پہلے کہیں پوچھ لیا کہ خاں صاحب! ادب میں میرا کیا مقام بنتا ہے۔

منیر نیازی بولے:

”کاکا، حالے تے تیرے مقام دی میم وی نئیں بنی تو مقام پیا لبھنا ایں۔“

ایک منتظم مشاعرہ معاوضے کی رقم میں کمی کے خواہاں تھے، چنانچہ انہوں نے ایک دوسرے شاعر کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ اسے تم ہم جتنے پیسے بھی دیں وہ لے کر خوش ہو جاتا ہے۔

اس پر منیر نیازی بولے:

”اس شاعر کا کیا ہے وہ تو آٹا لے کر بھی خوش ہو جاتا ہے۔“

منیر نیازی کشور ناہید کے بارے میں لکھتے ہیں:

”میں اپنے فیملی فرینڈز سے اپنی بیوی کو پردہ نہیں کراتا لیکن اگر کشور ناہید میرے گھر آئے تو اس سے پردہ کراتا ہوں۔“

فیصل آباد کی ایک خاتون نے پہلی بار جب منیر نیازی کو اُردو شاعری کے بارے میں فیکٹس اینڈ فگرز پیش کیے تو وہ مجھے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے بولے:

”فیکٹس کا تو پتا نہیں ”فگرز“ البتہ ٹھیک ہیں۔“

''مولا جٹ'' والے سرور بھٹی راوی ہیں کہ ایک رات ان کے پاس شاہ نور سٹوڈیوز میں بیٹھے بیٹھے منیر نیازی کو بہت دیر ہوگئی۔ گھر جانا بھی ضروری تھا مگر یہ زمانہ تھا جب پولیس والے ہر چوک میں سواری روک کر منہ سونگھا کرتے تھے۔ چنانچہ وہیں پر بیٹھے بیٹھے منیر نیازی نے موقع کی مناسبت سے پنجابی کی یہ معروف نظم لکھی:

دیوے بلن مزاراں اتے جنگلاں وچ مشالاں
شہر دے چوک خبیثاں ملے طیب وچ ملالاں

منیر نیازی نے پہلی بیوی کی وفات کے کچھ دنوں بعد دوسری شادی کر لی تھی۔ چنانچہ کالج کے ایک مشاعرے میں جونہی انہوں نے اپنی معروف نظم کا یہ مصرعہ پڑھا: ''ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں'' تو پیچھے سے آواز آئی:

''ویاہ کرن لگیاں تے ذرا دیر نئیں جے لائی''

ایک محفل میں قتیل شفائی اپنے حجام کی خوبیوں کا ذکر کر رہے تھے اور بات آ پہنچی اس نکتہ پر کہ انسان جسم میں دو چیزیں ایسی تھیں جنہیں کاٹا جائے تو لہو کی ایک بوند بھی نہیں ٹپکتی۔ سب حیران ہوئے کہ وہ ایسی دو کون سی چیزیں ہیں......؟ کٹ بھی جائیں اور لہو بھی نہ نکلے۔

قتیل صاحب نے جلد ہی سب کی حیرانی یہ بتا کر دُور کر دی کہ انسانی جسم میں یہ دو چیزیں جن کو کاٹنے سے خون نہیں نکلتا، ایک تو انسانی بال ہیں دوسرے ناخن...... ابھی قتیل صاحب نے فقرہ بھی مکمل نہیں کیا تھا کہ منیر نیازی بولے:

''قتیل! تُو فیر ساڈے پنڈ دا نائی نئیں ویکھیا''
(تُو نے پھر ہمارے گاؤں کا حجام نہیں دیکھا)

ایک زمانے میں منیر نیازی ایک پرچہ نکالتے تھے۔ گارڈی ٹرسٹ بلڈنگ میں اس کا دفتر تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ پرچہ بند ہو گیا۔ عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ پرچے نکلتے ہیں پھر وسائل اور مالی مشکلات کا شکار ہو کر بند ہو جاتے ہیں، سو منیر نیازی کا پرچہ بھی انہیں معاملات کے سبب بند ہو گیا ہو گا۔ اعزاز احمد آزر نے اس حوالے سے اپنے میگزین کے لیے کیے جانے والے ایک انٹرویو میں منیر صاحب سے پرچہ بند ہو جانے کی وجہ دریافت کی تو منیر صاحب پہلے تو مسکرائے پھر کہنے لگے: ''اس رسالے کو بند کرنے کا ایک دلچسپ سبب تھا۔ وہاں جو لڑکا میں نے ملازم رکھا ہوا تھا، ویسے تو کام کاج ٹھیک ہی چلا رہا تھا مگر ایک بار یوں ہوا کہ میں نے اس سے جب پچھلے کچھ دنوں کی آمد و خرچ کا حساب مانگا تو اس نے بتایا کہ ''اتنے سو'' روپے کُل اخراجات نکال کے بچ رہے تھے۔ میں نے وہ رقم طلب کی تو وہ کہنے لگا کہ جی وہ تو میں نے خرچ کر دی......'' اب منیر صاحب کا چہرہ پہلے سے زیادہ کِھل گیا تھا۔ بولے: ''میں نے پوچھا کہ تم نے وہ رقم کہاں خرچ کر دی؟'' تو اس لڑکے نے بتایا کہ جی میں اپنے دوستوں کے ساتھ ہیرا منڈی گانا سننے چلا گیا تھا۔ سب دوست طوائف پر روپے نچھاور کر رہے تھے۔ میں نے سوچا جب ان کو پتہ چلے کہ منیر نیازی جیسے شاعر کا ملازم بیٹھا ہوا ہے اور وہ خالی جیب ہے تو کتنا برا لگے گا؟ وہ طوائف بھی کیا سوچے گی؟؟ سو میں نے وہ سارے روپے اس رات طوائف پر لٹا دیئے۔ صاحب! آپ کی عزت کا سوال تھا......'' بات مکمل کرتے ہوئے منیر نیازی باقاعدہ کھل کھلا کر ہنس رہے تھے!

ایک بار ناقد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے کہا تھا کہ ہندوستان میں منیر نیازی کی پرستش ہوتی ہے۔ منیر نیازی کو یہ بات اتنی پسند آئی کہ ہر جگہ عرصے تک اس کا حوالہ دیتے رہے۔

ایک دن کسی ستم ظریف نے ان سے کہا: ''ہندوستان میں تو گائے اور پتھر پوجے جاتے ہیں، آپ کو کوئی کیوں پوجے گا؟''

منیر نے کہا:

''آپ سنی سنائی بات کر رہے ہیں، نارنگ نے آنکھوں دیکھی بیان کی ہے۔''

ستم ظریف نے گرہ لگائی:

''نارنگ مذاق بھی تو کر سکتے ہیں۔''

منیر نے یہ کہہ کر ان کا منہ بند کر دیا:

''نارنگ صرف تنقیدی مضامین میں مذاق کرتے ہیں، گفتگو میں ہمیشہ سنجیدہ رہتے ہیں۔''

منیر نیازی ایک محفل میں تھے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے کہا:

''نیازی صاحب! آج تو آپ بہت اچھے لگ رہے ہیں۔''

یہ سن کر انیس ناگی کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ میں نے کہا، تعریف تو میں کر رہا ہوں...... انیس ناگی بیچ میں کہاں سے آ گیا۔

بولے:

''صبح ملا تو کہنے لگا میں بیمار اور کمزور کمزور نظر آ رہا ہوں۔''

ڈاکٹر سلیم اختر نے کہا: ''نیازی صاحب دراصل وہ آپ کے حسن بلکہ زیادہ بہتر تو یہ ہے کہ سیکس اپیل سے جلتا ہے۔''

یہ سن کر خوش ہوئے اور کہا:

''ایہہ گل توں ٹھیک کیتی اے......''

پاکستان رائٹرز گلڈ نے ایک برس اعلان کیا کہ سالانہ جلسے میں ایذرا پاؤنڈ اور ژال پال سارتر کو بلائیں گے۔ پھر سوال اٹھا کہ ان بزرگوں کو ٹھہرائیں گے کہاں؟ سوال پریشان کن تھا تب منیر نیازی نے کہا کہ سارتر کو تو میں اپنے ہاں ٹھہرالوں گا۔

یعنی کہاں.....کسی نے سوال کیا۔

اس پر منیر نیازی نے کہا کہ میں نے اچھرہ موڑ پر ایک کمرہ کرائے پر لے لیا ہے ایک چارپائی تو ہے، ایک چارپائی کا انتظام اور کرلوں گا۔ سارتر بھی ادیب ہے میں بھی ادیب ہوں، زیادہ تکلف کی ضرورت نہیں۔ ہم دونوں مزے میں رہیں گے۔

اس پیش کش پر اعجاز بٹالوی نے تیوری پر بہت بل ڈالے اور کہا کہ دیکھئے منیر نیازی صاحب بات یہ ہے کہ یورپین ادیب رہائش کے معاملے میں باتھ روم کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ آپ کا باتھ روم کیا ہے۔ اس سوال پر منیر نیازی بہت گڑبڑایا۔ یوں یورپین ادیبوں کی آمد کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔

نریش کمار شاؔد

ولادت: ۱۱ دسمبر ۱۹۲۷ء (نکودر)

وفات: مئی ۱۹۶۹ء (دلّی)

چند اُردو ادیب ایک جگہ بیٹھے فکر تونسوی کا ذکر کر رہے تھے۔ ایک نے کہا: ''فکر صاحب کے طنزیہ مضامین روزمرہ کی زندگی کے نہایت سنجیدہ مسائل پر فکر کی دعوت دیتے ہیں۔'' دوسرے نے تائید کرتے ہوئے کہا: ''یہی وجہ ہے کہ ان کے طنزیہ تحریروں میں بہت زندگی ہوتی ہے۔'' تیسرا بولا: ''فکر صاحب شکل وصورت کے اعتبار سے بھی انسانی زندگی پر ایک کاری طنز ہیں۔''

نریش کمار شاد نے اس گفتگو میں فکر، طنز زندگی کے الفاظ جب بار بار سنے تو اس وقت ایک قطعہ کہہ کر سنا دیا:

لوگ جب شرم سار ہوتے ہیں
خود بھی یہ شرم سار ہوتی ہے
زندگی فکر تونسوی کی طرح
طنز کرتی ہے اور روتی ہے

ریلوے کلب بٹھنڈہ کے ایک مشاعرے میں جناب دردنکودری اپنا کلام سنا رہے تھے۔ جنھیں سامعین نے کچھ واجبی سی داد کے ساتھ سنا۔ ان کے بعد جب نریش کمار شاد کو دعوتِ سخن دی گئی۔ تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

شاد جھومتے لہکتے مائیک کی طرف بڑھتے ہوئے درد صاحب کی طرف یوں طعنہ زن ہوئے:

''کیسے کیسے پھیکے شاعروں کو بلا لیتے ہیں۔''

سامعین میں سے ایک آواز بلند ہوئی.......... ''درد تمہارا باپ ہے۔''

شاد نے برجستہ جواب دیا:

''جی ہاں یہی تو میرا درد ہے کہ آپ میرے والد ہیں۔ اسی پہچان سے تو مشاعروں میں بلائے جاتے ہیں۔''

پورا مجمع بے اختیار ہنس پڑا۔

بسمل شاہجہانپوری اپنی ریش مبارک کو کھجاتے ہوئے نریش کمار شاد سے کہنے لگے:

''صاحب! میں اپنا دیوان چھپوا کر شائع کرانا چاہتا ہوں، لیکن پریشانی یہ ہے کہ اس کے لیے مناسب نام نہیں سوجھ رہا۔ اپنے تخلص کی رعایت سے مجموعہ کا نام رکھنا چاہتا ہوں، جیسے فانی بدایونی کے مجموعہ کا نام ''باقیاتِ فانی'' ہے۔ مخمور دہلوی کے مجموعہ کا نام ''بادۂ مخمور'' ہے، جوش ملیسانی کے مجموعہ کا نام ''بادۂ سروش'' ہے۔''

شاد نے نہایت نیاز مندی سے دریافت کیا:

''تو اس لحاظ سے آپ کی کتاب کا نام ''مرغِ بسمل'' کیسا رہے گا؟''

مودود صدیقی نے امروہہ میں مشاعرہ کے سلسلہ میں نریش کمار شاد اور چند دوسرے شعرا کو مدعو کیا۔ مقررہ جگہ پر جب شاعر لوگ پہنچے تو وہاں کھانے اور رہائش کا مناسب انتظام نہیں تھا۔ کافی دیر تک انتظار کرنے پر بھی منتظمین میں سے کوئی نہ پہنچا۔ شعرا پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ اتنے میں مودود صدیقی کے ہم شکل بھائی فہمود علی سامنے گزرتے ہوئے دکھائی دیئے۔ نریش کمار شاد نے بڑھ کر انہیں پکڑ لیا اور بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا، حالانکہ وہ مسلسل کہتا رہا کہ بھائی میں مودود صدیقی نہیں ہوں۔

نریش کمار شاد بولے:

''ارے تُو کیا سمجھتا ہے میں نے شراب پی رکھی ہے جو تجھے پہچاننے میں غلطی کروں گا۔''

احمد فراز

ولادت: ۱۲ جنوری ۱۹۳۱ء (کوہاٹ)

وفات: ۲۵ اگست ۲۰۰۸ء (اسلام آباد)

مشہور شاعر محسن احسان علیل تھے۔ احمد فراز عیادت کے لئے گئے۔ دیکھا کہ محسن احسان کے بستر پر کتابوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ چادر بھی میلی تھی۔ احمد فراز نے صورت حال دیکھ کر مسکراتے ہوئے محسن سے کہا:

''یار، اگر بیوی بدل نہیں سکتے تو کم از کم بستر ہی بدل دیجئے۔''

ایک ''انڈو پاک مشاعرے'' میں احمد فراز کے ساتھ [مختار علی خاں] پرتو روہیلہ بھی معہ بیگم شریک تھے۔ میزبانوں کے اصرار پر احمد فراز نے دو چار روز بھارت میں مزید قیام قبول کر لیا، مگر ان کے ہم سفر پرتو روہیلہ کی بیگم نے اکتاہٹ کا اظہار کرتے ہوئے فوری واپسی کے لئے جلدی مچا دی، چنانچہ احمد فراز ایئرپورٹ تک رخصت کرنے گئے اور میرؔ کا ایک مشہورِ زمانہ شعر فوری تحریف کے بعد بیگم پرتو روہیلہ کی نذر کیا:

ناحق پرتو روہیلہ پر تہمت ہے ''مختاری'' کی
چاہے ہیں سو آپ کرے ہیں ان کو عبث بدنام کیا

ایک دفعہ کراچی میں کسی مشاعرے پر جاتے ہوئے خاطر غزنوی کے پاس کسی اور مسافر کا ٹکٹ تھا۔ ان دونوں دہشت گردی ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ چیکنگ کوئی خاص نہیں ہوتی تھی۔ کوئی نہیں پوچھتا تھا کہ کون کس کے ٹکٹ پر سفر کر رہا ہے۔ غالباً شناختی کارڈ بھی ابھی بننا شروع نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے لوگ اس بات کا زیادہ تردد نہیں کرتے تھے کہ ٹکٹ پر انہی کا نام لکھا ہو۔ کسی مسافر نے جس کا جانے کا ارادہ بدل گیا ہوگا۔ آخری لمحے خاطر غزنوی کو اپنا ٹکٹ بیچ دیا ہوگا۔ بہرحال لطیفے کی بات اس وقت شروع ہوئی۔ جب جہاز خراب موسم میں گھر گیا اور ہوا کے شدید دباؤ میں ہچکولے کھانے لگا۔ سارے مسافر گھبرا گئے۔ احمد فراز کے پاس خاطر غزنوی بیٹھے تھے اور بے حد گھبرائے ہوئے۔ احمد فراز نے ان سے کہا، ''تم کیوں پریشان ہو، اگر جہاز گر گیا تو مرے گا تو وہ شخص جس کا ٹکٹ ہے۔ مرنے والوں میں تم تو ہو گے نہیں۔

خاطر غزنوی سے متعلق ہی ایک اور دلچسپ لطیفہ ہے، جو فراز کی بذلہ سنجی اور بدیہہ گوئی کا ایک نادر ثبوت ہے۔ خاطر غزنوی، پشاور یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر تھے۔ ڈیپوٹیشن پر چین کی کسی یونیورسٹی کے لیے عازم سفر ہو رہے تھے۔ احمد فراز سے اچانک سرراہ کہیں ملاقات ہوگئی۔ احمد فراز نے پوچھا: ''خاطر! کہو سفر کی تیاری مکمل ہوگئی؟'' خاطر غزنوی نے پریشانی کے عالم میں کہا: 'تیاری تو مکمل ہے، مگر بچوں کے بارے میں پریشان ہوں، کہاں چھوڑ کے جاؤں؟'' احمد فراز نے فوراً کہا: ''اس میں پریشانی کی کیا بات ہے، بچے جس کے ہیں، اُسی کو دے جاؤ۔''

احمد فراز کینیڈا گئے۔ وہ سگریٹ بہت پیتے تھے۔ کسی خاتون نے ان سے کہا:
''آپ اس قدر سگریٹ نہ پیا کریں۔ 60 فیصد سگریٹ نوشی کرنے والے افراد کو

کینسر ہو جاتا ہے۔"

احمد فراز مسکرائے اور کہا:

"آپ فکر نہ کریں۔ میں ان باقی رہ جانے والے 40 فیصد لوگوں میں سے ہوں جنہیں سگریٹ سے کینسر نہیں ہوتا۔"

پاکستان اسٹیل مِل کے کُل پاکستان مشاعرے میں سامعین بڑی تعداد میں موجود تھے، مگر کسی بھی شاعر کو داد نہیں دے رہے تھے۔

احمد فراز نے کہا: "ایسا لگتا ہے، جیسے یہ سامعین بھی اسٹیل کے بنے ہوئے ہیں۔"

احمد فراز صاحب سے پوچھا گیا کہ کیا آپ کو شروع ہی سے ادیب اور شاعر بننے کا شوق تھا، جیسے بچوں کو ہوتا ہے، ڈاکٹر اور انجینئر وغیرہ؟

احمد فراز نے جواب دیا:

"نہیں، میں تو پائلٹ بننا چاہتا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ نویں دسویں جماعت میں ہمیں جس پہلی لڑکی سے رغبت ہوئی اس کا بھائی پائلٹ تھا۔ اب یہ قصہ لمبا ہے لیکن وہ ایک وجیہہ آدمی تھا خاص طور پر وردی میں بہت ہینڈسم لگتا تھا۔ میں نے انٹرویو وغیرہ بھی دیا اور سلیکٹ بھی ہو گیا اور کال بھی آ گئی لیکن میری والدہ مخالف تھیں کیونکہ میرا بڑا بھائی فوج میں جا چکا تھا اور میری والدہ کا کہنا تھا کہ وہ سب بچوں کو ادھر نہیں بھیجنا چاہتی۔ تو ان کی چھٹی حس تھی جس کی بنا پر انہوں نے مجھے جانے نہیں دیا کیونکہ میرے ساتھ کے جتنے بھی لڑکے گئے وہ سب ہی مارے گئے کچھ ٹریننگ میں کچھ ویسے۔

وہ لڑکی مجھ پر کوئی تیس سال تک طاری رہی۔ حالانکہ یہ نویں دسویں کی بات تھی۔ خاص طور پر ہماری طرف جہاں پردہ وغیرہ بہت تھا اور میل جول بھی ایسا نہیں ہوتا تھا۔ بہر حال

اس کی شادی ہوگئی۔ وہ اس وقت دسویں میں تھی۔ پھر اس سے میری ملاقات تیس سال بعد ہوئی۔۔ مجھے اتنی مایوسی ہوئی اس سے مل کر۔ مجھ میں کوئی زیادہ تبدیلی نہیں آئی تھی جبکہ اس نے ساری باتیں کیں اس طرح کی کہ مجھے شوگر ہے، مجھے یہ ہے، وہ ہے۔۔۔اور میں سوچ رہا تھا کہ چائے کی پیالی کب ختم ہوگی۔ مجھے اتنا افسوس اور دُکھ ہو رہا تھا کہ کس کے لیے تیس سال کٹے۔“

احمد فراز صاحب سو رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی، غصے میں فون اٹھایا تو دوسری طرف سے آواز آئی، ”میں یوسف لودھی بول رہا ہوں، ایک اُلجھن تھی، اس لیے تمہیں فون کیا۔“

فراز نے کہا، ”فرمایئے!“

لودھی نے کہا، ”بس اتنا بتا دو کہ یہ جو قہقہہ کا لفظ وہ قلم والے ”قاف“ سے ہے یا کتے والے ”کاف“ سے؟“

(اہل پنجاب کے یہاں ”ق“ اور ”ک“ کے مخرج میں کوئی خاص فرق نہیں)

فراز نے جل کر کہا، ”یوں تو قہقہہ قلم والے کاف سے ہے، اگر یہ قہقہے تمہارے ہیں تو پھر کتے والے کاف سے ہیں۔“

مسعود اشعر چین میں ہوئے ایک واقعے کا ذکر کرتے ہیں:

احمد فراز میز پر دودھ نہ دیکھ کر چینی ویٹرس کو خاصی دیر سے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہم چائے میں دودھ بھی ڈالتے ہیں۔ جب ویٹرس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو فراز نے انگھوٹھا منہ میں لے کر چوسنا شروع کر دیا اور وہ زرد رو چینی لڑکی سچ مچ سُرخ ہوگئی تھی۔

اس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ ہم کیا مانگ رہے ہیں۔

احمد فراز چین میں تھے۔ چند دوست ساتھ بیٹھے تھے۔ مسعود اشعر نے پیالی اُٹھائی، چائے کا ایک گھونٹ لیا اور بُرا سا منہ بنا کر پیالی میز پر رکھ دی، ''اس میں تو چینی نہیں ہے۔''

فراز بولا:

''سامنے اتنے چینی پھر رہے ہیں، کسی کو اُٹھا کر ڈال لو!''

ڈیرہ غازی خان میں پچیس روپے کا ایک مشاعرہ پڑھنے اصغر ندیم سیّد اور محسن نقوی پہنچے۔ وہاں احسان دانش، قتیل شفائی، عدم صاحب، فراز صاحب سبھی بڑے شاعر موجود تھے۔ عدم کی جب باری آئی تو محفل عروج پر تھی۔ عدم کو بہت داد ملی۔ لوگ مسلسل انہیں داد دے رہے تھے۔ عدم صاحب سے کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا، کسی نے کہا، ''عدم صاحب کو کرسی لا کر دیں۔''

احمد فراز نے بلند آواز سے کہا، ''انہیں کرسی کی نہیں آیت الکرسی کی ضرورت ہے۔''

شمیم اکرام الحق اپنے بچوں کے ساتھ لنچ کر رہی تھی کہ احمد فراز، ثمینہ پیرزادہ اور ثمینہ راجہ کے ساتھ داخل ہوئے۔ ملاقات ہوئی تو شمیم نے کہا، ''واہ کیا کہنے ایک چھوڑ دو دو ثمینائیں۔''

''ہاں بھئی، دن میں تو ثمینائیں ہوتی ہیں، شام کو مینائیں (مینا کی جمع) ہوتی ہیں۔''

احمد فراز نے فوراً ثمینہ کا قافیہ ساغر و مینا سے ملاتے ہوئے کہا۔

ایک بار کسی محفل میں جب شمیم اکرام الحق داخل ہوئیں تو احمد فراز نے حسبِ عادت اُٹھ کر کہا، ''لو جی، میری بہن بھی آ گئیں۔''

کچھ دیر بعد ایک صحافی آئے تو انہوں نے بھی شمیم کو ''باجی'' کہہ کر سلام کیا، اس پر فراز کی ایک دوست نے مجھ پر طنز کرتے ہوئے کہا، ''کیا بات ہے، سب تمہیں بہن کہتے ہیں، اتنے بہت سے بھائی؟''

اس سے پہلے کہ شمیم کوئی جواب دیتیں، احمد فراز فوراً بولے، ''تو اس میں کیا بُرائی ہے، بُرائی تو یہ ہے کہ کسی خاتون کے بہت سے عاشق ہوں۔'' ان خاتون کا رنگ ایک دم زرد پڑ گیا اور محفل قہقہوں سے بھر گئی۔

1996ء میں لندن میں پاکستانی سفارت خانے میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا، وہاں پر احمد فراز نے جب اپنی غزل ''سنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں'' سنائی تھی تو آخری شعر کا پہلا مصرعہ پڑھنے پر ''اب اس کے شہر میں ٹھہریں کہ کوچ کر جائیں'' سامعین میں سے بے شمار لڑکیوں کی آواز ایک ساتھ گونج اٹھی تھی ''ٹھہر جائیں!!، پلیز ٹھہر جائیں!!''

احمد فراز کے بچپن کا واقعہ ہے جب وہ کوہاٹ شہر میں جوہڑ میں نہایا کرتے تھے۔ ایک دن نہاتے نہاتے جوہڑ میں ڈوبنے لگے کہ ایک صاحب جو سڑک سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا، لپک کر آئے، جمپ کیا اور بڑی مشکلوں سے انہوں نے احمد فراز کو بچا لیا۔

تیس پینتیس سال بعد جب احمد فراز کوہاٹ گئے تو وہ صاحب ملے اور کہنے لگے:

''آپ نے مجھے پہچانا؟''

احمد فراز نے کہا: ''نہیں''

بزرگ آدمی تھے، احمد فراز نے پھر سے کہا: ''کوہاٹ میں بہت کم آتا ہوں، معاف کیجیے گا۔''

وہ کہنے لگے: ''تم چھے یا آٹھ سال کے تھے۔ اس وقت تم ایک جوہڑ میں ڈوب رہے تھے تو میں نے تمہیں بچایا تھا۔''

احمد فراز کہنے لگے:

''اچھا، تو تم ہو وہ ظالم جس نے مجھے زندگی کی باقی اذیتیں پہنچوائیں۔''

احمد فراز کے ایک دوست کو چین میں ملازمت کے لیے منتخب کیا گیا اور وہ جانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ فراز کے یہ دوست کثیر العیال تھے۔ لہٰذا سفر کی تیاریوں میں جو مراحل آتے ہیں وہ سب انہیں درپیش تھے۔ مثلاً سب کے پاسپورٹ، ویزے، ہوائی جہاز کے ٹکٹ، زرِمبادلہ وغیرہ وغیرہ۔

ایک دن وہ بہت پریشان بیٹھے تھے کہ احمد فراز آ گئے۔ انہوں نے اپنی پریشانی کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

''بتاؤ اتنے بہت سے بچوں کے پاسپورٹ، ویزے، ٹکٹ اور پھر جانے چین جا کر یہ کس طرح کا سلوک کریں۔ اگر صرف میں اور میری بیوی ہوتے تو کام آسان ہوتا۔ اب تم ہی بتاؤ، میں ان بچوں کا کیا کروں؟''

احمد فراز نے بے ساختہ جواب دیا:

''اس میں مسئلہ کیا ہے۔ بچے جس جس کے ہیں ان کو واپس کر دو۔''

ایک روز ایک مشہور پبلشرز نے فراز کو فون کیا اور کہا: ''آپ اپنی خودنوشت کیوں نہیں لکھتے۔ آپ اگر آپ بیتی لکھیں اور اس میں ساری ایسی خواتین کا ذکر ہو جن سے آپ کے

مراسم رہے ہیں تو ہم آپ کو تین لاکھ روپے معاوضہ دیں گے۔

احمد فراز نے جواب دیا:

''یہ سودا نہیں ہو سکتا کیونکہ پانچ پانچ لاکھ روپے تو ایسی کئی خواتین مجھے آپ بیتی نہ لکھنے کے لیے دینے کو تیار ہیں۔''

اچھے دنوں میں جب وطن عزیز میں بڑے بڑے شاندار مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ ایک ایسے ہی مشاعرہ کا ذکر کرتے ہوئے مشہور شاعر سیّد ضمیر جعفری نے بتایا:

''پہلا 'مشاعراتی فقرہ' ہم نے احمد فراز سے ایبٹ آباد کے ایک مشاعرے میں سنا۔ حفیظ جالندھری صاحب اپنی طویل نظم ''رقاصہ'' سنا رہے تھے۔ نظم ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہی تھی تو اچانک فراز کی آواز اُبھری:

''حفیظ صاحب، اٹھترواں شعر پھر سے ارشاد ہو!''

اُکتائے ہوئے سامعین نے اس فقرے سے محظوظ ہو کر بھرپور قہقہہ لگایا۔

ایک بار کسی محفل میں احمد فراز کو پان پیش کیا گیا تو انہوں نے انکار کر دیا کہ وہ پان نہیں کھاتے۔ ایک خاتون نے کہا:

''یہ غلط ہے، میری چند برس پہلے جب آپ سے ملاقات ہوئی تو میں نے خود آپ کو پان کھاتے ہوئے دیکھا تھا۔''

فراز نے جواب دیا:

''ہاں، تب میں پان کھاتا تھا۔ لیکن جب سے ڈھاکہ سے پان آنے بند ہوئے ہیں، میں نے پان کھانا چھوڑ دیا ہے۔''

(یہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد کی بات ہے۔)

اُن دنوں پاکستان کی سیاست میں ''لوٹا کریسی'' کا زور تھا۔ ساری سیاسی پارٹیوں کے لیڈرانِ کرام ایک دوسرے پر ''لوٹا'' ہونے کا الزام لگاتے رہتے تھے۔

ایک روز ازراہِ مذاق احمد فراز نے پروین شاکر سے کہا:

''آپ بھی سیاسی شعر کہنے لگی ہیں۔''

پروین نے پوچھا: ''وہ کس طرح؟''

فراز نے جواب دیا: ''آپ کا شعر ہے نا......

وہ جہاں بھی گیا ''لوٹا'' تو مرے پاس آیا
اک یہی بات ہے اچھی مرے ہرجائے کی

پروین شاکر نے ہنس کر جواب دیا:

''آپ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ ''لوٹوں'' پر صرف آپ کی اجارہ داری ہے۔

جون ایلیا

ولادت: ۱۴ دسمبر ۱۹۳۱ء (امروہہ)

وفات: ۸ نومبر ۲۰۰۲ء (کراچی)

جشن علی سردار جعفری (۱۹۹۸ء) کے موقع پر دوحہ میں مقیم بہاول نگر کے شاعر سیّد منور گیلانی نور شیزان ہوٹل کے استقبالیہ پر کسی کا انتظار کر رہے تھے کہ اچانک ان کی نگاہ جون ایلیا پر پڑی۔ انھوں نے کھڑے کھڑے پنجاب کے روایتی انداز میں دونوں بازو پھیلا کر بے ساختہ کہا:

"اوئے جون تو!......"

جون ایلیا ایک لمحے کو ٹھٹکے اور "اوئے تُو...... اوئے تُو...... اوئے تُو" کی گردان کرتے ہوئے اُس کے قریب پہنچے اور اُچھل کر اُس کی گود میں سوار ہو گئے۔ اپنی دونوں ٹانگیں اُس کی کمر کے گرد حائل کر دیں اور چٹاپٹ اُس کے گال پر بوسے لینے شروع کر دیئے۔

اسی اثنا جون ایلیا کی فرمائش پر مدیر دُنیائے ادب اوج کمال نے محولہ بالا تصویر کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کر لی۔ منظر بڑا دلچسپ تھا اور علی سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی، شہزاد

احمد اور دیگر احباب لطف اندوز ہوتے رہے۔ منور گیلانی نے تصاویر اتارے جانے کے فوراً بعد جون ایلیا کو گود سے نیچے اتارا، احباب سے ہاتھ ملایا اور چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی جون ایلیا نے برجستہ کہا:

''جانی......کون تھا یہ؟''

جون ایلیا کے ایک ہمدم و ہمراز بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ رات کے ڈھائی بجے ان کے پھاٹک پر گھنٹی بجی۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے پہنچے تو جون ایلیا کھڑے تھے۔

فرمایا جانی !! میں اس وقت پیے ہوئے نہیں ہوں۔ میں اس وقت رینجر بن کر بڑے بھائی (سید تقی صاحب) کو فون کرنا چاہتا ہوں۔ جن سے ان کا جائیداد کا جھگڑا تھا کہ یا تو جائیداد کے تقاسمے میں جون کے ساتھ زیادتی بند کرو ورنہ وغیرہ، وغیرہ۔

ان دنوں کراچی میں قتل و غارت کا زور تھا اور شہر میں رینجرز گشت کر رہے تھے۔ لوگ رینجرز سے بہت خوفزدہ تھے۔ دوست انہیں فون تک لے گیا، ان کے ہاتھ میں بے حد رعشہ تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے ڈائل کے سوراخ یکے بعد دیگرے غلط طرف گھمائے۔ انہیں نمبر بھی یاد نہیں تھا۔

کہنے لگے جانی !! تمہارے فون کے سوراخ غلط جگہ بنے ہوئے ہیں۔ ہم نے سب ٹرائی کر کے دیکھ لیے ذرا تم فون ملا دو۔

دوست نے فون ملایا۔ جب بڑے بھائی صاحب جو روزنامہ جنگ کے ایڈیٹر تھے، فون پر آ گئے تو جون نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے ریسیور پکڑ کے مہکتے ہوئے ہونٹ اس پر رکھ کر کہا، ''بھیا میں رینجرز بول رہا ہوں۔'' (بھائی صاحب قبلہ نے جواب میں جو کچھ کہا اسے یہاں دہرانا ضروری نہیں)۔

فون پھینک کر جون ایلیا دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ ''صاحب! اس تہذیب نے ہمیں تباہ کر دیا۔ اس تہذیب نے ہمیں کہیں کا نہیں رکھا۔

اماں خفگی اور لڑائی جھگڑے میں بھی تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ امروہے کی تہذیب نے مجھے تباہ کر دیا۔''
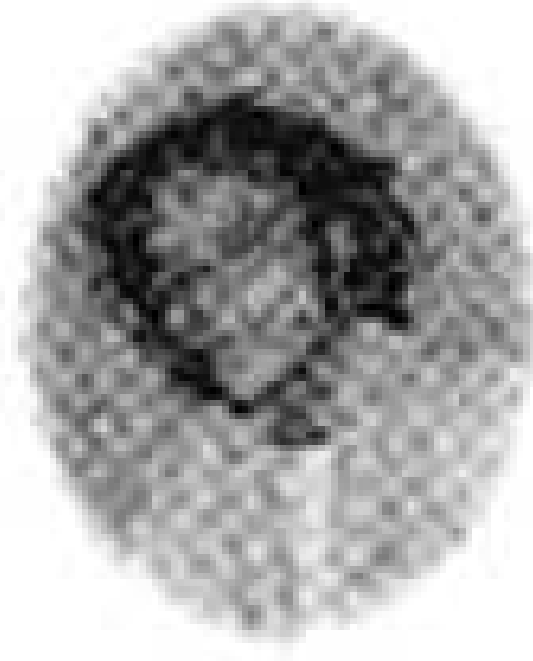
ایک دفعہ جون ایلیا نے اپنے بارے میں لکھا کہ میں ناکام شاعر ہوں۔
اس پر مشفق خواجہ نے انہیں مشورہ دیا:
''جون صاحب! اس قسم کے معاملات میں احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔ یہاں اہلِ نظر آپ کی دس باتوں سے اختلاف کرنے کے باوجود، ایک آدھ بات سے اتفاق بھی کر سکتے ہیں۔''

مشفق خواجہ کہتے ہیں کہ محسن بھوپالی نے مجھے بتایا کہ دورانِ سفر، جون ایلیا کی وجہ سے ایک اور مسئلہ بھی پیدا ہو گیا۔ مشاعرہ گردوں کی ٹولی جہاں بھی جاتی تھی، جون ایلیا کو ان کے بالوں کی وجہ سے خاتون سمجھا جاتا تھا۔ کئی مرتبہ ہوٹل کے بیروں نے انہیں ''میڈم'' کہہ کر مخاطب کیا اور اہل کار نے انہیں روک کر کہا، ''خواتین کا باتھ روم دوسری طرف ہے۔''
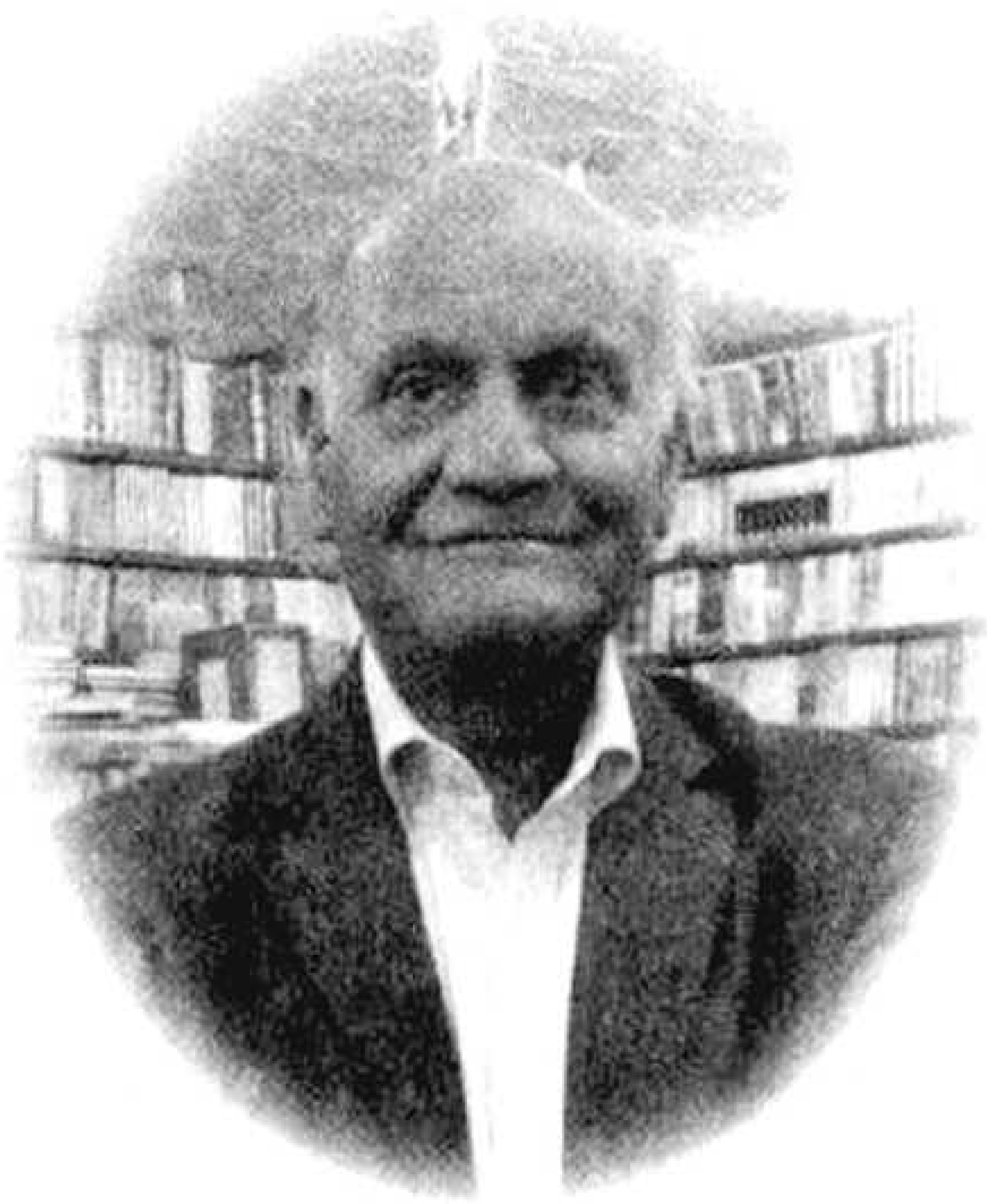
انور مسعود

ولادت: ۸ نومبر ۱۹۳۵ء (گجرات)

پاکستان کے مایہ ناز شاعر جناب انور مسعود صاحب کی بذلہ سنجی کا اندازہ لگائیے کہ ایک روز اچانک ہی بک کارنر جہلم وزٹ کرنے کا سوچا اور قریب پہنچ کر راستہ معلوم کرنے کے لیے شاہد حمید کو فون کیا:

''شاہد صاحب! انور مسعود بول رہا ہوں؟ ''جہلم دے پُل تے'' پہنچ گئے آں ----''ہن کیہ کریئے''؟

دراصل ''جہلم دے پُل تے'' انور مسعود صاحب کی ایک نظم کا عنوان ہے اور ----''ہن کیہ کریئے'' ان کی کتاب کا نام!

پنجابی کے نامور شاعر انور مسعود صاحب، ڈاکٹر انعام الحق جاوید کے ہمراہ بک کارنر شوروم، جہلم تشریف لائے۔ بیٹھتے ہی بے تکلف اور خوشگوار گفتگو کا تبادلہ چل نکلا۔ اتنے میں گھر سے اہتمام کیے گئے چینی کے برتنوں میں چائے پیش کی جانے لگی تو امر شاہد نے پوچھا:

''سر چینی کتنی؟''

''چینی نہیں!.....چینی کی پیالی ہی کافی ہے۔''

اتنا کہنا تھا کہ محفل کشتِ زعفران بن گئی۔

اورینٹل کالج لاہور میں انور مسعود فارسی کے طالب علم تھے، ان کی کلاس کے پروفیسر وزیر الحسن عابدی نے ایک دفعہ چپڑاسی کو چاک لانے کو کہا۔ چپڑاسی نے بہت سے چاک جھولی میں ڈالے اور لے کر حاضر ہوگیا۔ اس سے پہلے کہ کوئی کچھ کہتا۔ انور مسعود شرارتی لہجے میں بولے:

''سر! دامنِ صد چاک، اسی کو کہتے ہیں۔''

استاد جن کی صحبت سے بہرہ مند ہونے کا موقع انور مسعود کو ایف اے اور بی اے میں ملا، وہ چودھری فضل حسین تھے۔ یہ وہی استاد ہیں، جنھوں نے انور صاحب کی صلاحیتوں کو بھانپ کر انھیں میڈیکل سائنس سے آرٹس کی جانب لانے کا فریضہ انجام دیا تھا۔ چودھری صاحب کے بارے میں انور مسعود لکھتے ہیں:

''۔۔۔ چودھری صاحب سے میں نے فارسی پڑھی ۔۔۔ چودھری فضل حسین کا لیکچر بڑا کھلا ڈلا ہوتا تھا۔ شگفتگی اور پنجابی زندہ دلی ان کا طرہ امتیاز تھا۔ ان کا کوئی طالب علم ان کی کلاس میں کبھی بور نہیں ہوتا تھا۔ وہ فارسی شاعری کی تفہیم کے لیے زیادہ تر امثال و شواہد پنجابی کے عظیم شعرا کے کلام سے لاتے تھے۔ فارسی کی نزہتیں پنجابی کی لطافتوں سے مل کر بہت مزہ دیتی تھیں۔ پروفیسر صاحب کو پوری طرح احساس تھا کہ برصغیر کی جملہ زبانوں میں پنجابی فارسی سے قریب ترین ہے۔ یہاں تک کہ اس کا نام بھی فارسی کا لفظ ہے۔ چودھری صاحب کا لیکچر اس اعتبار سے بھی بڑا خستگی رہا ہوتا تھا کہ وہ لطیفوں کے ٹوٹے بھی لیکچر میں جڑ دیتے تھے۔ بعض لطیفوں سے وہ طلبا کو یقین دلا دیتے تھے کہ

زمن بگیر کہ اے جانمن جواں شدہ ای۔ چودھری فضل حسین فارسی کے علاوہ نفسیات میں بھی ایم۔ اے تھے۔ وہ اپنی نفسیاتی مہارت کو بھی لیکچر میں خوب استعمال کرتے تھے۔ وہ جملہ تدریسی حربوں سے بات کو اس طرح ذہن نشین کر دیتے تھے جسے فارسی میں ''خرفہم کردن'' کہتے ہیں یعنی بات گدھے کی سمجھ میں بھی آ جائے۔''

مشفق خواجہ

ولادت: ۱۹ر دسمبر ۱۹۳۵ء (لاہور)

وفات: ۲۱ر فروری ۲۰۰۵ء (کراچی)

ایک محفل میں ایک صاحب کافی دیر سے اپنی تعریف میں باتیں کر رہے تھے۔
باتیں کرتے کرتے اُنہیں اپنا ماضی بے اختیار یاد آیا، فرمانے لگے: ''ہمارے بچپن کا زمانہ بھی کیا سستا زمانہ تھا۔ دایہ بچہ جنوا کر تھوڑا سا گڑ اور آٹھ آنے لے کر خوش ہو جاتی تھی۔''

مشفق خواجہ پچھلی صف میں بیٹھے یہ باتیں سن رہے تھے۔ یہ جملہ سنتے ہیں اُن صاحب سے یوں گویا ہوئے۔

''اور آٹھ آنے میں بچے بھی آپ جیسے ہی پیدا ہوتے تھے۔''

یہ سنتے ہی پوری محفل زعفران زار بن گئی۔

ایک محفل میں کسی نے مشفق خواجہ سے کہا:

''ہندوستان کے اُردو ادب پر بعض ''چندوں'' کا غلبہ ہے، جیسے پروفیسر گیان چند، پروفیسر گوپی چند اور پروفیسر حکم چند۔''

مشفق خواجہ نے برجستہ کہا:

''مگر جناب! یہی تو معدودے چند ہیں۔''

مشفق خواجہ صاحب کے پاس ایک صاحب اپنا دیوان لے کر آئے اور اس پر ان کی رائے لکھوانے کی خواہش ظاہر کی۔ خواجہ صاحب نے معذرت کی تو شاعر صاحب نے کہا:

''مجھے اندازہ تھا آپ مصروف ہوں گے، اس لیے میں چند سطریں لکھ لایا ہوں،

آپ ان پر دستخط کر دیں۔"

یہ چند سطریں کہاں تھیں، ان کا سلسلہ کئی صفحات پر پھیلا ہوا تھا۔ شاعر صاحب نے ان میں اپنا موازنہ غالب سے کر رکھا تھا، اس طرح کہ غالب مغلوب نظر آتے تھے۔

خواجہ صاحب نے دستخط سے انکار کرتے ہوئے کہا: "میں دستخط نہیں کر سکتا۔"

انکار سن کر شاعر صاحب بولے: "کوئی بات نہیں، آپ دستخط نہیں کر سکتے تو انگوٹھا ہی لگا دیں۔"

ہندوستان کے ایک شاعر باقر مہدی نے ایک جگہ لکھا ہے:

"میں دو، تین آدمیوں کو بھی خوش نہیں رکھ سکتا۔"

اس جملے پر پاکستان کے مشہور محقق اور مزاح نگار مشفق خواجہ نے لکھا:

"یہ بات دُرست نہیں کہ وہ دو تین آدمیوں کو بھی خوش نہیں رکھ سکتے، ہم کم از کم ایسے تین آدمیوں سے واقف ہیں، جنہیں باقر مہدی نے بہت خوش رکھا ہے۔ ان میں سرفہرست تو خود باقر مہدی ہیں اور حسن اتفاق سے باقی دو افراد کا نام بھی باقر مہدی ہے۔"

ضیاء الحق قاسمی مدیر "ظرافت" نے جنرل ضیاء الحق کی قصیدہ گوئی کے سلسلے میں ایک مجموعہ شائع کیا۔ اختر انصاری اکبر آبادی کو دفنانے کے بعد قبرستان سے باہر نکلتے ہوئے قاسمی صاحب نے مشفق خواجہ کو کتاب پیش کی۔ خواجہ صاحب نے کتاب کا ورق پلٹا اور واپس کرتے ہوئے کہا:

"ضیا صاحب! ایک دن میں دو دو جنازے اُٹھانے کی مجھ میں ہمت نہیں۔"

مظہر امام کی تصنیف ''اکثر یاد آتے ہیں'' میں تقریباً آٹھ لوگوں کے خاکے ہیں۔ مشفق خواجہ نے کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر کتاب میں شامل تمام مضامین کو شخصی خاکے تسلیم کرلیا جائے تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ مظہر امام نے آٹھ ادیبوں پر نہیں لکھا بلکہ آٹھ ادیبوں نے مظہر امام پر مضمون لکھے ہیں۔''

کراچی کی ایک طرحدار خاتون کا فون آیا۔ ''میں آپ سے ملنے کے لیے گھر آنا چاہتی ہوں۔''

''مت آیئے!''

''کیوں؟''

''میری بیوی کو اعتراض ہوگا۔''

''یہ بات ہے تو میں اپنے خاوند کے ساتھ آجاتی ہوں۔''

''اس پر مجھے اعتراض ہوگا۔''

جگن ناتھ آزاد نے ایوب واقف کی مرتبہ کتاب ''جگن ناتھ آزادؔ۔ ایک مطالعہ'' کی جلد مشفق خواجہ کو پیش کی تو انہوں نے کہا: ''اس پر کچھ لکھ دیجیے۔''

جگن ناتھ آزادؔ نے کہا کہ اس شرط پر لکھوں گا کہ آپ یہ کتاب پڑھیں گے۔ اس پر مشفق خواجہ بولے: ''اس ذرا سے احسان کی اتنی بڑی قیمت طلب کر رہے ہیں آپ؟''

جگن ناتھ آزاد مشفق خواجہ سے ملنے گئے تو بات چیت میں بار بار اپنی کتابوں کی غرقابی کا تذکرہ بڑے درد ناک انداز میں کرتے رہے اور یہ بھی کہتے رہے: ''اس میں نہ

صرف مطبوعہ کتابیں ضائع ہوئیں بلکہ کچھ غیر مطبوعہ تصانیف کے مسودے بھی برباد ہو گئے۔"

خواجہ صاحب جب آٹھ دس دفعہ سیلاب کی دلخراش داستان سنا چکے تو عرض کیا:

"اگر اجازت دیں تو ایک دردانگیز واقعہ بلاتشبیہ میں بھی عرض کروں۔"

آزاد صاحب نے کہا: "سنایئے!" تو خواجہ صاحب بولے:

"چند برس قبل ایک مشہور ادیب کے ہاں اتفاق سے آگ لگ گئی۔ اس میں ان کے کتب خانے کی بہت سی نادر کتابیں اور غیر مطبوعہ تصانیف کے مسودے بھی جل کر راکھ ہو گئے۔ خانہ سوختہ ادیب کے کچھ دوست اظہارِ ہمدردی کے لیے آئے اور آتش زدگی کے واقعے پر افسوس کا اظہار کیا۔ البتہ ایک دوست نے اپنے جذبات کا اظہار اس انداز سے کیا:

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ کے کتب خانے کا جل جانا ایک دردناک سانحہ ہے۔ جہاں مطبوعہ کتابوں کا جل جانا افسوس ناک ہے وہاں غیر مطبوعہ تصانیف کا غیر مطبوعہ رہ جانا اطمینان کا باعث ہے۔ یقیناً یہ آپ کا نقصان ہے لیکن یہ بھی تو دیکھئے آپ کے قارئین بے شمار متوقع نقصانات سے بچ گئے۔"

اس پر جگن ناتھ آزاد ہنسنے پر مجبور ہو گئے اور باقی جتنے دن وہاں رہے انہوں نے کتابوں کی غرقابی کا ذکر نہیں کیا۔

۱۹۸۴ء میں یوسف بخاری کا نیا مجموعہ کلام "دامن یوسف" شائع ہوا تو انہوں نے دیباچہ میں انکشاف کیا کہ جب وہ دوبئی میں تھے، وہ ارشاد احمد ارشاد نامی شاعر سے غزلیں لکھوا کر مشاعروں میں نہایت ترنم سے سنایا کرتے تھے۔ بخاری صاحب نے بہ فرمودہ ارشاد غزلوں کے کچھ شعر بھی درج کیے تھے، جو یقیناً بہت اچھے تھے۔ بخاری صاحب نے دیوان، مشفق خواجہ کی خدمت میں پیش کیا۔ انہوں نے دیباچہ پڑھا، کلام پر ایک نظر ڈالی اور بولے:

"اگر زیر نظر مجموعہ میں شامل غزلیں بھی ارشاد احمد ارشاد سے لکھوائی ہوتیں تو یہ مجموعہ سال رواں کا بہترین شعری مجموعہ قرار پاتا۔"

یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین پاکستان گئے تو ان کے اعزاز میں بہت محفلیں منعقد ہوئیں اور مضامین پڑھے گئے جن میں دونوں کی تعریف کرتے ہوئے کہا گیا کہ ہندوستان میں مجتبیٰ حسین اور یوسف ناظم کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے۔ اس پر مشفق خواجہ نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا: ''ان لوگوں سے پوچھ تو لو کہ یہ ڈنکا از خود بج رہا ہے یا یہ لوگ خود بجا رہے ہیں۔''

ہندوستان کے ایک محقق کاظم علی خاں تھے۔ ہمارے ہاں کے محقق مشفق خواجہ ان سے لکھنؤ میں ملے، اس ملاقات کا دلچسپ قصہ خواجہ صاحب کے الفاظ سنیں:

ہم نے شومئی قسمت سے پوچھ لیا۔ آج کل آپ کس موضوع پر تحقیق کر رہے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ وہ مصحفی کے ایک ہم عصر بھورے خاں آشفتہ کے سالِ وفات پر کام کر رہے ہیں۔ دو گھنٹے تک وہ ہمیں اس کے نتائج سے مستفید فرماتے رہے، جب بھورے خاں آشفتہ کا مُردہ اچھی طرح خراب ہو چکا تو انہوں نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا، جیسے ہم ہی بھورے خاں آشفتہ ہوں۔ پھر پوچھا، آپ کی کیا رائے ہے؟ ہم نے کہا: ''آپ نے بھورے خاں کے ساتھ خود ہمارا بھی سالِ وفات ہی نہیں، تاریخ، مہینہ اور دن بھی متعین کر دیا ہے۔ ہمارا جواب سن کر وہ خوش ہوئے اور بولے: ''جی ہاں! تحقیق میں اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ آپ کسی ایک شخص کا سالِ وفات تلاش کریں تو بہت سو کے سالِ وفات خود بہ خود معلوم ہوتے چلے جاتے ہیں۔''

ناہید اختر نے مشفق خواجہ سے ذکر کیا کہ احمد فراز اور پروین شاکر کی شاعری کے مطالعے سے ان کے اندر بھی شاعری کا شوق پیدا ہوا۔

خواجہ صاحب نے جواب دیا:

''بڑی خوشی کی بات ہے کہ احمد فراز اور پروین شاکر کی شاعری کا کوئی مثبت نتیجہ ظاہر ہوا۔ اکثر لوگ تو ان دونوں کے کلام سے متاثر ہو کر شاعری ترک کر دیتے ہیں۔''

ایک محفل میں مشفق خواجہ کے سامنے مجروح سلطان پوری کے دو شعر فیض احمد فیض کے شعر کہہ کر سنا گئے۔ انہوں نے اعتراض کیا اور کہا: ''یہ اشعار فیض کے نہیں ہیں۔'' کئی لوگوں نے خواجہ صاحب سے بحث شروع کر دی اور اصرار کیا کہ یہ اشعار فیض ہی کے ہیں۔

خواجہ صاحب نے مجروح سلطان پوری کا مجموعہ کلام، بحث کرنے والے نقاد کے سامنے رکھ دیا جس میں یہ دونوں شعر موجود تھے۔

نقاد صاحب نے مجروح کے اسی شعری مجموعے کو الٹا پلٹا اور بولے: ''یہ تو جعلی ایڈیشن ہے۔''

خواجہ صاحب نے کہا: ''یہ پاکستان میں مجروح کی اجازت سے چھپا ہے اور اس پاکستانی ناقد محمد علی صدیقی کا دیباچہ بھی ہے۔ وہ کسی جعلی ایڈیشن پر دیباچہ نہیں لکھ سکتے۔''

نقاد صاحب نے جب دیکھا کہ ان کا دعویٰ بے بنیاد ثابت ہو رہا ہے تو انہوں نے کہا: ''محمد علی صدیقی کا دیباچہ بھی تو جعلی ہو سکتا ہے۔''

خواجہ صاحب نے کہا: ''کہیئے تو محمد علی صدیقی سے فون پر بات کرا دوں؟ معلوم کر لیں دیباچہ اصلی ہے یا جعلی۔''

نقاد صاحب بولے: ''اس کی کیا ضمانت ہے کہ فون پر اصلی محمد علی صدیقی سے بات ہو؟ کوئی جعلی آدمی بھی تو ان کے نام سے بات کر سکتا ہے۔''

ایک دفعہ جون ایلیا نے اپنے بارے میں لکھا کہ میں ناکام شاعر ہوں۔

اس پر مشفق خواجہ نے انہیں مشورہ دیا:

"جون صاحب ! اس قسم کے معاملات میں احتیاط سے کام لینا چاہئے ۔ یہاں اہلِ نظر آپ کی دس باتوں سے اختلاف کرنے کے باوجود، ایک آدھ بات سے اتفاق بھی کر سکتے ہیں۔"

مشفق خواجہ سے ایک شاعر موصوف نے اپنے بے ربط و بے بہرہ شعری مسودے پر رائے حاصل کرنے کے لیے اخلاقی سماجی دباؤ برتا تو مشفق خواجہ نے بادل نخواستہ مسودہ پر تحریر کیا کہ: "جو لوگ کتاب نہیں پڑھتے یہ کتاب ان کے لیے مفید ہے۔"

مشفق خواجہ کی ایک مشہور نقاد سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہا: "میں نے پانچ برس تک ایک انگریزی اخبار میں اردو کتابوں پر تبصرے لکھے۔ اس سارے عرصے میں ایک بھی ڈھنگ کی کتاب پڑھنے کو نہ ملی۔ افسوس کہ میرے پانچ سال ضائع ہو گئے۔" خواجہ صاحب نے عرض کیا: "آپ کو اپنے پانچ برسوں کے ضائع ہونے کا ملال ہے جب کہ ہمارے مصنّفین اپنی پوری پوری زندگیاں ضائع کر دیتے ہیں، پھر بھی خوش رہتے ہیں۔" جناب نقاد نے فرمایا: "وہ اس لیے خوش رہتے ہیں کہ وہ کتابیں لکھتے ہیں اور میرے ملال کا سبب یہ ہے کہ میں انہیں پڑھتا ہوں۔"

مشفق خواجہ لکھتے ہیں: ہمارے ملک میں مصنف تو ختم ہو جاتا ہے، لیکن اس کی کتاب کا پہلا ایڈیشن کبھی ختم نہیں ہوتا۔

بشیر بدر

پیدائش: ۱۵ فروری ۱۹۳۵ء (ایودھیا، یوپی)

لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں خوش فکر، خوش آواز اور خوبصورت شاعرہ شمیم نگہت نے کہا کہ ''یہ شعر ڈاکٹر بشیر بدر کی نذر ہے۔'' بشیر بدر فوراً بولے: ''ارشاد، مگر دھیان رکھیے گا کہ آپ کے شوہر اور میری بیگم دونوں یہاں موجود ہیں۔''

علی گڑھ میں جب میں میری نانی کے ساتھ رہتا تھا اور وہ میرے منہ سے اکثر خلیل الرحمٰن اعظمی، شہر یار اور بشیر بدر کا نام سنتی رہی تھیں۔ ایک دن میری غیر موجودگی میں بشیر بدر گھر آئے۔ جب میں آیا تو نانی مرحومہ نے اطلاع دی: ''تمہارے ملنے والے 'شہر بدر' صاحب آئے تھے۔''

نینی تال کلب میں مشاعرہ ہو رہا تھا جس کی نظامت کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کر رہے تھے مشاعرے کے اختتام پر جب بشیر بدر اور وسیم بریلوی پڑھنے کے لیے باقی تھے تو انھوں نے اپنی محبت کا اظہار کیا: ''یہ میری دونوں آنکھیں ہیں، میں کس کو پہلے بلاؤں اور کس کو بعد میں۔'' بشیر بدر خود ہی اٹھ کر مائیک کے پاس آ گئے جہاں سے شاعر اپنا کلام سنا رہے تھے اور بولے: ''مجھے بے حد افسوس ہے کہ عالی جناب کنور صاحب، اب ایک آنکھ سے محروم ہو رہے ہیں۔''

راجندر سنگھ بیدی کی باتیں بہت دلچسپ اور بے ساختہ ہوتی تھیں۔ ایک بار دہلی کی ایک محفل میں بشیر بدر کو کلام سنانے کے لیے بلایا گیا تو بیدی صاحب نے جو میرے برابر بیٹھے

تھے۔ اچانک میرے کان میں کہا: ''یار! ہم نے دربدر، ملک بدر اور شہر بدر تو سنا تھا، یہ بشیر بدر کیا ہوتا ہے؟''

شاہ آباد ہردوئی میں مشاعرہ ہو رہا تھا بشیر بدر نظامت کر رہے تھے۔ حنا کلکتوی صاحبہ ترنم سے غزل سنا رہی تھیں۔ کسی لڑکے نے انکے ترنم کے مزاحیہ انداز میں نقل کی، لوگ ہنسنے لگے، حنا کلکتوی خالص خواتین کے لہجے میں ناراض ہونے لگیں۔ کئی لوگوں نے ناظم مشاعرہ سے کہا کہ وہ کیوں خاموش ہیں۔ بشیر بدر بڑے اطمینان سے بولے: ''میں بہن بھائی کے جھگڑے میں نہیں پڑتا۔''

لکھنؤ میں کوی سمّیلن اور مشاعرہ ملا جلا ہو رہا تھا۔ ہندی کا اناؤنسر غالباً سود فیض آبادی تھے اور اُردو کے بشیر بدر، سود صاحب نے جیسے یہ طے کر لیا تھا کہ اُردو اور ہندی کی شاعری کے برابر جوڑی دار لوگوں کو وہ پیش کریں مثلاً کسی مترنم شاعر کو بشیر بدر نے بلایا تو انھوں نے اس سے بھی زیادہ مترنم کوی کو بلایا۔ بشیر بدر نے گھن گرج دار شاعری کے نمایندہ شاعر کو آواز دی تو اس کے بعد سود صاحب دیررس کے مشہور کوی ہرجیندر راوتھی (پرنسپل بدایوں) کو بلایا۔ پھر بشیر بدر نے شاعرہ کو بلایا تو ادھر سے کوتری بھیجی گئیں۔ بشر بدر یہ نہلے پر دہلا بار بار لگائے جانے پر متفکر تھے۔ انھوں نے اسٹیج پر چاروں طرف دیکھا اور بولے حضرات اب ایسے شاعر سے درخواست کروں گا کہ ہمارے ہندی کے دوست ان کے جواب میں کسی کوی کو تب ہی بھیج سکتے ہیں جب کوی کی دونوں آنکھیں پھوڑ دیں اور یہ کہہ کر انھوں نے مشہور نابینا شاعر سلیم کھتولی سے غزل سرائی کی درخواست کی۔

امروہہ میں مشاعرہ بہت سکون سے چل رہا تھا، شاعر بھی مطمئن اور سننے والے بھی خوش کہ بیچ مجمع سے ایک بہت معقول شخصیت والے صاحب اٹھے اور کھڑے ہو کر عادل لکھنوی کی طرف اشارہ کر کے بولے: ''ڈاکٹر صاحب! وہ شاعر جن کی صورت تارہ مسیح (جس جلاد نے وزیراعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی تھی) کے ہُو بہ ہُو ہے انہیں پڑھوا دیجیے۔'' بشیر بدر نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ عادل لکھنوی کو دعوتِ سخن دیتے ہوئے کہا: ''میں شاعری کے تارہ مسیح کو درخواست کرتا ہوں کہ تشریف لائیں اور امروہہ کے ذوالفقار علی بھٹو کا کام تمام کر دیں۔''

شکوہ آباد میں بشیر بدر، والی آسی، عالم فتح پوری کالکا میل میں الہ آباد جانے کے لیے ایک سیکنڈ کلاس سلیپر میں چڑھے مگر کنڈکٹر نے یہ کہہ کر واپس اتار دیا کہ کوئی جگہ نہیں ہے۔ بشیر بدر نے بہت منت سماجت سے کہا، جو آپ کہیں پیش کر دوں، ہم لوگ شاعر ہیں اگر یہ ٹرین نہیں ملی تو بڑا نقصان ہو جائے گا۔ اس بار کنڈکٹر نے بہت تلخ اور سخت لہجے میں کہا تم سے بڑے شاعر ہم خود ہیں۔ تم اس ڈبے میں نہیں آ سکتے۔ اتنے میں روانگی سگنل ہو گیا۔ بشیر بدر بہت مایوسی سے بولے کہ ٹھیک ہے ہم نہیں جائیں گے۔ لیکن اگر تم واقعی شاعر ہو تو ہماری مجبوری اور بے بسی کا اندازہ لگا لو گے اگر راستے بھر تم اپنا کلام سناتے چلو تو ہم اُف بھی نہیں کریں گے۔ کنڈکٹر نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا آؤ، اور مطلع ملاحظہ ہو۔

ایک مشاعرے میں بشیر بدر نے تسنیم صدیقی کا تعارف ذرا رومانی ڈھنگ سے کرایا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ تسنیم صدیقی مشاعرے میں پڑھتے وقت چھیڑ چھاڑ سے نہیں چوکتیں۔ وہ جب مائیک پر آئیں تو کہنے لگیں: ''میں ڈاکٹر صاحب کا بہت احترام کرتی ہوں کہ میرے بڑے ہیں۔'' بشیر بدر نے کہا: ''محترمہ، میری عمر کسی کو نہ بتائیے گا۔ اس لیے کہ میری اور آپ کی عمر میں صرف نو مہینے کا فرق ہے۔''

ایک مشاعرے کی نظامت کے فرائض بشیر بدر کر رہے تھے۔ شاعروں کو داد دی جا رہی تھی۔ واہ واہ کے ساتھ مجمع سے کسی شریر لڑکے نے کتوں کی طرح بھوں بھوں کر کے داد دی۔ بشیر بدر نے کہا: ''ہر شخص کو اپنی مادری زبان میں داد دینے کا حق حاصل ہے۔''

جھریا (دھنباد) بہار میں جناب کنور مہندر سنگھ بیدی کی نظامت میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ مرحوم ناظر خیامی نے اپنے مزاحیہ کلام اور اس سے بھی بہتر گفتگو سے مشاعرہ لوٹ لیا۔ اس کے بعد کنور صاحب خود کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ ''حضرات'' ناظر نے اپنے فن سے دلوں پر فتح پائی ہے۔ آپ سب زندگی کی پریشانیوں کو بھول کر قہقہوں کی دنیا میں کھو گئے ہیں۔ ایسے میں کسی سنجیدہ شاعر کو بلانا اسے قربان کرنا ہوگا۔ اس لیے میں خود پڑھتا ہوں اور خود کو قربانی کے لیے پیش کرتا ہوں۔'' اس پر بشیر بدر کھڑے ہو گئے اور کنور صاحب سے بیجا مداخلت کی معافی چاہتے ہوئے بولے کہ ''میں ایک شرعی مسئلہ یاد دلانے کے لیے حاضر ہوا ہوں وہ یہ کہ اسلام میں عیب دار کی قربانی ممنوع ہے۔''

دہلی کے مشاعرے میں بشیر بدر نے جمیلہ بانو دہلوی کا تعارف بڑے خلوص اور احترام سے کرایا۔ جمیلہ بانو جیسے ہی مائیک پر آئیں، مجمع میں سے کسی نے کہا: ''اماں! السلام علیکم'' یہ جسارت ریشم میں ٹاٹ کا پیوند لگی۔ جمیلہ بانو کچھ زیادہ ہی ناراض ہونے لگیں تو بشیر بدر نے کہا کہ ''محترمہ! آپ ناحق خفا ہو رہی ہیں۔ میں اس لڑکے کو جانتا ہوں، اس نے کبھی اپنے باپ تک کو سلام نہیں کیا، یہ تو آپ کی شخصیت کا اعجاز ہے کہ اسے بڑوں کو سلام کرنا آ گیا۔ جمیلہ بانو اور بھی برہم ہوئیں اور بولیں: ''بشیر بدر صاحب! ان لڑکوں کو دراصل آپ ہی

نے بگاڑ رکھا ہے۔'' بشیر بدر نے کہا: ''سنیے میڈم! بچوں کی خرابی میں ماں باپ دونوں ہی برابر کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔''

لکھنؤ میں مشاعرہ تھا۔ بشیر بدر جب کئی غزلیں پڑھ چکے، مجمع سے ایک زوردار آواز آئی: ''ڈاکٹر صاحب! وہ چاندنی کا بدن والی ہو جائے۔'' بشیر بدر نے مائیک پر شرارت بھرے انداز میں کہا: ''نہیں اس کے بھائی بھی یہاں بیٹھے ہیں۔''

اعظم گڑھ کے ایک قصبے میں سامعین کا یہ موڈ ہو گیا کہ پرانی غزل یا پرانا کلام نہیں سنیں گے۔ بیکل اتساہی اور وسیم بریلوی نے جتنی غزلیں یا نظمیں انہیں یاد تھیں، سب کا پہلا مصرع سنانے لگے اور مجمع سے آواز آتی رہی کہ سنی ہوئی ہے۔ آخر کار ان لوگوں نے مہلت مانگی کہ جائے قیام سے اپنی اپنی بیاضیں لے آئیں۔ بشیر بدر بھی سراسیمہ کہ کون سی غزل پڑھیں۔ ان کے پاس ایک اور شاعر بیٹھے تھے۔ وہ بشیر بدر کو ایک مصرع سناتے اور پوچھتے کہ یہ غزل پڑھ لوں۔ پھر وہ خود ہی کہتے، یہ غزل میں وہاں پڑھ چکا ہوں۔ دیکھیے یہ غزل پڑھ لوں۔ بشیر بدر کہتے ہیں: ہاں! پھر وہ کہتے کہ ''یہ میں فلاں قصبے میں پڑھ چکا ہوں۔'' آخر بشیر بدر نے تنگ آ کر کہا: ''بھائی تم سب خوش نصیب شاعر ہو، تمہارا کوئی شعر کسی کو یاد ہی نہیں رہ سکتا، نہ یقین آئے تو تم وہی غزل پڑھ کے دیکھ لو جو گزشتہ برس یہاں پڑھ چکے ہو۔''

ایک مشاعرے میں جیسے ہی بشیر بدر مائیک پر آئے مجمع سے آواز آئی۔ ڈاکٹر صاحب شادی کر لیجیے بشیر بدر نے برجستہ جواب دیا: ''پیغام کا شکریہ۔ اتنا اور بتا دیں کہ جن محترمہ کا پیغام آپ لائے ہیں وہ آپ کی کون ہیں۔''

علی گڑھ میں مشاعرہ ہو رہا تھا کرن جھانسوی صاحبہ نے جب اپنی غزل شروع کی تو آواز ہلکی سی چیخ بن گئی۔ ہزار ہا طلبہ نے اسی لہجے میں چیخ نکالی۔ کرن جھانسوی صاحبہ گھبرا کے مائیک کے پاس اس طرح بیٹھیں کہ جیسے چکرا کر رہ گئی ہوں۔ بشیر بدر اٹھے، کرن جھانسوی کا بازو پکڑ کر برہمی سے بولے کہ ''علی گڑھ کا ایک زمانہ تھا جہاں جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی، فراق گورکھپوری، فانی بدایونی کے کلام کے متعلق کوئی ایسا جملہ سامعین کی طرف سے آجاتا تھا کہ جس میں ذہانت کی چمک بھی حدادب میں رہتی تھی۔ آج جب کہ اُردو کی یہ زبوں حالی ہے کہ آپ لوگ ....ابھی بشیر بدر یہ جملہ پورا نہیں کر پائے تھے کہ ایک ذہین لڑکے نے بشیر بدر کی جو کرن جھانسوی کی بانہہ پکڑے کھڑے تھے۔ کیمرہ سے تصویر اُتار لی۔ چاروں طرف سے مبارک باد کا شور اُٹھ گیا۔ بشیر بھائی مبارک ہو! بشیر بھائی مبارک ہو! اور بشر بدر اس اچانک مبارک باد کے شور کو سُن کر مسکراتے ہوئے بغیر شکریہ ادا کیے اپنی نشست کی طرف روانہ ہو گئے۔

بشیر بدرؔ کی نظامت میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ ایکتا شبنم نے شعر پڑھتے پڑھتے کہا: ''بشیر بھائی یہ شعر ملاحظہ ہو۔'' بشیر بدر بولے: ''میڈم! مجھے جان سے مار دیجیے، مگر بھائی نہ کہیے۔''

مئوناتھ بھنجن میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ بشیر بدر کنڈکٹ کر رہے تھے۔ راحت اندوری جن کا رنگ گہرا سانولا سلونا ہے اور ان کی سرمستی کا دور تھا۔ مائیک پر آتے ہی بولے کہ حضرات میں کل سے بہت خوش ہوں۔ دراصل اپنے رنگ کی وجہ سے شرمندہ رہتا تھا لیکن بابو جگجیون رام نائب وزیر اعظم کی صدارت میں مشاعرہ پڑھنے کا موقع ملا۔ ان کے رنگ کو اگر آپ ذہن میں رکھیں تو میں خاصا قبول صورت آدمی ہوں۔ بابو جی کو دیکھنے کے بعد میں بہت خوش ہوں۔
بشیر بدر نے کہا کہ بابو جی بھی بہت خوش ہیں کہ ان کی قوم میں اتنا اچھا شاعر پیدا ہو گیا۔

دل شاہ جہاں پوری مرحوم کے وسیع صحن میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ بشیر بدر جب مشاعرہ میں داخل ہوئے تو قدرتی طور پر سامعین کی توجہ ہٹ گئی۔ وہ شاعر جو اپنا کلام سنا رہے تھے، انہوں نے ماحول کو متوجہ کرنے کے لیے کہا: ''حضرات میرا یہ شعر تو ضائع ہو گیا۔'' اچانک فضا مکدر ہو گئی تھی۔ بشیر بدر بولے: ''ہاں بھائی! ہم تو گرد و غبار ہیں، مگر چھا جاتے ہیں۔''

پٹنہ یونیورسٹی کے مشاعرے میں بشیر بدر آٹو گراف لینے والوں میں گھرے تھے۔ ایک طالب علم نے کہا: ''سر! مجھے آپ کا ایک شعر سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ مطلب بتا دیں۔'' بشیر بدر نے کہا کہ ''تمہاری بات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ میرے کچھ شعر تمہاری سمجھ میں آ چکے ہیں...... فی الحال ان شعروں کا مطلب مجھے بتا دو؟'' لیکن لڑکے نے طالب علمانہ رویے سے کہا کہ اس شعر کا کچھ کچھ مطلب مجھے معلوم ہے۔ آپ سے تصدیق چاہتا ہوں۔ آپ علی گڑھ میں پڑھتے تھے اور پروفیسر آل احمد سرور جن کے بال پہلی برف باری سے زیادہ اُجلے اور خوبصورت ہیں، وہ صدر شعبہ تھے۔ آپ جس لڑکی سے بہت محبت کرتے تھے ایک دن جب وہ سرخ جوڑا پہن کر آئیں اور ابھی آپ نظر بھر کے اسے دیکھ بھی نہیں پائے تھے کہ پروفیسر آل احمد سرور کا چپراسی اس لڑکی کو لے گیا کہ محترمہ...... صاحب نے یاد کیا ہے۔ اسی فوری جھلاہٹ میں غالباً آپ نے یہ شعر کہا ؎

حقیقت سرخ مچھلی جانتی ہے
سمندر کتنا بوڑھا دیوتا ہے

بشیر بدر خدا کی قسمیں کھانے لگے۔ ایسا کچھ نہیں تھا پھر سرور صاحب لڑکی ہو کہ لڑکا سب کے ساتھ پدرانہ سلوک کرتے ہیں۔
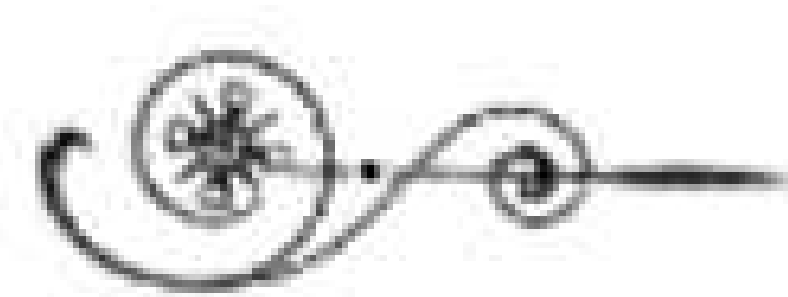
مستنصر حسین تارڑ

ولادت: ۱ مارچ ۱۹۳۹ء (لاہور)

مستنصر حسین تارڑ کو اطلاع ملی کہ ہندوستان سے ایک شاعر آئے ہیں جنہوں نے لاہور میں قدم رکھتے ہی بیان دیا ہے کہ وہ تو بس یہاں مستنصر حسین تارڑ سے ملنا چاہتے ہیں۔

یہ بیان مستنصر حسین تارڑ تک پہنچا تو کہنے لگے:

''مجھے پہلی بار اپنے ادبی مرتبے کی سربلندی کا احساس ہوا اور میں نے دیگر ادیبوں کو نظرِ حقارت سے دیکھنا شروع کر دیا کہ میاں انڈیا میں ہماری ایسی دھوم ہے۔''

ملاقات ہوئی تو موصوف کہنے لگے:

''میں تو آپ سے صرف اس لیے ملنا چاہتا تھا کہ جب کبھی ہم ریڈیو کے لیے نیوز کاسٹر بھرتی کرتے ہیں تو اُنہیں پڑھنے کے لیے تحریر دیتے ہیں...... اُس میں کہیں آپ کے نام کا اضافہ کر دیتے ہیں...... اگر تو اُمیدوار آپ کا نام اٹکے بغیر پڑھ جائے تو وہ پاس، ورنہ فیل...... صرف اس لیے آپ سے ملنا چاہتا تھا...... آپ کے نام کی وجہ سے...... شنید ہے کہ آپ کچھ لکھتے لکھاتے بھی ہیں...... کیا لکھتے ہیں؟''

مستنصر حسین تارڑ اپنے سفر نامے ''نتلی پیکنگ کی'' میں لکھتے ہیں:

بیجنگ میں جگہ جگہ میڈیکل سٹور نظر آئے اور شیشوں کے پار لوگ، ان میں دوائیاں خرید رہے ہوتے جب میں نے نمائش شدہ اشیا کو ملاحظہ کیا تو وہاں دواؤں کی جگہ مرتبانوں میں چھپکلیاں، وہیل مچھلیوں کے فتلے، بارہ سنگھوں کے سینگھ وغیرہ سجے تھے میں نے اپنی گائیڈ ''وانگ'' سے پوچھا ''بھئی یہ کیا ہے؟''

''یہ مردوں کے لیے ہے۔''

''کیوں عورتوں کے لیے کیوں نہیں؟''

وانگ لی جان گئی کہ میں ایک بدھو بوڑھا ہوں اور مسکرا کر کہا:

''دراصل ان دواؤں کا فائدہ عورتوں کو ہی پہنچتا ہے۔''

اور وانگ لی نہ شرمائی نہ جھجکی اور کہا:

''آپ کی عمر کے لوگ تو بہت شوق سے یہ مرکب خریدتے ہیں۔ آپ سیلز گرل کو بتا دیں کہ آپ کس قسم کے نتائج چاہتے ہیں، وہ آپ کو مطلوبہ مرکب دے دے گی۔''

تب میں نے اپنی عمر اور اس سے بڑھ کر خاص کر اپنی بیگم کی بزرگی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے یہ خیال ترک کر دیا۔

مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

سڑک پر چلتے چلتے اچانک ایک بورڈ آیا جس پر بڑی لکھائی میں ''سیکس میوزیم'' لکھا تھا۔ میں اس بورڈ پر ایک حسرت بھری نظر ڈال کر چلنے کو تھا کہ مجھے دیکھ کر اچانک میری بیوی میمونہ نے نہایت سنجیدگی سے کہا:

''ارے! آپ اندر سے ہو آیئے، میں باہر انتظار کرتی ہوں۔''

اگرچہ میں دل ہی دل میں اس سیکس میوزیم کو دیکھنے اور اندر جانے کو مرا جاتا تھا لیکن میں نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا ''توبہ توبہ بیگم!! ایسے واہیات میوزیم میں جا کر کیوں اپنی عاقبت کو مزید خراب کروں؟؟ جانے وہاں کیسی کیسی اور کیسا کیسا اخلاق باختہ نمائش پر ہوگا.. توبہ توبہ!!''

میں اپنی بیگم کی وسیع النظری کا قائل ہونے کو تھا کہ مجھے نہ جانے کیوں یہ ہلکا سا شک ہوا جیسے اس نے یہ اجازت میوزیم کی جانب مجھے دیکھتے ہوئے قدرے طنزیہ انداز میں مرحمت فرمائی تھی۔ جیسے شکاری پرندے کے آگے دانہ ڈالتا ہے کہ وہ اسے چگے... لاکھ شکر ہے کہ میں نے عین وقت پر سمجھداری کا مظاہرہ کیا۔

ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

''ہمارے ملک میں صرف قلم کے سہارے زندگی کی گاڑی چلانا آسان نہیں۔ مگر مستنصر نے یہ کام بھی کر دکھایا کہ صرف قلم اور ٹیلی ویژن کے سہارے خوش اور خوشحال رہا۔ اب جبکہ نئی شادی کی عمر گزار لی تو ٹیلی ویژن پر دوسروں کے بیاہ کرا رہا ہے۔ ہم دوست اس کی نرگسیت کا مذاق اڑاتے تھے بلکہ میں نے لکھا تھا کہ مستنصر حسین تارڑ نرگسیت کے پاسپورٹ پر سفر کرتا ہے مگر تب ہم گہرائی تک نہ جا سکے جسے ہم نرگسیت سمجھتے تھے وہ عزت نفس کا احساس تھا اور یہ بُری بات نہیں......''

مستنصر حسین تارڑ، معروف ادیب عبداللہ حسین کے بارے میں لکھتے ہیں:

''عبداللہ حسین کو نہ ہی اپنی قامت کے برابر کی چار پائی نصیب ہوئی اور نہ ہی کوئی نقاد''

مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

میرے ایک سیالکوٹی دوست ہوا کرتے تھے پروفیسر ملک زمرد۔۔ کتابیں پڑھنے کا جنون تھا، مال روڈ کے انٹرنیشنل بک ڈپو میں حسب معمول کوئی کتاب انتخاب کر کے پڑھ رہے تھے کہ دل کا دورہ پڑ گیا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ ملک صاحب کو جب ایمبولینس میں ڈالا جا رہا تھا اور وہ سانسوں کی کشمکش میں نڈھال تھے تو سر اٹھا کر کہنے لگے:

''بھئی وہ کتاب تو میرے ساتھ رکھ دو جو میں پڑھ رہا تھا۔''
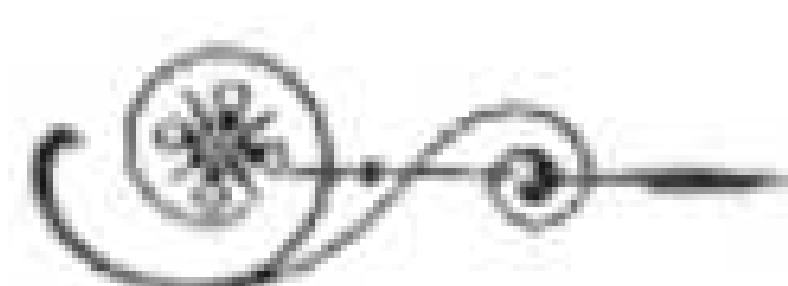
عطاء الحق قاسمی

ولادت: ۱ فروری ۱۹۴۳ء (وزیر آباد)

"تیسری آنکھ" اور "تمہارا پاؤں، تمہارا سر" جیسی دو منفرد کتابوں کے مشہور مصنف کنور عبدالماجد نے الحمراء ادبی بیٹھک لاہور میں ناصر زیدی کو بتایا کہ 2001ء میں جب مَیں نے اپنی پہلی تصنیف "تیسری آنکھ" جماعت اسلامی کے رہنما قاضی حسین احمد کو پیش کی تو وہ کتاب پڑھنے کے چند روز بعد ہی جیل چلے گئے۔"

ناصر زیدی نے مشورہ دیا کہ اب آپ اپنی نئی کتاب "تمہارا پاؤں، تمہارا سر" علامہ ڈاکٹر طاہر القادری کو پیش کر دیں"۔

پاس بیٹھے طنزیہ کالم نویس عطاء الحق قاسمی نے گرہ لگائی: "ہوسکتا ہے، وہ کتاب پڑھے بغیر ہی جیل چلے جائیں"....!

عطاء الحق قاسمی نے ایک محفل میں جب آدھے گھنٹے میں پانچواں یا چھٹا سگریٹ سلگایا تو بیرون ملک سے آئے ہوئے ایک دوست نے کہا۔ یار عطا تم سگریٹ زیادہ پینے لگے ہو۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ تم سگریٹ کم کیوں نہیں کرتے...... عطا نے اتفاق رائے کرتے ہوئے کہا۔

میں بھی یہی سوچتا ہوں۔ اب ان شاء اللہ کم کر دوں گا۔

اس دوست نے فوراً کہا...... کم کر دوں گا نہیں ابھی کم کر دو۔ ان کو لاؤ ایک سگریٹ مجھے دو۔

کوہ نور میرج ہال جہلم میں ڈاکٹر طارق عزیز کے نام ایک شام منائی گئی۔ اس تقریب میں عطاالحق قاسمی بھی موجود تھے۔ جب وہ خطاب کے لیے تشریف لائے تو بولے کہ میں دو وجہ سے لمبی تقریر نہیں کروں گا۔

ایک تو یہ کہ اگر یہ روسٹرم نہ ہوتا تو آپ میری کپکپاتی ٹانگیں دیکھ سکتے تھے اور دوسرا یہ کہ میری کمر میں درد ہے۔

پھر کہنے لگے: ''کمر میں درد دو وجہ سے ہوتا ہے کثرت گناہ اور حسرتِ گناہ سے، میرا درد دوسری قسم سے تعلق رکھتا ہے۔''

یہ سننا تھا کہ ساری محفل کشف زعفران بن گئی۔

راولاکوٹ میں ایک تقریب تھی جس میں کبیر خاں نے عطاء الحق قاسمی اور سید ضمیر جعفری کو مدعو کیا۔ انہیں راولاکوٹ سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ایک نہایت خوبصورت مقام بنجوسہ کے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا گیا تھا جو چاروں طرف سے بلند وبالا اور سرسبز پہاڑوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس کے درمیان میں ایک صاف شفاف جھیل تھی، عطاء الحق قاسمی اور سید ضمیر جعفری اس رُوح پرور ماحول میں واقع ریسٹ ہاؤس میں داخل ہوئے تو ان کا پہلا سامنا اس ریسٹ ہاؤس کے اٹینڈینٹ سے ہوا جس کے متعلق انہیں علم نہیں تھا کہ وہ ہکلا ہے بلکہ بہت ہی ہکلا ہے۔ اس کا اندازہ انہیں اس وقت ہوا جب عطاء الحق قاسمی نے اس کا نام پوچھا تو وہ اپنا نام بتانے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ قاسمی صاحب نے اسے اس مشکل سے نکالنے کے لیے دوسرا سوال کیا جس کا جواب وہ صرف سَر کی جنبش سے دے سکتا تھا، انہوں نے پوچھا:

''یہاں نہانے کو گرم پانی مل جائے گا؟''

اس پر اس کے ہونٹ ملتے محسوس ہوئے، کچھ دیر بعد وہ بولا:

''ن ن ن نور محمد''

یہ قاسمی صاحب کے پہلے سوال کا جواب تھا جو اس کی طرف سے موصول ہوا تھا چناں چہ اس کے بعد دو دن انہوں نے اس سے کچھ نہیں پوچھا۔

صبح صبح عطاء الحق

یہ واقعہ بنجوسہ ریسٹ ہاؤس میں قیام کے اگلے روز کا ہے.......... قاسمی اور سیّد ضمیر جعفری صاحب بغیر ناشتہ کیے چہل قدمی کے لیے ریسٹ ہاؤس سے نکلے، ارادہ تھا کہ پانچ دس منٹ بعد واپس آجائیں گے، چناں چہ قاسمی صاحب نے رات والی شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی جو، اب ''وٹو وٹ'' ہو چکی تھی۔ پاؤں میں ہوائی چپل تھی، ضمیر صاحب نے دھوتی باندھی ہوئی تھی اور ان کے پاؤں میں بھی ہوائی چپل تھی، ابھی چند قدم ہی چلے تھے کہ ایک راہگیر نے ضمیر صاحب کو پہچان لیا، اس نے آگے بڑھ کر عقیدت سے بھر پور مصافحہ کیا۔ پھر ضمیر صاحب کے ہاتھ چومے اور پھر سامنے والے پہاڑ کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا:

''اس پہاڑ کی چوٹی پر سے مقبوضہ کشمیر نظر آتا ہے۔''

ضمیر صاحب یہ سن کر تڑپ اٹھے، کشمیر کے ساتھ ان کی جو جذباتی وابستگی تھی، وہ انہیں اس تصور سے بے چین کیے جا رہی تھی کہ پہاڑ کے دوسری طرف وادیٔ کشمیر ہے جہاں پا بجولاں کشمیری اپنے کسی نجات دہندہ کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ راہ گیر نے ضمیر صاحب کی بے چینی دیکھی تو بولا:

''آئیں چوٹی پر سے آپ کو آپ کے کشمیر کا نظارہ کراتے ہیں۔''

ضمیر صاحب فوراً تیار ہو گئے، قاسمی صاحب نے انہیں روکا اور کہا کہ

''چوٹی بہت بلندی پر ہے، اس لیے آپ کی عمر اور آپ کے تن و توش کے شایانِ شان نہیں، لہٰذا اس ایڈونچر کا خیال دل سے نکال دیں۔''

مگر جہاں وادیٔ کشمیر چند قدم پر نظر آ رہی ہو، وہاں ضمیر صاحب نے بھلا کسی کی

سمنا تھی۔ چناں چہ سب نے پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیا، رستے میں کانٹے دار جھاڑیاں تھیں جن سے ضمیر صاحب کی دھوتی قدم قدم پر الجھنے کی کوشش کرتی تھی، مورادور یہ کہ پگڈنڈی نام کی کوئی چیز نہیں تھی، پہاڑ پر یوں چڑھنا پڑ رہا تھا جیسے چوٹی سَر کر رہے ہوں، نتیجہ یہ کہ تھوڑی دیر بعد ضمیر صاحب نے بہت بُری طرح ہانپنا شروع کر دیا، ان کی زبان باہر کو نکل آئی اور سانس دھونکنی کی طرح چلنا شروع ہو گئی۔ اتنے میں ایک شخص جو پہاڑ پر سے لکڑیاں چن کر واپس آ رہا تھا، اس نے قریب سے گزرتے ہوئے روٹین میں ''السلام علیکم'' کہا.........

ضمیر صاحب نے قاسمی صاحب کو مخاطب کیا اور پھولے ہوئے سانس کے ساتھ بولے:

''قاسمی......... صاحب......... اسے......... میری طرف .... سے .... وعلیکم السلام کہہ دیں۔''

میریلین اور زولا نے فرانسیسی لہجے اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں پوچھا:

''تمہارا نام کیا ہے.........؟''

''پیرزادہ محمد عطاء الحق قاسمی۔''

''ویٹ اے منٹ، ویٹ اے منٹ! یہ سارے کا سارا نام تمہارا اپنا ہی ہے؟''

''یہ تو نام کا ایک حصہ ہے۔ ابھی تو قاسمی کے بعد امرتسری، ثم لاہوری، عفی عنہ وغیرہ جیسے اہم حصے چھوڑ گیا ہوں۔'' عطاء الحق قاسمی گویا ہوئے۔

عطاء الحق قاسمی، پی این سوامی کے جانے بعد ابھی ''باقاعدہ'' قیلولہ کے لیے تیاریاں پکڑ ہی رہے تھے کہ روزنامہ ''سیاست'' کے نوجوان اور دلکش شخصیت کے حامل ذہانت بیگ آ گئے۔ انہوں نے اپنے اخبار کے لیے قاسمی صاحب سے اُردو ادب اور خصوصاً طنز و مزاح کے حوالے سے گفتگو شروع کر دی۔ قاسمی صاحب کہنے لگے:

''ایک منٹ ٹھہر جائیں، آپ کے سارے سوالوں کے جواب دوں گا۔ پہلے آپ میرے دوسوالوں کے جواب دیں۔''

قاسمی صاحب نے کہا:

''پہلی بات یہ ہے کہ یہ حیدر آباد دکن والے مجھے قاسمی صاحب کی بجائے خاسمی صاحب کیوں کہتے ہیں؟''

ہنس کر کہنے لگے:

''آپ بھی تو خود کو ''قاسمی'' کی بجائے ''کاسمی'' کہتے ہیں، اصل میں حیدر آبادیوں اور پنجابیوں دونوں کا ''قاف'' درست نہیں ہے۔ چنانچہ حیدر آباد میں تو جتنے دن بھی آپ رہیں گے، آپ کو عطاء الخ خاسمی ہی بن کر رہنا پڑے گا۔''

یہ عزیز ٹھیک کہتا تھا، چناں چہ قاسمی صاحب نے حیدر آباد دکن میں ایک ہفتہ ''عطاء الحق قاسمی'' کی بجائے ''عطاء الخ خاسمی'' کے طور پر گزارا۔ قاسمی صاحب نے اپنے نام کے سلسلے میں امریکہ اور یورپ میں بھی اسی قسم کے پرابلم کا سامنا کرنا پڑتا رہا ہے۔ چناں چہ عہد شباب میں جدھر سے گزرتے تھے۔ ''قاسمی'' کی بجائے ''کس می، کس می'' کی نسوانی آوازیں آتی تھیں۔

اگلے روز ایک تقریب میں سٹیج سیکرٹری نے اعلان کیا کہ

''خواتین وحضرات! یہ ''تخریب'' سیّد ضمیر جعفری اور ''عطاء الخ خاسمی'' کے اعزاز میں ''منعحد'' ہورہی ہے۔''

تو قاسمی صاحب کے دل کو کچھ صبر سا آ گیا۔

ف۔س۔ اعجاز

ولادت: ۲ مئی ۱۹۵۰ء

ف۔س۔اعجاز اور افضل اقبال کا جہاز کلکتے سے ماسکو جاتے ہوئے دبئی ایئرپورٹ پر اترا، تو یہ لوگ وہاں ایک سونے کے زیورات کی دکان میں داخل ہو گئے۔ افضل اقبال نے خیال ظاہر کیا کہ اگر ''اللہ'' والا سونے کا لاکٹ سستا مل جائے تو خرید کر گلے کا ہار بنالوں۔ ان کی فرمایش پر سیلز گرل نے ایک خوبصورت 18 قیراط سونے کا ایک امبوزڈ نام ''اللہ'' دکھایا اور وزن کر کے قیمت 18 ڈالر بتائی جو تقریباً 500 روپے کے برابر بنتی تھی۔ اتنی کم قیمت پر بھی افضل اقبال اسے خریدنے پر آمادہ نہ ہوئے اور اعجاز سے پوچھا کہ اس کے پاس 24 قیراط سونے کا بنا ہوا ''اللہ'' بھی تو ہوگا۔ اس پر اعجاز نے برجستہ جواب دیا: ''پیارے 18 قیراط کا ''اللہ'' تو خریدا نہیں گیا، 24 قیراط کا اللہ کیا خریدو گے، بھائی اللہ کے سودے تم پیغمبروں اور صوفیوں کے لیے چھوڑو اور جہاز پر چلنے کی تیاری کرو جس کی اڑان کا اعلان واضح الفاظ میں ہو رہا ہے۔

ف۔س۔اعجاز ناروے تشریف لے گئے تو وہاں مقامی اردو شاعر سریش شکلا انھیں شہر دکھانے لے گئے۔ ''گرین لینڈ'' میں گھوم رہے تھے کہ ایک دکان پر نظر پڑی جس پر ''افضل ہیر کٹنگ سیلون'' کا بورڈ لگا تھا۔ چند قدم آگے بڑھے تو سامنے کی سڑک پر ایک اور سیلون نظر آیا، جس کا نام ''اقبال ہیر کٹنگ سیلون'' تھا۔ اس پر اعجاز نے شکلا سے کہا ''کیا ستم ظریفی ہے، میرے دوست افضل اقبال کا نام ان حجاموں نے دولخت کر دیا ہے اور ٹکڑے ٹکڑے کر حجامت کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔'' اس پر سریش شکلا کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔

لندن کے سفر میں ف۔س۔ اعجاز نے جگن ناتھ آزاد کو بالوں میں تیل لگائے ہوئے دیکھ کر کہا: ''بالوں میں تیل نہ لگانے کی وجہ سے میرا بھی سر بھاری رہتا ہے۔ اگر ہو سکے تو تھوڑا تیل مجھے بھی عنایت کر دیجیے۔ ہاں سرسوں کا تیل ہو تو بہتر ہے کیوں کہ ان کے بالوں میں جو تیل لگا ہے اس سے خوش بُو آ رہی ہے۔''

اس پر آزاد نے چہک کر کہا: ''بھئی، کوئی ایسا ویسا تیل نہیں ہے، خالص چنبیلی کا تیل ہے۔'' اور ساتھ ہی بیٹھے بیٹھے اپنا سر ف۔س۔ اعجاز کی طرف جھکاتے ہوئے بولے: ''میرا سر سونگھ کر دیکھو کہ واقعی چنبیلی کے تیل کی خوش بُو ہے نا؟'' ف۔س۔ اعجاز نے فوراً جواب دیا: ''معاف کیجیے میں چھچھوندروں کے اتنا قریب ہونا پسند نہیں کرتا۔'' اس پر ساتھ بیٹھے ہوئے شمشیر سنگھ اور دوسرے سب ساتھی کھلکھلا کر ہنسنے لگے اور ف۔س۔ اعجاز کو محاورے کو برموقع استعمال کرنے کی داد دینے لگے۔
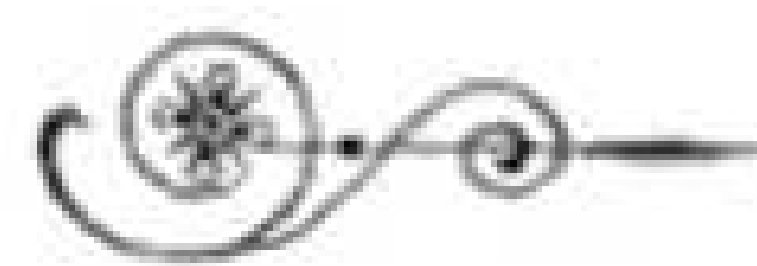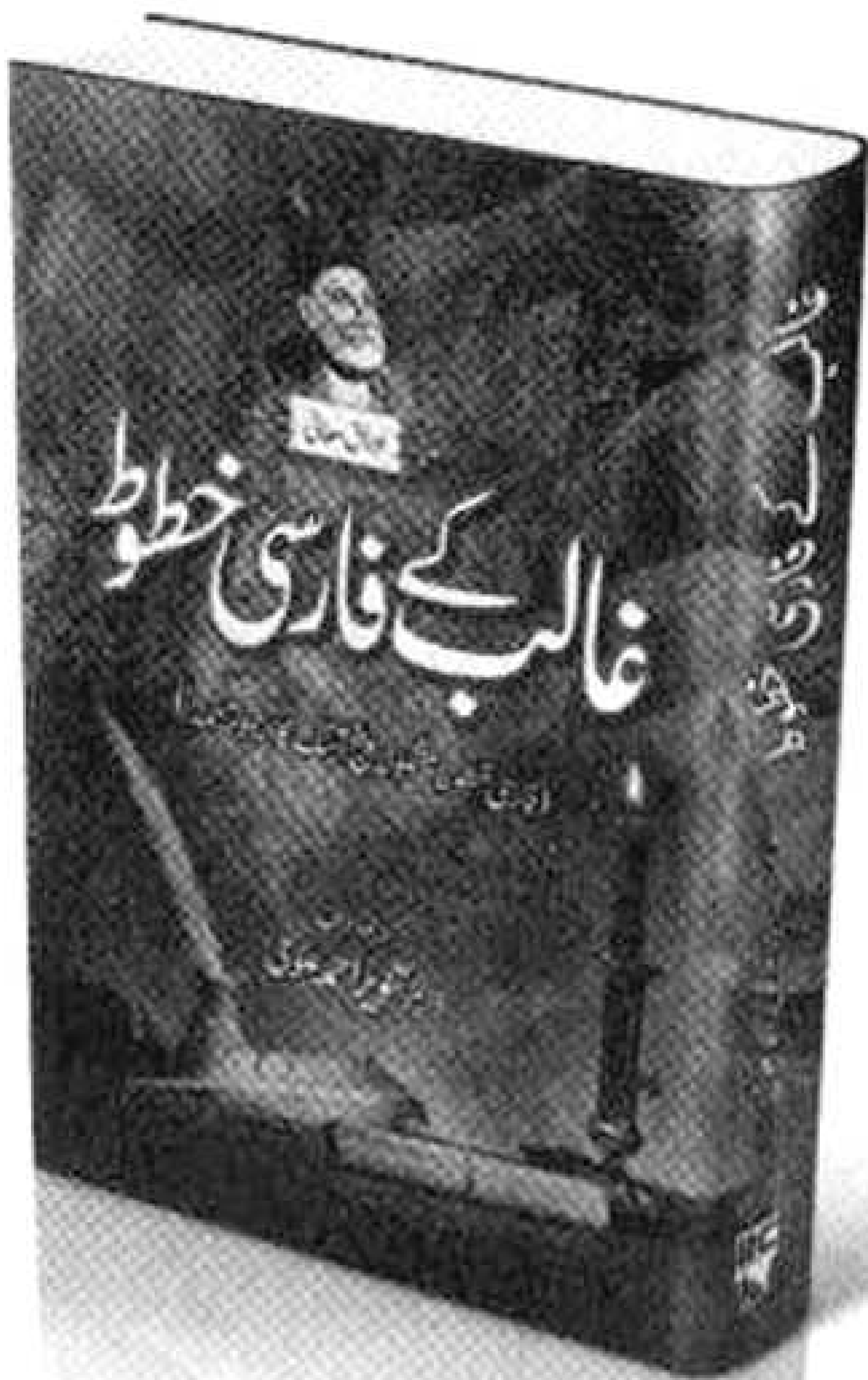
فارسی بیں تا ببینی نقشہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگِ من است

مرزا غالب دہلوی

اگر میرے رنگارنگ مضامین سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہو
تو میری فارسی (تحریر) کو دیکھو
اُردو مجموعے کو چھوڑ، یہ تو بے رنگ ہے۔۔۔

سیّد علی حیدر نظم طباطبائی پہلے شخص ہیں جنھوں نے غالبؔ کے متداول دیوان کی مکمل شرح لکھی ہے۔ ان سے پہلے دیوانِ غالب کی جتنی شرحیں لکھی گئی تھیں وہ جزوی تھیں۔ طباطبائی کی شرح، اوّلیت کے علاوہ اور بھی کئی پہلوؤں سے اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کے مصنف عربی و فارسی کے متبحر عالم اور ان دونوں زبانوں کی شعری روایت اور اصول نقد سے پوری طرح واقف تھے۔ اس کے ساتھ ہی نکتہ سنجی و سخن فہمی سے بھی انھیں بہرۂ وافر ملا تھا۔ اس لئے انہوں نے مشرقی شعریات کو ذہن میں رکھ کر یہ شرح تصنیف کی، نیز مختلف اشعار کی شرح کے دوران سخن فہمی کے عمدہ نمونے پیش کئے ہیں۔ ظفر احمد صدیقی نے نظم طباطبائی کے علم و عرفان کے تعلق سے جن خوبیوں کا ذکر کیا ہے ان میں سے کئی خوبیاں خود اُن میں بھی موجود ہیں۔ اگر نکتہ سنجی اور سخن فہمی نظم طباطبائی کا خاصہ ہے تو یہ صدیقی صاحب کا بھی وصف خاص ہے۔ عربی و فارسی سے واقفیت اور مشرقی شعریات کا شعور و ادراک طباطبائی اور ظفر احمد صدیقی دونوں میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ یکسانیت کے ان روشن پہلوؤں کو ذہن میں رکھتے ہوئے ''شرح دیوان غالب'' کی تدوین نو کے لیے پروفیسر ظفر احمد صدیقی سے بہتر شخص خیال میں نہیں آتا۔

شاہد حمید

(بقلم خود)

ولادت: ۲۶ مئی ۱۹۵۲ء (جہلم)

شاہد حمید کئی کتابوں کا مصنف ہے جن میں سے کئی کتابیں زیر طبع ہیں۔ انہی میں سے اپنی آنے والی خودنوشت سے چند یادداشتیں سپردِ قلم کرنے کی جسارت کرتا ہے۔

ایک کتاب کی کمپوزنگ کی تکمیل کے بعد جب پروف ریڈنگ کا مرحلہ آیا تو شاہد حمید کمپوزر کی ناسمجھی پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

لکھنا تھا:

''اگر کوئی دعوت دے تو اُسے، قبول کرنا چاہیے۔''

خدا جانے کمپوزر کن خیالوں میں تھا......'دعوت' کی جگہ 'عورت' لکھ بیٹھا۔

ایک بار ایک بزرگ بک کارنر شورُوم پر تشریف لائے اور شاہد حمید سے کہنے لگے کہ وہ ''اقوامِ پاکستان کا انسائیکلوپیڈیا'' کے مصنف انجم سلطان شہباز سے ملنا چاہتے ہیں۔ شاہد حمید نے بغور نحیف ونزار بزرگ کو دیکھا اور بولے:

''اس جنم میں تو آپ کی ملاقات ان سے ناممکن ہے۔''

''بھلا وہ کیوں کر؟'' بزرگ حیرانی سے بولے۔

شاہد حمید مذاق بھرے انداز میں کہنے لگے:

''بابا جی وہ پہاڑ کی چوٹی پر رہتے ہیں، وہ نیچے آ نہیں سکتے اور آپ کی صحت سے لگتا ہے کہ آپ پہاڑی کے اوپر جا نہیں پائیں گے۔ اس لیے یہ ملاقات ممکن نہیں۔''

ایسے ہی ایک روز انجم سلطان شہباز اور شاہد حمید بک کارنر پر محوِ گفتگو تھے کہ ایک صاحب آئے اور انجم صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔

انجم صاحب اپنا تعارف کرانے ہی لگے تھے کہ شاہد حمید بول اُٹھے:

''جناب! اُن کو تو اس دُنیا سے گزرے پچیس سال ہو گئے۔''

انجم صاحب جھک کر اُٹھے تھے----ٹھپ سے بیٹھ گئے۔

ایک دِن ایک صاحب آئے اور کہنے لگے، ''میں نے تھوڑی بہت جرمن زبان سیکھ لی ہے، اب میں گوئٹے کا ترجمہ کروں گا۔''

شاہد حمید نے کہا، ''بڑا مبارک خیال ہے، لیکن پہلے وہ زبان بھی تھوڑی بہت سیکھ لو جس میں ترجمہ کرنے کا خیال ہے۔''

راجہ طارق محمود نعمانی نے دیکھا کہ شاہد حمید ایک کتاب کی نظر ثانی میں مصروف ہیں۔ پوچھا کون سی کتاب پڑھ رہے ہو؟

شاہد حمید کہنے لگے حضرت امام جعفر صادق رحمۃ اللہ کی شخصیت پر ایک کتاب ہے۔''

راجہ طارق محمود نعمانی کہنے لگے:

''اگر کہیں تو اِس کتاب پر ایک مقدمہ لکھ دوں؟''

جی ضرور!---شاہد حمید نے کہا:

کچھ ہی دنوں میں راجہ صاحب حاضر ہوئے اور ''مقدمہ'' کے اوراق میرے سامنے پھیلاتے ہوئے بولے:

''لیجیے! مقدمہ حاضر ہے، اِسے فوراً کمپوز کروا کر کتاب میں شامل کر دیجیے!''

شاہد حمید کاغذوں کا ڈھیر دیکھ کر سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ موصوف تین سو صفحات کی کتاب کا ''مقدمہ'' چھے سو صفحات پر مشتمل لکھ لائے تھے۔

ایک شاعر نے اپنا مجموعہ کلام شاہد حمید کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا، ''میں نے اپنا آدھا کلام ردّ کر دیا ہے اور آدھا اس مجموعے میں شامل کیا جائے۔''

شاہد حمید نے مجموعے کی ورق گردانی کرتے ہوئے کہا، ''یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔ پڑھنے والوں کو اس سے بڑی سہولت ہو گی کہ انہیں بھی آپ کا آدھا کلام ہی ردّ کرنا پڑھے گا۔''

شاہد حمید اپنی آنے والی خودنوشت قلمبند کرنے میں مصروف تھے کہ پاس کھڑے ایک شاعر نے دیکھا اور کہا، آپ نے اتنا عمدہ کاغذ ضائع کر دیا۔ اگر یہ کتاب سادہ اوراق پر مشتمل ہوتی تو میں اس پر اپنا کچھ کلام لکھ لیتا۔''

شاہد حمید نے جواب دیا:

''کاغذ تو اس صورت میں بھی ضائع ہو جاتا۔''

ایک غیر معروف شاعر شاہد حمید کے آگے اپنی بے وزن شاعری کی تعریفوں کے پُل باندھے جا رہا تھا اور بضد تھا کہ وہ اپنے خرچے پر اُن کی کتاب شائع کریں۔

شاہد حمید نے کہا:

''جناب آج کل شاعری کوئی نہیں پڑھتا، بہتر ہوگا آپ اس کی اشاعت سے پرہیز ہی کریں۔''

مگر وہ شاعر پھر سے شروع ہوگیا:

''یقین کرو میرے شعری مجموعے کے ایک ایک لفظ کو پرکھا جائے گا۔ وہ بھی بڑے دھیان سے۔''

شاہد حمید اس کی یہ باتیں سُن کر تنگ آگئے اور بولے:

''میں مانتا ہوں تمہارا شعری مجموعہ چھپنے سے پہلے پروف ریڈر پڑھے گا۔ ایک ایک لفظ غور سے پڑھے گا .... اور اس کے بعد.............. چھپ جانے کے بعد........ ....کوئی بھی نہیں پڑھے گا۔''

ایک گاہک دوکان میں داخل ہوا اور کسی شخص پر جادو کرنے والی کتاب مانگنے لگا۔

شاہد حمید نے ایم اے راحت کا مشہور زمانہ ناول ''کالا جادو'' تھماتے ہوئے کہا:

''یہ جادو پر ایک بہترین کتاب ہے، اسے یہاں مت کھولنا ورنہ تم پر بھی جادو ہو جائے گا۔''

شاہد حمید نے اپنی دوکان پر نئے ملازم عمران کو بھرتی کیا جو ہر وقت کتابوں سے واقفیت سے اپنی قابلیت ظاہر کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔

ایک دن ایک کھلنڈرا سا نوجوان دوکان پر آیا اور بولا ''بھائی! مجھے ''کوک شاستر'' کی طرح کی کوئی دوسری کتاب دکھاؤ!''

عمران دوڑتا ہوا گیا اور ''ارتھ شاستر'' کتاب اُٹھا لایا اور بولا یہ اس کا پارٹ 2 آیا ہے، ضرور پڑھیں!

شاہد حمید، کوتلیہ چانکیہ کی قدیم ہندوستانی تمدن پر مبنی اس عظیم کتاب کا یوں مذاق بناتے دیکھ کر سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

ایک صاحب دوکان پر کتابیں دیکھتے دیکھتے یوں گویا ہوئے:

''شاہد صاحب! آپ کبھی مجھے کتابیں یونہی پڑھنے کے لیے بھی دے دیا کریں۔ وہ فلاں کتابوں کی دوکان والا تو مجھے رسالے مفت میں ہی دے دیا کرتا ہے۔''

شاہد حمید نے برجستہ کہا:

''آپ یقیناً کسی اونچی پوسٹ پر ہوں گے۔''

شاہد حمید کے دوست بینک منیجر عمران قریشی صاحب تشریف لائے تو شاہد صاحب کھلے ڈھلے انداز میں شاہانہ بیٹھے تھے۔

عمران صاحب بولے:

''شاہد صاحب! بڑی بے تکلفی سے تشریف فرما ہیں۔''

''جناب! مالک ہیں اپنی دوکان کے، کوئی منیجر تھوڑی ہیں۔'' شاہد حمید یوں ہی روانی میں کہہ گئے۔

ایک مشاعرے میں شاہد حمید نے شرکت نہ کی جبکہ ان کے ایک قریبی دوست وہاں موجود تھے۔ ایک شاعر دوست کہنے لگے کہ یہ اَن پڑھ بندہ ہر مشاعرے میں موجود ہوتا ہے جبکہ تم ایسی محفلوں میں کبھی شریک نہیں ہوتے۔

شاہد حمید نے جواباً کہا:

''وہ خود باذوق نہ سہی ---شاعری اس کے گھر کی لونڈی ہے۔''

موصوف کی بیگم معروف شاعرہ تھیں۔

شاہد حمید نے اپنے ادارے سے ایک کتاب ''شخصیاتِ جہلم'' شائع کی تو ایک مشہور ادیب دوست گِلہ کرنے لگے کہ ''شخصیات جہلم'' میں میرا نام شامل نہیں۔

شاہد حمید کہنے لگے:

''آپ میرٹ پر پورے نہیں اُترتے۔''

وہ ادیب تلخ لہجے میں بولے:

''کیا ہے تم لوگوں کا میرٹ؟''

''مرحوم ہونا''

شاہد حمید کا جواب سُن کر اُن صاحب کو سانپ سونگھ گیا۔

ایک دن شاہد حمید کے پبلشنگ ہاؤس میں ایک سُوکھے سڑے شاعر تشریف لائے۔ کمزور اتنے کہ تیز ہوا میں باہر نکلیں تو شاید اُڑ جائیں۔ شعر و شاعری کے تعارف کے بعد کچھ ذاتیات پر گفتگو ہونے لگی۔

شاہد حمید نے پوچھا: ''کتنے بچے ہیں؟''

فرمانے لگے: ''تیرہ لڑکے، چھے لڑکیاں۔''

شاہد حمید نے اُن کے نازک اور کمزور جسم پر دوبارہ نظر ڈالی تو فرمانے لگے:

''سب اوپر والے کی مہربانی ہے۔''

شاہد حمید کے منہ سے بے اختیار نکلا:

''تمہارے اوپر والے پورشن میں کون رہتا ہے؟''

جہلم کے نامور شاعر مختار جاوید مرحوم، شاہد حمید کے فیملی فرینڈ تھے اور رشتہ داری بھی بنتی تھی۔

شاہد حمید جب اپنے گھر کی بیسمنٹ بنانے لگے تو موصوف فرمانے لگے کہ خوب پیسہ ضائع کر رہے ہو، جتنے میں بیسمنٹ بنا رہے ہو اتنے میں تو پورا گھر بن جاتا ہے۔

جب پبلشنگ کا پروگرام بنایا تو پھر اعتراض کرنے لگے کہ اس میں بہت نقصان ہوتا ہے۔

اللہ رَبُّ العزت نے کرم کیا، شاہد حمید کا بیسمنٹ میں شورُوم بنانے کا پروگرام خوب کامیاب رہا، پبلشنگ میں بھی بہت نام کمایا اور ایک چھوٹے سے شہر سے خوشبو دُور دُور تک پھیلنے لگی۔

مختار جاوید صاحب کے صاحبزادے آج جب شاہد حمید سے ملتے ہیں تو وہ اکثر ازراہِ مذاق اُن سے کہتے ہیں:

"آپ کے ابو کی باتیں نہ مان کر میں نے خوب ترقی کی ہے۔"

ایک روز جہلم میں مشاعرہ منعقد تھا، احمد فراز جیسے بڑے شاعر مہمانِ خصوصی تھے۔

ایک نامور شاعر، شاہد حمید کو بھی مدعو کرنے آئے اور مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی۔ شاہد حمید اپنی مصروفیت کا عذر پیش کرنے لگے۔

وہ مشاعرے میں شرکت کے لیے رغبت بڑھاتے ہوئے یوں گویا ہوئے:

"شاہد صاحب!!! ---وہاں "کوایجوکیشن" بھی ہوگی۔"

وہ بتانا چاہتے تھے کہ وہاں مردوں کے ساتھ خواتین بھی ہوں گی جس کو انہوں نے "کوایجوکیشن" کا نام دے دیا۔

ایک کاروباری دوست اور شاعر میر صاحب ایک دن بک کارنر پر بیٹھے تھے۔ گاہک آگئے تو انہوں نے شاہد حمید سے کچھ کتابیں خریدیں اور پانی کا تقاضا کیا۔ شاہد حمید نے ان کے لیے چھ بوتلیں منگوالیں۔

وہ جب چلے گئے تو شاعر موصوف بولے:

''انہوں نے کتنے کی کتابیں لی ہیں؟''

شاہد حمید نے جواب دیا:

''آٹھ سو روپے کی۔''

یہ سن کر بولے:

''آٹھ سو روپے کے گاہک کے لیے چھ بوتلیں منگوالیں۔ میں تو لاکھ روپے کے گاہک کو بھی اتنی ریفریشمنٹ نہ دوں۔''

شاہد حمید کہنے لگے:

''چودہ سو سال سے دو فریق سامنے آئے ہیں ---- پانی پلانے والی اور پانی روکنے والی۔

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں پہلی کا ہم خیال اور تم دوسری کے ---- پانی روکنے والی یزید کے ہم خیال ----''

ایک روز ایک مشہور شاعر بک کارنر پر اپنی کتاب چھپوانے کے لیے تشریف لائے۔ وہ اپنے شعری مجموعے کی اشاعت کے لیے تحفظات چاہتے تھے۔

کہنے لگے:

''میری کتاب فٹ پاتھ پر نہیں بکنی چاہیے۔''

شاہد حمید نے جواب دیا:

”جناب! میر، غالب، اقبال اور شیکسپیئر کی کتابیں فٹ پاتھ پر عام بکتی دیکھی جا سکتی ہیں----آپ ان سے بھی بڑے شاعر ہیں کیا؟“

ایک دن شاہد حمید کی دُکان پر دو لڑکیاں آئیں۔ انہوں نے 3-3 ڈبے جوتوں کے اُٹھا رکھے تھے۔ کتاب خریدنے کے لیے دو سو روپے والی ایک اسلامی کتاب پسند کی اور مول تول کرتے ہوئے کہنے لگیں کہ رعایت کریں۔

شاہد حمید نے کتاب پکڑ کر واپس رکھ لی اور بولے:

”کتاب رہنے دیں، جا کر ایک جوتا اور لے آئیں لیکن یہ بات آپ کو بتاتا چلوں کہ اللہ تعالیٰ نے آخرت میں بھی آپ کے لیے شاید جوتے ہی رکھ چھوڑیں ہوں گے۔“

ایک روز راجہ طارق محمود نعمانی صاحب شاہد حمید سے اپنے مسودے کی اشاعت سے متعلق ملنے ان کے گھر گئے۔

دروازے پر ان کے صاحبزادے گگن شاہد ملے۔ گگن شاہد دیکھتے ہی بولے:

”السلام وعلیکم!“

راجہ طارق نعمانی صاحب اپنے ہی خیالوں میں گم تھے۔ پوچھا، شاہد صاحب گھر پر ہوں گے؟

گگن شاہد بولے: ”نہیں راجہ صاحب، وہ ذرا باہر کام سے گئے ہیں۔“

راجہ طارق صاحب بولے: ”وعلیکم السلام!“ اور واپس چل دیئے۔
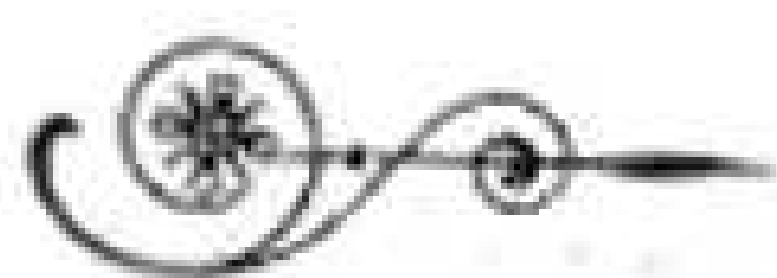
انجم سلطان شہباز

ولادت: ۱۴ ستمبر ۱۹۶۷ء (سیالکوٹ)

ایک روز دو حریف ادیب انجم سلطان شہباز اور کامران اعظم سوہدروی ایک دوسرے سے ملے۔ انجم سلطان شہباز کی کتاب ''شیر شاہ سوری'' کچھ روز قبل ہی شائع ہوئی تھی۔ کامران اعظم نے ان سے کہا: ''میں نے تمہاری کتاب پڑھی ہے۔ بڑی زبردست ہے۔ سچ سچ بتاؤ لکھی کس نے ہے؟'' انجم سلطان شہباز جل بھن کر بولے: ''مجھے خوشی ہے کہ تمہیں کتاب پسند آئی۔ ویسے آپس کی بات ہے پڑھوائی کس سے تھی؟''

ایک دن ایک صاحب مقصود گوندل انجم سلطان شہباز سے ملنے آئے اور اپنی ایک کتاب کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ کافی دیر بعد بولے: ''جناب میں تو یہ کتاب لکھتے لکھتے پاگل ہو گیا ہوں۔'' انجم سلطان شہباز تاسف سے بولے: ''اوہ! تو میں اتنی دیر سے ایک پاگل کی گفتگو سن رہا تھا؟''

ایک بار جہلم کے شاعر طالب قریشی نے انجم سلطان شہباز کو ایک نسوانی تصویر دی اور کہا کہ اسے اپنے میگزین روہتاس رنگ میں شائع کر دیں۔ انجم سلطان نے پوچھا: ''ساتھ کیا لکھوں؟'' ''عصمتِ طالب'' لکھ دیں۔ طالب قریشی بولے۔ ''بس اتنا ہی؟'' انجم سلطان شہباز نے پوچھا۔ ''دو لفظ اپنی طرف سے لکھ دیں۔'' انجم سلطان شہباز نے مسکرا کر کہا: ''چلیں میں ساتھ ''خطرے میں'' لکھ دوں گا۔'' (یعنی ''عصمتِ طالب خطرے میں'')

حکیم سید عابد علی گیلانی اور انجم سلطان شہباز ''گلشنِ بیابان'' ڈومیلی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ عابد علی اپنے خانساماں سے بولے: ''بھئی انجم صاحب کے لیے بریانی تیار کرو اور دیکھو مرغی چٹی (فارمی) نہ ہو!'' پھر ہنس کے کہنے لگے: ''بے شک پڑوسیوں کی پکڑلو پر چٹی نہ ہو!''

انجم سلطان شہباز اور صدیق سورج ایک روز عزیز دہلوی سے ملنے ان کے نگارخانے میں گئے۔ ''دہلوی صاحب آپ تو ہمیں بھول ہی گئے!'' انجم سلطان شہباز نے کہا۔ اس وقت سب لوگ سیڑھیاں چڑھ رہے تھے اور سامنے انہوں نے انجم سلطان شہباز کی بک کارنر سے شائع شدہ کتاب'' تاریخ جہلم'' رکھی ہوئی تھی۔ اس کی جانب اشارہ کر کے بولے: '' بخدا! ہرگز نہیں، آپ کی یاد تو ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتی ہے۔'' اس پر سورج صاحب بولے: '' دہلوی صاحب! پھر تو یہ سیڑھیاں بھی تاریخی ہیں۔''

انجم سلطان شہباز نے اوائل عمری سے ہی تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیا تھا اور بہت سے لوگ انھیں '' بابا'' سمجھتے تھے۔ ایک بار ایک بزرگ ان سے ملنے ان کے ہاں آئے اور انجم سلطان شہباز نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور بات چیت کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد بزرگ بولے: '' بیٹا! اپنے ابو کو بلاؤ میں ان سے ملنے آیا ہوں۔'' جب انجم سلطان شہباز نے بتایا کہ وہی انجم سلطان ہیں تو کافی دیر تک ان کو یقین ہی نہ آیا۔

ایک بار انجم سلطان شہباز اور منظر شاہ، میجر اکرم شہید پارک میں بیٹھے ہوئے '' تاریخ جہلم'' کے حوالے سے بات چیت کر رہے تھے۔ ایک ٹھیکیدار صاحب بھی موجود تھے وہ بولے: '' اگر تاریخ جہلم پہ کام کرنا ہے تو بک کارنر سے شائع شدہ کتاب پڑھیں، جسے تین لوگوں یعنی

انجم، سلطان اور شہباز نے مل کر لکھا ہے۔" منظر شاہ نے ہنستے ہنستے تعارف کرایا کہ یہی انجم سلطان شہباز ہیں اور وہ کتاب انہوں نے ہی لکھی ہے اور یہ تین نہیں ایک ہی ہیں۔ پہلے تو وہ بہت حیران ہوئے پھر کہنے لگے: "ہاں ٹھیک ہے لیکن کام انہوں نے تین آدمیوں جتنا ہی کیا ہے۔"

ایک بار سوہاوہ میں آل پوٹھوہار محفل مشاعرہ تھی جس میں صدیق سورج اور انجم سلطان شہباز نے بھی شرکت کی۔ محفل رات گئے جاری رہی اور انجم سلطان اپنا کلام سنا کر وہاں سے چلے گئے۔ ان کے بعد نقیبِ محفل نے ایک اور شاعر کو پکارا اور جب وہ پڑھ کے چلا گیا تو کہا: "یہ تھے انجم سلطان شہباز جو آپ کو اپنے خوبصورت کلام سے محظوظ کر رہے تھے۔" اس کے بعد اس نے ایک اور شاعر کو پکارا اور جب وہ اپنا کلام ختم کر کے واپس گیا تو نقیبِ محفل نے کہا: "یہ تھے انجم سلطان شہباز جو آپ کو اپنے خوبصورت کلام سے محظوظ کر رہے تھے۔" جب ہر شاعر کے بعد اس نے یہی دہرانا شروع کیا: "یہ تھے انجم سلطان شہباز جو آپ کو اپنے خوبصورت کلام سے محظوظ کر رہے تھے۔" تو سامعین میں سے ایک تپ کر بولا: "یہ انجم سلطان آخر ہیں کتنے؟" اس کے ساتھ ہی نقیبِ محفل کی اونگھ غائب ہوگئی۔

ایک روز دو حریف ادیب انجم سلطان شہباز اور کامران اعظم سوہدروی ایک دوسرے سے ملے۔ انجم سلطان شہباز کی کتاب "شیر شاہ سوری" کچھ روز قبل ہی شائع ہوئی تھی۔ کامران اعظم نے ان سے کہا: "میں نے تمہاری کتاب پڑھی ہے۔ بڑی زبردست ہے۔ سچ سچ بتاؤ لکھی کس نے ہے؟" انجم سلطان شہباز جل بھن کر بولے: "مجھے خوشی ہے کہ تمہیں کتاب پسند آئی۔ ویسے آپس کی بات ہے پڑھوائی کس سے تھی؟"

متفرق شاعروں اور ادیبوں کے لطائف

آغا حشر کاشمیری

آغا حشر بنارس میں پیدا ہوئے اور ان کے ایک پاؤں میں لنگ تھا، جس کی وجہ سے وہ لنگڑا کر چلتے تھے۔ ایک روز آغا حشر اور حکیم شفاء الملک بیٹھے آم کھا رہے تھے۔ آغا حشر آم کھاتے جاتے اور کہتے جاتے تھے: ''بھئی حکیم! بمبئی کے الفانسو کا جواب نہیں، لکھنؤ کا سفیدہ اس کے آگے کیا چیز ہے۔''

''جی بجا ارشاد فرمایا آپ نے۔'' حکیم نے جواب دیا: ''لیکن ہم تو بنارس کے لنگڑے پر لٹو ہیں۔''
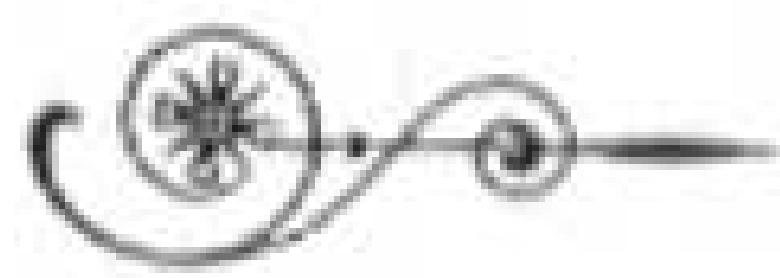
آغا حشر کاشمیری کے شناساؤں میں ایک ایسے مولوی صاحب بھی تھے جن کی فارسی دانی کو ایرانی بھی تسلیم کرتے تھے لیکن یہ اتفاق تھا کہ مولوی صاحب بے کاری کے ہاتھوں سخت پریشان تھے، اچانک ایک روز آغا صاحب کو پتہ چلا کہ ایک انگریز افسر کو فارسی سیکھنے کے لیے اتالیق درکار ہے۔ آغا صاحب نے بمبئی کے ایک معروف رئیس کے توسط سے مولوی صاحب کو اس انگریز کے ہاں بھجوا دیا، صاحب بہادر نے مولوی صاحب سے کہا:

''ویل، مولوی صاحب ہم کو پتہ چلتا کہ آپ بہت اچھا فارسی جانتا ہے۔''

مولوی صاحب نے انکساری سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''حضور کی بندہ پروری ہے ورنہ میں فارسی سے کہاں واقف ہوں۔''

صاحب بہادر نے یہ سنا تو مولوی صاحب کو تو خوش اخلاقی سے پیش آتے ہوئے رخصت کر دیا، لیکن اس رئیس سے یہ شکایت کی انہوں نے سوچے سمجھے بغیر ایک ایسے آدمی کو فارسی پڑھانے کے لیے بھیج دیا جو فارسی کا ایک لفظ تک نہیں جانتا تھا۔

آئن سٹائن

نظریۂ اضافت کے دریافت کنندہ آئن سٹائن ابتدا میں زیادہ نہیں جانے جاتے تھے۔ نظریۂ اضافت پیش کرنے کے بعد انہیں مختلف درس گاہوں میں لیکچر کے لیے بلایا جانے لگا۔ آئن سٹائن ایک روز ایسے ہی سفر پر تھے مگر وہ لیکچر کے موڈ میں نہ تھے۔ ان کے شوفر نے انہیں کہا: ''سر! میں آپ کی تقریر اتنی بار سُن چکا ہوں کہ وہ مجھے زبانی یاد ہو چکی ہے۔''

آئن سٹائن نے کہا: ''ٹھیک ہے، آج میں تھکا ہوا ہوں۔ اتفاق سے جس کالج میں ہم جا رہے ہیں، وہاں ہمیں کوئی نہیں جانتا۔ تم میرا لباس پہن لو اور لیکچر دے ڈالو۔''

کالج پہنچ کر شوفر نے بڑی روانی سے ان کی تقریر دہرائی اور جب اس سے سوالات ہوئے تو اس نے نہایت چالاکی سے کہا: ''میرا وقت بہت قیمتی ہے، آپ کے سوالوں کے جواب تو میرا شوفر بھی دے سکتا ہے۔'' اور ساتھ ہی اس نے آئن سٹائن کو جوابات کے لیے طلب کر لیا۔

آئن سٹائن سفر کرتے ہوئے بھوک لگنے پر کھانے کے کیبن میں پہنچا۔ مینو پیش کیا گیا تو اس وقت اس کے پاس عینک نہیں تھی۔ بہت کوشش کے باوجود بھی جب وہ مینو نہ پڑھ سکا تو اس نے بیرے سے مینو پڑھنے کے لیے کہا تو بیرے نے فوراً جواب دیا:

''معاف کیجیے گا، میں بھی آپ کی طرح اَن پڑھ ہوں۔''

ابن انشاء

جناب ابن انشاء مرحوم نے اپنی کتاب ''خُمار در معقولات'' میں اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ مرزا غالب نے ایک دوسرے شاعر شیخ ابراہیم ذوق کے زمانے میں پیدا ہو کر ذوق کے ساتھ زیادتی کی۔ غالب کی برسیاں منائی جاتی ہیں، دن منائے جاتے ہیں، ان

کے حوالے سے تقریبات منائی جاتی ہیں جبکہ ذوق کا نام لیوا حلقہ اربابِ ذوق کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔
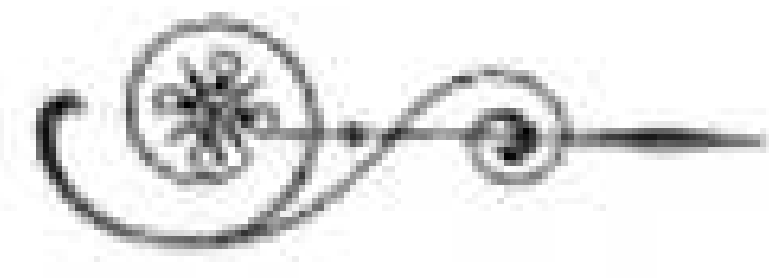
مرزا غالبؔ نے ایک بار بادشاہ کو دُعا دی تھی۔

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

ابن انشا لکھتے ہیں:

''انہوں نے یہ حساب نہ لگایا کہ یہ تو ایک لاکھ تیس ہزار دو سو اٹھانوے سال بن جاتے ہیں۔ اچھا ہوا کہ اُن کی دُعا قبول نہ ہوئی۔ شاہی تو لد گئی تھی، بادشاہ سلامت اتنے دن کیا کرتے، کہاں سے کھاتے؟''

ابن صفی

مشہور جاسوسی ناول نگار ابن صفی سے کسی نے کہا:

''آپ امریکی رائٹر ارل اسٹینلے گارڈنر کی طرح لکھا کریں۔''

ابن صفی نے جواباً کہا:

''جناب آپ ارسل اسٹینلے گارڈنر کو یہ مشورہ کیوں نہیں دیتے کہ وہ میری طرح لکھا کرے؟''
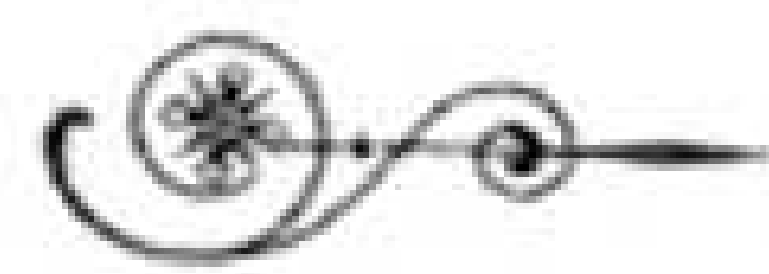
ابن صفی نے ایک سچا لطیفہ اپنے ایک ناول کے پیش رَس میں ذکر کیا ہے۔ جو کچھ یوں ہے:

ایک مدیر صاحب کے پاس شہرہ آفاق مصور ''پکاسو'' پر لکھا گیا اُردو کا ایک بہترین مقالہ آیا۔ مدیر محترم نے فوراً اگلے شمارے میں اشاعت کے لیے برائے کتابت ''کاتب صاحب'' کے حوالے کر دیا۔

مضمون کا عنوان ہی تھا ''پکاسو''

اُردو زبان و ادب کے ''ماہر'' کاتب صاحب جو مشہور مصور ''پکاسو'' کے متعلق کچھ نہ جانتے تھے۔ انہوں نے آنکھیں پھاڑ کر مضمون کے عنوان کو دیکھا پھر مسکرائے اور زیر لب بولے: اچھا ''ر'' لکھنا بھول گئے !!

اب اللہ دے بندہ لے---جہاں جہاں ''پکاسو'' کا لفظ آیا، کاتب صاحب ''ر'' کا اضافہ کرتے چلے گئے---

یوں ہو گیا ایک زبردست مقالہ ''پکا سور'' پر تیار !!

اور مدیر صاحب میز پر سَر کے بل کھڑے سوچتے رہ گئے کہ پڑھے لکھے لوگوں کو کیا منہ دکھائیں؟؟

ابوبکر مصور

ابوبکر مصور (بزم مینائی) بمبئی کی میمن برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ ظاہر ہے مادری زبان گجراتی تھی لیکن عبدالرزاق سعید صاحب (عبد الاحد ساز کے والد)، نسیم مینائی، شباب مینائی وغیرہ جیسے میمن حضرات کی طرح اُردو شاعری سے شغف کے سبب زبان پر عبور حاصل کیا اور بحیثیت شاعر مشہور ہوئے۔ ابوبکر صاحب لکھ پتی تھے اور ہمیشہ چار گھوڑوں کی بگھی میں سفر کرتے تھے۔ اور عموماً رئیس اعظم کے نام سے مشاعروں میں پکارے جانے کو پسند کرتے تھے۔ ان کی ضد میں صبا الٰہ آبادی نے خود کو مشاعروں میں غریب اعظم کہلوانا شروع کر دیا تھا۔

مصور صاحب نے جب اپنا دیوان ترتیب دیا تو بمبئی کے تمام شعرا کو جمع کیا بہت شاندار دعوت کی اور سب کو مجموعہ کلام کے لئے کوئی نام تجویز کرنے کی دعوت دی۔ کچھ نام بتائے گئے جو انہیں پسند نہیں آئے کہنے لگے۔ بھئی میں ''بال جبریل'' قسم کا کوئی نام چاہتا ہوں۔ متیر الٰہ آبادی جل گئے کہنے لگے:

تو پھر ''پشم عزرائیل'' رکھ لیجئے۔ اس پر خوب قہقہے لگے۔

ابونواس

عرب شاعر ابونواس کی ہارون الرشید کے دربار تک رسائی تھی۔ ایک بار ہارون الرشید کی بیگم زبیدہ نے ابونواس سے کہا کہ اس کے بیٹے شہزادہ امین کو شاعری کا شوق ہے، اس لیے وہ امین کو اصلاح دیا کرے۔

ابونواس کیسے انکار کرسکتا تھا۔ امین نے اپنے اشعار اصلاح کے لیے ابونواس کو سنائے تو اس نے عروضی غلطیوں کی نشان دہی کر دی۔ امین کو غصہ آ گیا۔ اس نے اسی وقت ابونواس کو زنداں میں ڈال دیا۔ امین کی اس حرکت کا علم ہارون الرشید کو ہوا تو اس نے ابونواس کی رہائی کا حکم دیا اور بات آئی گئی ہو گئی۔

ایک روز جب امین، ہارون اور ابونواس اکٹھے تھے، ہارون نے امین سے کہا کہ ''امین! تمہارے استاد موجود ہیں، موقع سے فائدہ اٹھاؤ اور اپنے اشعار کی اصلاح کروالو۔''

امین نے چند اشعار پڑھے، ابونواس نے غور سے سنے مگر زبان سے کچھ نہ بولا۔ چپ چاپ اٹھا اور چل دیا۔ ہارون الرشید نے حیرت سے پوچھا: ''ابونواس کہاں چلے ہو؟'' تو ابونواس نے امین کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اور جواب دیا: ''امیرالمومنین! قید خانے۔''

احمد ندیم قاسمی

ایک محفلِ مشاعرہ میں ایک نوجوان شاعر نے احمد ندیم قاسمی کی زیرِ صدارت اُنھی کا کلام اپنے نام سے اعتماد سے سنایا۔ قاسمی صاحب بے بسی سے اُس نوجوان کا منہ دیکھتے رہے۔ تاہم اُس ''شعر چور'' کو اس امر کی داد بہرحال دینی پڑتی ہے کہ کلام پڑھنے کے بعد وہ سیدھا قاسمی صاحب کی طرف آیا اور اُن کے گھٹنوں کو چھوتے ہوئے بولا: ''ہم آپ کے بچے ہیں...... اور بچوں کا حق اپنے بڑوں کے مال پر تو ہوتا ہی ہے۔''

احمد ندیم قاسمی اپنی کتاب ”میرے ہم سفر“ میں لکھتے ہیں:

”دیوارِ چین کی سیر کرنے کے بعد جب ہم لوگ پاکستانی مدیران کا وفد دیوار ہی کے قریب ایک ریستوران میں چائے پی رہے تھے تو ہمارے میزبانوں نے اصرار کیا کہ ہم انہیں پاکستانی قومی ترانہ سنائیں۔ حفیظ صاحب کا لکھا ہوا ترانہ ہمارا قومی ترانہ قرار پایا تھا، مگر یہ نیا نیا واقعہ تھا، اِس لیے یہ ترانہ ہم میں سے کسی کو یاد نہیں تھا۔ چینی دوستوں کی فرمائش پر ہم لوگ بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے، جب مولانا اختر علی خان نے گومگو کی یہ کیفیت اپنی حاضر دماغی سے ختم کر دی۔

انہوں نے ہم سب کو کھڑے ہونے کا حکم دیا، اور اُس کے بعد وہ ہاتھ باندھ کر اپنے اباجی مرحوم مولانا ظفر علی خان کی یہ مشہور نعت پڑھنے لگے، اور ہم سب اُن کے ساتھ شامل ہو گئے:

وہ شمع، اُجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں

چینی دوست مؤدب کھڑے رہے، اور جب ہم نے ”کچھ فرق نہیں اِن چاروں میں“ تک پہنچ کر ”ترانہ“ ختم کیا تو انہوں نے ہمیں اپنا قومی ترانہ سنایا، اور ہم نے بھی مؤدب کھڑے ہو کر یہ ترانہ سنا۔ بعد میں ہم سب واپس ہوٹل میں آئے تو ایک جگہ جمع ہوئے اور فیض صاحب نے ہم سب کی طرف سے مولانا اختر علی خان کا شکریہ ادا کیا کہ اُن کی حاضر دماغی نے ہمیں شرمندہ ہونے سے بچا لیا۔

احمق پھپھوندوی

مشہور مزاح گو شاعر احمق پھپھوندوی ایک مشاعرے میں بلائے گئے جس میں بہت سے شاعر ان کے ناپسندیدہ تھے۔ انہوں نے اپنے تخلص کا سہارا لے کر ان پر یہ چوٹ کی۔

ادب نوازیٔ اہلِ ادب کا کیا کہنا
مشاعروں میں اب احمق بلائے جاتے ہیں

اختر الواسع

اختر الواسع، ہندوستان کے مشہور دانشور ادیب ہیں۔ اٹل بہاری واجپائی جب وزیراعظم تھے تو انہوں نے چند مسلم دانشوروں کو اپنے ہاں مدعو کیا تھا۔ سب نے اپنی اپنی بات کہی، اختر الواسع آخر تک خاموش رہے۔ میٹنگ ختم ہونے لگی تو واجپائی جی نے اختر الواسع کی طرف دیکھ کر کہا:

''آپ نے کچھ نہیں کہا؟''

اختر الواسع نے نہایت معصومیت سے کہا: ''سر! گستاخی معاف، آپ اسلام اور اسلام آباد دونوں کو ایک دوسرے میں گڈمڈ کر دیتے ہیں اور انہیں ایک ہی چیز سمجھتے ہیں۔''

اخلاق احمد دہلوی

جگت بازی اور فقرے چست کرنے اور بات سے بات پیدا کرنے میں اخلاق احمد دہلوی صاحب کا کوئی جواب نہ تھا۔ ایک دن اقبال بانو نے پوچھا:

''آپ کا مذہب کیا ہے؟ ہم نے تو سنا ہے کہ آپ دہریے ہیں؟''

''بھئی ہم تو مادہ پرست ہیں۔''

اخلاق صاحب نے مادہ کو تشدید کے بغیر جنس کے مفہوم میں کہا اور اقبال بانو سمیت تمام محفل کشتِ زعفران بن گئی۔

ارشد مینا نگری

بلڈانہ کے آل انڈیا مشاعرے میں مالی گاؤں کے مترنم شاعر، ارشد مینا نگری غزل سنا رہے تھے۔ غزل ختم ہونے کے بعد کچھ اور پڑھنے کی فرمائش ہوئی۔ ارشد صاحب دوسری غزل سنانے لگے۔ پھر فرمائش ہوئی کہ انہوں نے پھر غزل شروع کر دی۔ اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہا اور ڈائس پر بیٹھے ہوئے دوسرے شعرا اور اناؤنسر بہت پریشان ہوئے کہ کسی طرح یہ

مائیک چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ اتنے میں مختار یوسفی کو شرارت سوجھی، انہوں نے ایک پرچی لکھ کر ارشد مینا نگری کو تھما دی۔ ارشد مینا نگری غزل ادھوری چھوڑ کر مائیک سے ہٹ گئے اور اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئے۔

دیگر شعرا نے مختار یوسفی سے استفسار کیا کہ آخر آپ نے پرچی میں کیا لکھ دیا تھا۔ مختار یوسفی نے بڑی سنجیدگی سے کہا کہ ''میں نے صرف اتنا ہی لکھا تھا کہ ''ارشد صاحب آپ کی پتلون پھٹی ہوئی ہے۔''

استاد امام دین گجراتی

استاد امام دین گجراتی اپنے شاگردوں میں بیٹھے مشقِ سخن فرما رہے تھے۔ انہوں نے شاگردوں کو اپنا ایک تازہ شعر سنایا:

یہ سڑک۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

جاتی ہے جلال پور جٹاں کو

کافی دیر تک واہ واہ ہوتی رہی۔ پھر ایک نئے شاگرد نے ڈرتے ڈرتے کہا:

''استاد جی دوسرا مصرح کچھ زیادہ لمبا نئیں؟''

استاد نے متانت سے کہا:

''تے پترا سڑک چھوٹی ایہہ؟؟؟؟؟''

استاد لطف کٹھالوی

قافیہ پیمائی استاد پر ختم ہے۔ ہزاروں شعر قافیہ پیمائی پر قربان کر چکے ہیں بلکہ کئی دفعہ تو آپ نے بحر اوراوزان کو بھی داؤ پر لگا دیا۔ اپنے اس جنون کی وجہ سے استاد کو کئی بار مار بھی پڑ چکی ہے۔ دو ایک موقعوں پر تو ہم بھی ساتھ تھے، مگر چپ چاپ استاد کو زدوکوب ہوتے دیکھتے رہے کہ اپنی جان کس کو عزیز نہیں ہوتی۔ قافیہ پیمائی کے اس جنون نے استاد کی شاعری کے علاوہ زندگی پر بھی دور رس اثرات چھوڑے ہیں۔

آپ کی تیسری بیوی نے ایک منحوس صبح آپ کو ناشتہ دینے میں جب غیرضروری تاخیر کی تو آپ نے غصے میں اسے آواز دی:

''اے داشتہ کہاں ہے ناشتہ؟''

اس وضاحت و بلاغت کے بعد استاد کو ناشتہ تو خیر کیا ملنا تھا، البتہ بیوی نے خلع ضرور لے لیا۔ اسی طرح بازار میں ایک منحنی قسم کے پھل فروش کو کہنے لگے:

''او ماڑو کیا بھاؤ ہیں آڑو......''

اس قسم کے مصرعے اور اشعار کو آپ نے ''کلام کٹھالوی'' کے نام سے ترتیب دے رکھا ہے۔ جس کا طویل دیباچہ حکیم عبدالرزاق گھرالوی تحریر کر چکے ہیں اور جس میں انہوں نے انکشاف کیا ہے کہ استاد لُطف بعض پوشیدہ امراض کے سلسلے میں ان کے زیر علاج رہے ہیں اور انہی کے مجربات و مفردات و کشتہ جات کی بنا پر ہی اتنے فصیح و بلیغ شاعر ہیں۔

اشرف بخاری

''تمہارا چہرہ چھوٹا دکھائی دے رہا ہے۔'' شاعر اشرف بخاری سے ایک دوست نے کہا: ''چہرہ اتنا ہی ہے حجامت کرائی تھی سر چھوٹی بحر میں آ گیا ہے۔'' اشرف نے جواب دیا۔

اطہر نادر

کراچی کے ایک مشاعرے میں جناب اطہر نادر نے غزل شروع کی۔ اُن کا ایک شعر سامعین نے بہت پسند کیا۔ آواز آئی۔ ''پھر پڑھیے۔'' نادر صاحب نے شعر پڑھ دیا۔ آواز آئی۔ ''پھر پڑھ دیجیے۔'' انہوں نے شعر ایک دفعہ پھر پڑھ دیا۔ اب تیسری بار فرمائش کی گئی کہ ''بہت اچھا شعر ہے، پھر پڑھ دیجیے۔'' اس طرح اطہر نادر صاحب جو پانچ مرتبہ شعر پڑھ چکے تو مجمع نے ''پھر'' کی آواز نہیں لگائی۔ اطہر نادر کچھ دیر کے لیے رُکے اور کہنے لگے۔ ''حضرات! شعر بہت اچھا ہے۔ ایک دفعہ پھر سُن لیجیے۔'' یہ کہہ کر اُنہوں نے چھٹی مرتبہ شعر پڑھ دیا۔

اعجاز صدیقی

اعجاز صدیقی مرحوم (مدیر شاعر) حیدر آباد تشریف لے گئے تو بہت سے ادیب اور شاعران سے ملنے کے لیے آنے لگے۔ رشید الدین صاحب بھی ملاقات کے لیے آئے۔ اکرم جاوید نے اعجاز کو بتایا کہ یہ رشید الدین صاحب ہیں۔ اعجاز صاحب ان کی تحریروں کی وجہ سے انہیں پہچانتے تھے لیکن تعارف پہلی دفعہ ہو رہا تھا۔ مصافحہ کرنے کے بعد بولے: ''آپ تو اچھے خاصے موٹے ہیں پھر اتنا باریک کیوں لکھتے ہیں۔'' یہ سن کر سب لوگ ہنسنے لگے۔

امداد ہمدانی

رام دین بازار جہلم میں ہمدانی ٹی سٹال شاعروں کی مجلس گاہ تھی۔ اعجاز درانی (فلم ہیر رانجھا کا ہیرو اعجاز) ان دنوں جہلم کالج میں تعلیم حاصل کر رہا تھے اور اکثر ہمدانی ٹی سٹال پر آیا کرتا تھے۔ چائے خانے کی دیوار پر میڈم نور جہاں کی ایک خوبصورت تصویر آویزاں تھی۔ اعجاز نے کہا کہ یہ تصویر ان کو دے دی جائے۔ اس پر امداد ہمدانی بولے: ''بہت سے لوگ تو صرف اس تصویر کی وجہ سے چائے پینے آتے ہیں، کیوں میرے کاروبار پہ لات مارنا چاہتے ہو۔''

یہاں سے اعجاز لاہور چلے گئے اور چند سالوں بعد ان کی میڈم نور جہاں سے شادی ہوگئی۔ شادی کے بعد وہ ان کو لے کر جہلم آئے، امداد ہمدانی سے ملاقات کی اور نور جہاں سے ملواتے ہوئے بولے: ''یہ میری بیگم ہیں، آپ نے تو تصویر نہیں دی تھی میں تصویر والی ہی کو لے آیا ہوں۔'' اس کے بعد یہ فقرہ زبان زد عام ہوا: ''محبت بھی ملتی ہے ہمدانی ٹی سٹال سے۔''

امراؤ سنگھ

امراؤ سنگھ جو ہر گوپال تفتہ کے عزیز دوست تھے، ان کی دوسری بیوی کے انتقال کا حال تفتہ نے مرزا صاحب کو بھی لکھا تو انہوں نے جواباً لکھا۔ ''امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے

واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ پچاس برس سے اوپر جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے، تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔''

امیر مینائی

امیر مینائی کو ان کے ایک ہم عصر نے اپنا یہ شعر سنایا:

بے حجاب اس کو کیا شوخی نے میری وصل میں
ایک بات ایسی کہی، جامے سے باہر ہو گیا

تو امیر مینائی نے متانت سے کہا:

غالباً آپ نے ان کو ''بڑی بی'' کہہ دیا ہوگا۔

انجم رومانی

مشہور شاعر انجم رومانی ایک بار پاکستان رائٹرز گلڈ کی ایگزیکٹو باڈی کے الیکشن میں امیدوار تھے۔ اشفاق احمد گلڈ کے سیکرٹری تھے۔ الیکشن کے موقع پر انجم رومانی اپنا نام امیدواروں میں نہ پا کر حیران و پریشان ہوئے کہ وہ اپنے کاغذات نامزدگی اشفاق احمد کے سُپرد کر کے مطمئن تھے۔ انہوں نے اس سلسلے میں اشفاق احمد سے پوچھا۔ انہوں نے کہا: "میری جیب سے وہ کاغذاتِ نامزدگی کہیں گم ہو گئے۔" یُوں مقررہ تاریخ گزر جانے کے سبب انجم رومانی دوبارہ بھی کاغذات نہ جمع کرا سکے اور الیکشن لڑنے سے رہ گئے تاہم انہوں نے ایک قطعہ کہہ کر یُوں اپنا غصہ نکالا:

اشفاق گُم نہ دخترِ "لیل و نہار" گُم
ہوتے ہیں کاغذات مگر بے شمار گُم
"تُو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیئے؟"
صوفی و اختر و اثر و انتظار گُم

انور مقصود

ڈرامہ نگار، دانشور اور طنز و مزاح نگار انور مقصود سے کسی نے پوچھا:

''پاکستانی سیاستدانوں کو الیکشن میں کیسے چُنا جائے؟''

انور مقصود نے بامعنی جواب دیا:

''جیسے اکبر بادشاہ نے انارکلی کو ''چنا'' تھا----دیوار میں---''

انور مقصود ایک بار گورنر صاحب کے قریب تھے۔ کسی کی دستاویز پر دستخط کرنا تھے۔ گورنر صاحب نے قلم کے لیے دائیں بائیں دیکھا تو انور مقصود صاحب نے قلم گورنر صاحب کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا---''سر قلم''

انوری بلخ

فارسی کے مشہور شاعر انوری بلخ بازاروں میں گھوم رہے تھے۔ ایک بازار میں گھومتے ہوئے انہوں نے دیکھا کہ ایک مجمع کے سامنے ایک نامعلوم شخص ان کا کلام سنا رہا ہے۔ انہوں نے آگے بڑھ کو پوچھا: ''جانتے ہو کہ یہ کس کا کلام ہے؟''

نامعلوم شخص: ''بالکل، انوری کا''

''انوری کون ہے؟''

نامعلوم شخص: ''میں خود ہوں۔''

اس پر انوری نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا: ''شعر چور تو سنے تھے لیکن شاعر چور پہلی بار دیکھا ہے۔''

او۔ ہنری

ایک پبلشر کو کہانیوں کی ضرورت تھی۔ اس نے مشہور امریکی کہانی نویس او۔ ہنری سے بات کی۔ او۔ ہنری نے کہا:

''دوسرے دن آ جانا۔''

پبلشر دوسرے دن پہنچا۔ اس نے پوچھا: ''کہانیاں تیار ہیں؟''

او۔ ہنری نے کہا: ''ہاں۔''

پبلشر نے کہا: ''کہاں ہیں؟''

او۔ ہنری نے اپنے سر کو ایک انگلی سے کھٹکھٹایا اور کہا: ''یہاں۔''

اوپندر ناتھ اشک

اوپندر ناتھ اشک کی بیوی کوشلیا نے بتایا کہ اشک خود کو ایک 'مہان لیکھک' سمجھتے تھے، یعنی 'عظیم ادیب'، اور قصہ سنایا کہ ایک بار اُن کے کمرے کی صفائی کرتے ہوئے بہت سی کتابوں کے نیچے سے اُنہیں دو چمچے اور ایک پلیٹ دبی ہوئی ملی۔ انہوں نے حیرت سے اشک کی طرف دیکھا تو اشک بولے: ''ارے! یہاں آدمی دب جانے کی خبر نہ ہو، تم پلیٹ اور چمچوں کی بات کرتی ہو۔ یہ ایک مہان لیکھک کی میز ہے، کسی چپڑ قناتیے کی نہیں۔''
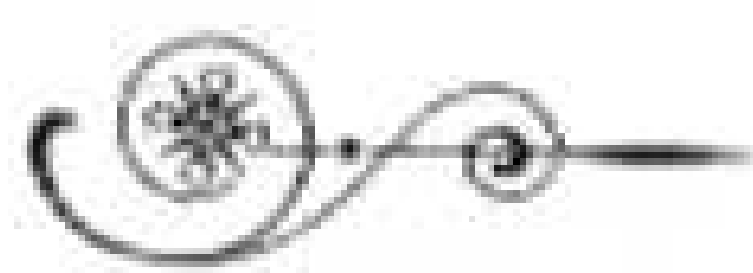
اوپندر ناتھ اشک کے افسانوں کا مجموعہ ''بینگن کا پودا'' شائع ہوا تو محکمۂ زراعت، یوپی نے اس کی ایک ہزار کاپیوں کا آرڈر بھیج دیا۔ کتاب کی کچھ کاپیاں بِک چکی تھیں، لہٰذا اوپندر ناتھ اشک نے دوبارہ ایک ہزار کاپی کا ایڈیشن چھاپ کر انہیں فراہم کر دیا۔ بعد میں افسروں کو پتہ چلا کہ یہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔

اولاد علی

ہندوستانی شاعر اولاد علی کی شادی کے موقع پر اُن کے دوستوں نے پوچھا:

''خط و کتابت کے وقت آپ اپنی بیگم کو کیا لکھیں گے؟''

''آپ کا اولاد'' یا ''آپ کی اولاد''

ایچ جی ویلز

انگریزی مصنف ایچ جی ویلز جب سخت بیمار ہوا اور زندگی کی کوئی امید باقی نہ رہی تو اس کے رشتہ دار، دوست اور لواحقین کی خواہش تھی کہ اس کے منہ سے کچھ ایسے کلمات نکلیں جو بطور یادگار ہمیشہ یاد رکھے جائیں۔ جب ان لوگوں نے اس عظیم مصنف کو بار بار تنگ کیا تو اس نے تلخ لہجے میں جواب دیا: ''آپ دیکھ نہیں رہے کہ میں مرنے میں مصروف ہوں۔''

ایوب خان

فیلڈ مارشل، جنرل ایوب خان کی کتاب ''فرینڈز ناٹ ماسٹر'' کی اشاعت کے دنوں میں ایک صاحب نے کتاب لکھی اور کاغذ خریدنے کے لیے گنپت روڈ گئے۔ کاغذ کے ڈیلروں نے کہا: ''جناب کاغذ کہاں، وہ تو سب کا سب جنرل صاحب کی کتاب کے لیے خرید لیا گیا ہے۔''

وہ شخص حالات کا جائزہ لینے کے لیے ایک پرنٹر کے پاس گیا اور پوچھا کہ اگر وہ اسے اپنی کتاب چھاپنے کے لیے دے تو وہ کتنے دنوں میں چھاپ دے گا؟ پریس والے نے کہا: ''جناب! آپ کیا بات کرتے ہیں، ہمارے پاس تو کان کھجانے کی فرصت نہیں، ہم تو دن کے علاوہ رات کو بھی جنرل صاحب کی کتاب چھاپنے میں لگے ہوئے ہیں، آپ کو کوئی پریس فارغ نہیں ملے گا۔''

کتاب کے مصنف نے یہاں سے جلد سازوں کی دکانوں کا رُخ کیا، مگر ہر ایک نے کہا: ''جناب! ہمارے پاس وقت نہیں، ہم جنرل صاحب کی کتاب کی جلد بندی میں لگے ہوئے ہیں۔''

تاہم جیسے تیسے وہ مصنف اپنی کتاب چھپوانے میں کامیاب ہو گئے۔ اِس مرحلے میں کامیابی کے بعد وہ بک سیلروں کے پاس پہنچا تاکہ وہ اُس کی کتاب اپنی دکان میں فروخت کے لیے رکھ لیں، مگر اُن سب نے کہا: ''جناب! آپ دیکھتے نہیں، ہر طرف جنرل

صاحب کی کتابیں سجی ہوئی ہیں، لوگ دھڑا دھڑ یہ کتاب خرید رہے ہیں، ہمارے پاس کوئی اور کتاب رکھنے کی جگہ ہی نہیں۔'' اِس پر وہ صاحب مایوس ہو گئے۔ جب اُن کی کتاب کو دیمک چاٹنے لگی تو اُنہوں نے سوچا کہ اِسے ردّی ہی میں فروخت کر دیا جائے، چنانچہ وہ ردّی والوں کے پاس گئے، اُنہوں نے کہا: ''جناب! ہمارے پاس جنرل صاحب کی کتاب کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں، ہمارے پاس تو آپ کی کتاب رکھنے کی جگہ ہی نہیں ہے۔'' دراصل اُس وقت جنرل صاحب اقتدار سے فارغ ہو چکے تھے۔

باچا خان

ایک مرتبہ باچا خان اپنی تقریر میں تکرار کر رہے تھے ''میرا قوم'' ایسا ہے۔

مجمعے میں ایک اردو دان شاعر تھے، کہنے لگے: '' خان صاحب! قوم مونث ہوتی ہے، ''میری قوم'' نا کہ ''میرا قوم''۔ یہ سن کر باچا خان بولے: ''جناب! آپ کی قوم مونث ہو گی، میرا قوم تو مذکر ہے۔'' یہ سن کر سارا مجمع ہنس پڑا۔

باقر مہدی

علی گڑھ کی ایک ادبی تقریب میں ہندوستان کے شاعر باقر مہدی نے شرکت کی۔ ایک مشہور ادیب نے ایک مقالہ پڑھا اور بعد میں باقر مہدی سے رائے پوچھی۔ باقر مہدی نے کہا: ''میں بہت بدقسمت آدمی ہوں کیونکہ عموماً خراب مقالوں کے ہی بارے میں مجھ سے رائے دینے کے لیے کہا جاتا ہے۔''

برٹرینڈ رسل

مشہور ادیب اور فلسفی برٹرینڈ رسل ایک بار ایک پہلوان سے ملے۔ اس نے رسل کو دیکھا، وہ بے حد کمزور اور چھوٹے قد کے آدمی تھے۔ اس نے حیرت سے کہا: ''آپ کی شہرت سن کر میں سمجھتا تھا کہ آپ خاصے جان دار آدمی ہوں گے مگر آپ تو بے حد دُبلے پتلے

ہیں۔'' فلسفی رسل نے سنجیدگی سے کہا: ''بھائی! آدمی کے ساتھ ایک مشکل ہے کہ وہ ایک وقت میں ایک ہی کام کر سکتا ہے۔ یا دماغ بنا لے یا بدن۔''

برق دہلوی

اپنے لڑکپن کے زمانے میں ایک بار جب برق دہلوی کے آنکھیں دکھنے آئیں اور ان کے کسی دوست نے حال دریافت کیا تو برق صاحب نے فی الفور جواب میں یہ شعر سنا دیا:

دل تو آتا تھا مگر اب آنکھ بھی آنے لگی
پختہ کاری عشق کی یہ رنگ دکھلانے لگی

بسمل سعیدی

ایک مشاعرے میں ایک نومشق صاحبزادے نے ایک غزل سنائی جس میں بیشتر مصرعے بسمل سعیدی کے تھے۔ جب بسمل سعیدی صاحب اپنی غزل پڑھنے کھڑے ہوئے تو انہوں نے کہا: ''اب میں اپنے کہے ہوئے اشعار خود سنا رہا ہوں۔''

لفظ ''خود'' پر زور دینے پر خوب داد ملی اور قہقہے چلتے رہے۔

بشپ فلٹن شین

اپنی آپ بیتی میں بشپ فلٹن شین نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ وہ فلاڈلفیا میں لیکچر دینے ٹاؤن ہال جا رہے تھے اور رستہ بھول گئے۔ انہوں نے چند نوجوانوں سے رستہ پوچھا۔ رستہ بتانے کے بعد ان لڑکوں نے پوچھا کہ وہ وہاں کیا کرنے جا رہے ہیں؟ بشپ فلٹن شین نے انہیں فخریہ طور پر بتایا کہ وہ وہاں ''جنت جانے کا رستہ'' کے عنوان سے لیکچر دینے جا رہے ہیں۔ اگر وہ چاہیں تو ان کے ساتھ چل سکتے ہیں۔ ان لڑکوں میں سے ایک نے بشپ کا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا: ''کیوں بے وقوف بناتے ہو قوم کو؟ ٹاؤن ہال جانے کا رستہ تو تمہیں معلوم نہیں اور چلے ہو جنت کا رستہ بتانے۔''

پابلونرودا

بین الاقوامی شہرت کے حامل نوبل انعام یافتہ چلی کے شاعر پابلونرودا سے ایک بار انٹرویو کے دوران سوال کیا گیا کہ اس نے اپنا نام ''نرودا'' کیسے رکھ لیا کہ نرودا کوئی چلی نام نہیں۔ نرودا نے مسکرا کر کہا: ''یہ راز میں آج پہلی بار کھولتا ہوں میرے باپ کو بالکل پسند نہ تھا کہ اس کا بیٹا شاعر بنے جب میں نے اپنی پہلی نظم چھپوائی تو سوچا کوئی ایسا نام اپنے نام کے ساتھ جوڑ دوں جس سے میرے باپ کو شک نہ ہو سکے۔ میرے سامنے چیکوسلواکیہ کا ایک رسالہ پڑا تھا۔ میں اس میں کوئی نام تلاش کرنے لگا۔ ایک نام ''نرودا'' سامنے آیا۔ مجھے اچھا لگا اور میں نے اسے اپنے نام کا حصہ بنالیا۔ مجھے برسوں بعد معلوم ہوا کہ ''نرودا'' بھی چیکوسلواکیہ کا ایک بڑا شاعر تھا پھر میں جب پراگ گیا تو میں نے اس شاعر کے مجسمے پر پھول چڑھائے۔''

پروفیسر رشید احمد صدیقی

ڈاکٹر آمنہ خاتون علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں انشا پر پی ایچ ڈی کے لیے کام کر رہی تھیں۔ اُن دنوں پروفیسر رشید احمد صدیقی وہاں صدرِ شعبہ تھے۔ اِسی دوران آمنہ خاتون کے یہاں بچے کی ولادت کا وقت قریب آ گیا تو انہوں نے چھٹی کے لیے درخواست دی۔ درخواست جب رشید صاحب کے یہاں پہنچی تو انہوں نے چھٹی لینے کی وجہ دریافت کی۔ جب رشید صاحب کو معلوم ہوا کہ یہ ماں بننے والی ہیں تو انہوں نے فرمایا: ''ہم نے تو اُنہیں تحقیق کے لیے بلوایا تھا، لیکن انہوں نے تخلیق شروع کر دی۔''

اردو غزل کا ایک رجحان معاملہ بندی ہے، جو جرأت، انشاء اور لکھنؤ اسکول کے دیگر شعرا کے ہاتھوں بہت پھولا پھلا ہے۔ جاں نثار اختر نے جس سال ایم اے کا امتحان دیا اس سال ایک مولانا ٹیچر کینڈیڈٹ کی حیثیت سے امتحان دینے آئے ہوئے تھے۔ آخری دن

''زبانی امتحان'' تھا۔ رشید احمد صدیقی صاحب نے ''مولانا'' سے سوالات کرنے شروع کیے۔ پہلا ہی سوال تھا: ''معاملہ بندی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟''

مولانا نے معذرت پیش کرتے ہوئے کہا: ''مجھے اس قسم کی شاعری سے دلچسپی نہیں رہی۔ بہتر ہوگا کہ آپ غالب، اقبال یا انیس کے بارے میں مجھ سے سوالات کریں۔''

رشید احمد صدیقی صاحب نے کہا: ''میں ان کے بارے میں بھی آپ سے پوچھوں گا لیکن پہلے یہ جاننا چاہوں گا کہ آپ کو معاملہ بندی سے کوئی دلچسپی نہیں یا سرے سے معاملہ سے ہی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

پروفیسر سَیّد امیر کھوکھر

نامور ترجمہ نگار اور ادیب پروفیسر سَیّد امیر کھوکھر کھڑے کھڑے چابی سے کان کھجا رہے تھے، پاس کھڑے امر شاہد بڑے غور سے انھیں دیکھ رہے تھے۔

جب کافی دیر ہوگئی تو وہ بولے:

''جناب! اگر آپ اسٹارٹ نہیں ہو رہے تو مَیں دھکا لگا دوں؟''

پروین مرزا

''رشیدہ جب بھی میرے گھر آتی ہے، میرے میاں سے خوب ہنس ہنس کر ''بھائی جان''، ''بھائی جان'' کہہ کر بات کرتی ہے۔ ''بھائی'' پر کم ''جان'' پر زیادہ زور دیتی ہے۔''

انگلستان کی جانی پہچانی شخصیت پروین مرزا نے سٹیج پر سنایا۔

پریشان خٹک

پشتو کے مشہور ادیب پریشان خٹک مرحوم کو ایک سیمینار کے سلسلے میں کراچی جانا تھا۔ منتظمین نے انہیں لینے کے لئے ایئر پورٹ گاڑی بھیجی تھی، جس کا ڈرائیور ایک ان پڑھ پٹھان تھا۔ وہ ایک تختی، جس پر پریشان خٹک کا نام لکھا تھا، اٹھائے جہاز کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔

شومئ قسمت سے جہاز لیٹ ہو گیا۔ جہاز آنے کے بعد جب پریشان خٹک جہاز سے اتر کر باہر آئے تو دیکھا ایک شخص ان کے نام کی تختی اٹھائے کھڑا ہے۔ وہ سیدھا اس کے پاس گئے اور بطور تعارف کہا: ''میں پریشان ہوں۔''

ڈرائیور نے انہیں غصے میں دیکھا اور کہا: ''زہ مڑہ! ہم تم سے زیادہ پریشان ہے۔''

تخلص بھوپالی

تخلص بھوپالی فطری طور پر ظریف اور بذلہ سنج واقع ہوئے تھے۔ ان کی بات چیت میں بھی بڑی شوخی ہوتی تھی۔ ان کے دو واقعات حال ہی میں نظر سے گزرے وہ پیش ہیں۔

ایک مرتبہ وہ مولانا علی میاں کے پاس بیٹھے تھے، اچانک ایک صاحب آئے اور اطلاع دی کہ پنڈت نہرو کا انتقال ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے مولانا سے سوال کیا کہ اب مسلمانوں کا کیا ہوگا۔ مولانا نے تخلص صاحب کی طرف دیکھا گویا وہ چاہتے ہیں کہ تخلص صاحب ہی اس کا جواب دیں۔ تخلص صاحب نے برملا کہا: میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ اب پنڈت نہرو کا کیا ہوگا۔

ایک بار اور تخلص بھوپالی مولانا کی مجلس میں بیٹھے تھے کہ ایک صاحب آئے اور کہنے لگے کہ حضرت آپ سعودی عرب تشریف لے جا رہے ہیں، اس درمیان اگر میں مر جاؤں تو کتبے پر کیا لکھواؤں؟

مولانا نے مسکرا کر تخلص کی طرف دیکھا تو انہوں نے کہا میرا خیال ہے آپ کتبے پر یہ لکھوایئے کہ ''یہاں پیشاب کرنا منع ہے۔''

تیغ الہ آبادی

برصغیر کے مشہور استاد شاعر تیغ الہ آبادی سے ایک ہم عصر شاعر نے پوچھا:

کیا آپ کی شادی ہو چکی ہے؟

اس سے پہلے کہ تیغ الہ آبادی خود جواب دیتے، شمیم کرمانی بولے:

''اجی قبلہ!! کون ایسا ظالم باپ ہو گا۔ جو اپنی صاحبزادی کو تہ تیغ کرانے پر رضامند ہو گا۔''

جسٹس ایم آر کیانی

ایک خاتون نے جسٹس ایم آر کیانی کی تصویر نہیں دیکھی تھی۔ انہوں نے جب کسی محفل میں انہیں دیکھا تو بے ساختہ کہا:

''آپ کی تقریروں سے جو تاثر قائم کیا تھا وہ کچھ اور تھا۔''

کیانی صاحب کہنے لگے:

''مجھے دیکھ کر لوگوں کو مایوسی ہوتی ہے۔ مگر حُسن تو آپ کے لیے ہے۔ میرے لیے آپ کا ''حُسنِ زن'' کافی ہے۔''

جمیل آذر

راولپنڈی کی ایک ادبی تقریب میں ایک مصورہ نے جمیل آذر کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے گھر پر اپنے نام کی تختی لگوائیں۔

''اب تختی لگوانے کا کیا فائدہ؟'' ایک خاتون بولیں: ''گھر تو تم نے دیکھ ہی لیا ہے بے چارے کا۔''

جوش ملسیانی

پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی، نکودر کے کسی سکول میں اردو فارسی کے ٹیچر تھے۔ ایک دن کلاس روم میں داخل ہونے لگے تو زور کی آندھی آئی۔ جوش ملسیانی نے فی البدیہہ یہ شعر کہہ کر طلباء کو سنایا:

اُور ہوتے ہیں جو محفل میں خموش آتے ہیں
آندھیاں اُٹھتی ہیں جب حضرتِ جوش آتے ہیں

چوہدری شہاب الدین

چوہدری شہاب الدین لاہور کے میئر تھے۔ ایک دن لاہور کے خاکروبوں نے ہڑتال کر دی۔ اس پر چوہدری صاحب نے ان سب کو ٹاؤن ہال کے میدان میں جمع ہونے کا حکم دیا۔ جب سب جمع ہو گئے تو چوہدری صاحب ان سے مخاطب ہوئے:

''بہنو اور بھائیو!''

ابھی وہ اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ ایک بھنگن کا بچہ رونے لگا۔ اس پر بھنگن نے اپنے بچے سے کہا۔ ''ارے چپ، ورنہ ماموں ماریں گے۔''

حاجی لق لق

حاجی لق لق کو تو ہم جانتے ہیں، وہی، جس کے پسینے سے بھی شراب کی بُو آتی تھی وہی۔ ''زمین دار'' کا کالم نویس، ایک شام جب وہ اپنے دفتر سے اٹھنے ہی والا تھا کہ ایک بے تکلف دوست آ گیا۔ ''کتنے پیسے ہیں تمہاری جیب میں؟'' لق لق نے ان الفاظ کے ساتھ اس کا خیرمقدم کیا۔ اس نے اپنی جیب کو ٹٹولتے ہوئے بتایا۔ ''ڈیڑھ روپے کے لگ بھگ...............'' لق لق کی باچھیں کھل گئیں۔ ''تو حل ہو گیا مسئلہ...............ایک روپیہ میرے پاس بھی ہے۔'' ''لیکن اس سے کیا ہو گا؟'' ''ٹھرّے کا ایک پوّا لے کر پیئیں گے۔'' ''ایک پوّے سے دو آدمی...............؟'' ''ارے میاں! اتنا نشہ تو ہو جائے گا کہ رسالہ کے مالک سے پینے کے لیے دوبار پیشگی مانگتے ہوئے شرم محسوس نہ ہو گی۔''

حبیب جالب

ایک بار کسی نے حبیب جالب سے کہا: ''سنا ہے آپ حکیم راغب مراد آبادی سے اصلاح لیا کرتے تھے، پھر چھوڑ کیوں دیا؟'' حبیب جالب نے کہا: ''راغب صاحب اصلاح کر دیتے تھے، شعر خراب ہو جاتا تھا۔''

حکیم فضل الٰہی بہار

اختر شاد کی شادی، میزبان اور مہمانوں میں بھی خاصے دوست حرف و قلم سے تعلق رکھنے والے، ان کے ہاں موجود میرا حکیم فضل الٰہی بہار سے بالمشافہ ملاقات کا پہلا موقعہ۔ یہ بتاتا چلوں کہ بہار صاحب کا قد چھوٹا تھا (جسمانی قد کی بات کر رہا ہوں، ادبی یا اخلاقی قد کی نہیں)۔

---- بات پنجابی ادب پر چل نکلی۔

مجھ سے مخاطب ہوئے: ''آسی صاحب، یار پنجابی تے کوئی کم نہیں ہو رہیا، ڈھائی قلندر نیں جہڑے کجھ لکھ پڑھ لیندے نیں---''

عرض کیا: ''بہار صاحب، اوہ ڈھائی قلندراں دے ناں وی دس دیو!''

فرمایا: ''اک تسیں او، اِک ایہ پاشا راز ہوریں نیں -- تے، ادھا مینوں سمجھ لیو۔''

میں نے فی البدیہہ کہا:

''تے پھر ڈھائی تے ناں کہو جی بہار صاحب! سوا دو کہو!''

بہار صاحب نے بھی دوسرے احباب کے ساتھ بہت بلند قہقہہ لگایا۔

حکیم مرزا اصفدر بیگ

''تحفۂ شادی'' کتاب کے مصنف حکیم مرزا اصفدر بیگ رات تین بجے دوستوں کی ادبی محفل سے نکلے اور گنگناتے ہوئے چلے جا رہے تھے کہ ایک سپاہی کو دیکھ کر جیب سے ٹوپی نکالی اور سر پر اوڑھ لی۔

سپاہی: ہاں بھئی کدھر جا رہے ہو؟

مرزا: حضور لیکچر سننے!

سپاہی: (حیرت سے) اس وقت کس نے لیکچر دینا ہے؟

مرزا: (مسکین سے لہجے میں) ''حضور میری بیوی نے۔''

خاطر غزنوی

1962ء میں کوئٹہ کے مشاعرے میں خاطر غزنوی کی غزل کا یہ شعر بہت پسند کیا گیا:

گو ذرا سی بات پر برسوں کے یارانے گئے
لیکن اتنا تو ہوا کچھ لوگ پہچانے گئے

دوسرے دن ایک نشست میں لوگ خاطر غزنوی کی اس غزل کی بڑی تعریف کر رہے تھے، محسن بھوپالی نے بھی اس غزل کی بڑی تعریف کی اور خاطر غزنوی سے کہا:

''جناب آپ کی اس غزل کے ایک شعر کو میں نے کچھ بدل دیا ہے اگر اجازت ہو تو سناؤں۔''

اجازت ملنے پر محسن بھوپالی نے مندرجہ ذیل شعر کو ترمیم کے ساتھ اس طرح سنایا:

یہ تو خیر اچھا ہوا کچھ لوگ پہچانے گئے
پر ذرا سی بات کیا تھی جس پہ یارانے گئے

اس شعر پر سب نے ایک زوردار قہقہہ لگایا، خاطر غزنوی جو پشاور سے آئے تھے سُرخ ہو گئے اور پھر زور زور سے ہنسنے لگے۔

خشونت سنگھ

خشونت سنگھ ایک جگہ اپنے متعلق لکھتے ہیں:

''خالصتان کی تحریک کے دوران میں نے سکھ قیادت کی غلطیوں کی نشاندہی کی، میری اس جسارت پر سکھ برادری مجھ سے ناراض ہوگئی اور مجھے سکھوں نے دنیا بھر سے گالیوں بھرے خط لکھنا شروع کر دیے، سکھ مجھے راستے میں روک کر بھی برا بھلا کہہ دیتے تھے، میں یہ خط پڑھتا تھا اور ہنس پڑھتا تھا۔ مجھے گالیوں سے بھرا ہوا کلاسیک خط کینیڈا سے کسی سکھ نے لکھا، یہ خط گورمکھی زبان میں تھا، صرف لفافے پر انگریزی کے چار حرف لکھے تھے ''باسٹرڈ

خوشونت سنگھ انڈیا"۔

یہ خط کینیڈا سے پوسٹ کیا گیا اور میں بھارتی محکمہ ڈاک کی کارکردگی پر حیران رہ گیا کیونکہ محکمہ ڈاک نے سوا ارب کی آبادی میں موجود واحد باسٹرڈ کو تلاش کر کے یہ خط مجھ تک پہنچا دیا، میں بڑے عرصے تک یہ خط اپنے دوستوں اور ملاقاتیوں کو دکھاتا تھا اور اس کے بعد ان سے کہتا تھا، تم لوگ اس کے باوجود محکمہ ڈاک کی کارکردگی سے غیر مطمئن ہو۔"

مسٹر خوشونت سنگھ پر یہ الزام بالکل غلط ہے کہ وہ بلانوش ہے۔ وہ عادی شرابی نہیں، صرف دو دنوں میں پیتا ہے۔ ایک اس وقت جب بارش ہو رہی ہو۔ دوسرے اس وقت جب بارش نہ ہو رہی ہو۔

خمار بارہ بنکوی

خمار بارہ بنکوی اپنی عمر کے آخری حصہ میں امریکہ گئے تو کسی صحافی نے سوال کیا:

"خمار صاحب کیسا لگا امریکہ؟"

خمار صاحب نے جواب دیا:

"غلط عمر میں صحیح جگہ آ گیا ہوں۔"

خواجہ عشرت لکھنوی

ایک مرتبہ مدرسہ تکمیل الطب لکھنو کے چند طلبا بیٹھے اس طبی مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے کہ غذا جب بدن میں داخل ہوتی ہے تو کیونکر جزو بدن بن جاتی ہے۔ خواجہ عشرت لکھنوی، جو مستند شاعر تھے، ان کی یہ گفتگو سن رہے تھے، انہوں نے فی البدیہہ درج ذیل شعر موزوں کیا:

حکماء کہتے ہیں، ہوتی ہے غذا جزو بدن
ہم تو تحلیل ہوئے جاتے ہیں غم کھانے سے

دیوندر ستیارتھی

دیوندر ستیارتھی افسانہ نگار اور شاعر تھے، تاہم ان کا سب سے قیمتی کام برصغیر پاک و ہند میں گھوم پھر کر لوک گیت جمع کرنے کے حوالے سے سامنے آیا۔ ستیارتھی کی پرانی عادت تھی کہ وہ اپنے دوستوں کی بات چیت میں اپنے افسانے کا پلاٹ ڈھونڈنے کی کوشش کرتے۔ ایک دن صبح صبح کنہیا لال کپور کے گھر پہنچے۔ کپور نے چائے نوشی کے دوران اپنی سوچی سمجھی سازش کے تحت اسے کہا کہ رات میرے دماغ میں ایک پلاٹ آیا ہے، اگر میں افسانہ نگار ہوتا تو اس کا ضرور افسانہ لکھتا۔ ستیارتھی نے فوراً پوچھا: ''پلاٹ کون سا ہے؟ مجھے بتاؤ!'' کنہیا لال کپور نے کہا: ''پلاٹ کچھ ایسا ہے کہ ایک کوچوان کا نوجوان لڑکا فوت ہو جاتا ہے، کوچوان اس غم کو ہلکا کرنے کے لیے کسی ہمدرد کی تلاش میں ہے، جو اسے نہیں ملتا۔ آخر میں وہ اپنے گھوڑے کو اپنے بیٹے کی موت کی خبر سنا کر رونے لگتا ہے۔''

سیتارتھی یہ سن کر پھڑک اٹھا اور افسانہ لکھنے پر آمادہ ہو گیا، جب اس نے افسانہ لکھ کر مجلس ارباب علم میں سنایا تو اس کی بُری طرح گت بنی کیونکہ یہ پلاٹ رُوسی افسانہ نگار چیخوف کے ایک افسانے کا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کے دوستوں نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے، وہ چور نہ سہی مگر چوری کا مال برآمد تو اسی کے گھر سے ہوا تھا۔

ایک دفعہ ٹرین کے سفر کے دوران دیوندر ستیارتھی کے سامنے والی نشست پر بیٹھے مسافر نے کھیرا کاٹ کر اس کی ایک قاش دیوندر ستیارتھی کو پیش کی۔ دیوندر نے شکریے کے ساتھ قبول کی لیکن جب ان کے ہم سفر نے جونہی پانچویں اور چھٹی قاش بھی دیوندر کو پیش کی تو دیوندر نے اپنے اس مہربان ہم سفر کو مخاطب کیا اور کہا صاحب آپ بھی تو کھائیے!

اس پر اس بذلہ سنج نے جواب دیا: ''چھوڑیں جناب یہ کھیرا بھی کوئی انسانوں کے کھانے کی چیز ہے۔''

ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم

ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم خوش مزاج انسان تھے۔ موقعہ محل کے مطابق فقرہ چست کرنے کا فن انہیں بخوبی آتا تھا۔ ان کے ایک ملنے والے تھے ڈاکٹر انوار اقبال قریشی، وہ اپنے بچوں پر بہت سختی کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر ان کے اس رویے کے بارے میں کہا کرتے تھے!

''وہ آدھا قریشی ہے آدھا مویشی۔''

اسی طرح ان کے ایک عزیز تھے عطا اللہ بٹ کھدر پوش، وہ بھی مزاج کے بہت تیز تھے۔ معمولی سی بات پر آسمان سر پر اٹھا لیتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب ان کے متعلق کہا کرتے تھے!

''آدھا آندھی ہے آدھا گاندھی۔''

ڈاکٹر خواجہ زکریا

پرانی کتابوں کے اتوار بازار سے ناصر زیدی نے ''مارگریٹ ڈیوراس'' کا ناول ''عاشق'' خریدا جو شفیق ناز نے الحمرا اسلام آباد سے شائع کیا۔ فرانسیسی سے براہ راست ترجمہ بھی خود کیا۔ کتاب میز پر سامنے رکھی تھی۔ پاک ٹی ہاؤس میں کتاب کے سرورق پر جلی حروف میں لفظ ''عاشق'' دیکھ کر پروفیسر ڈاکٹر خواجہ زکریا نے کہا ''اس کتاب کی آپ کو کیا ضرورت تھی؟ آپ تو خود مجسم عاشق ہیں۔''

ڈاکٹر سلیم اختر

ڈاکٹر سلیم اختر اپنی کتاب ''اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' کا پہلا ایڈیشن کسی دوست کو پیش کر رہے تھے۔ بولے: ''میں نے اس ایڈیشن میں کافی اضافے کیے ہیں۔''

دوست نے کہا: ''میں دیکھ رہا ہوں، پہلے یہ تاریخ نہیں تھی، اب مختصر بھی نہیں رہی۔''

ڈاکٹر خالد فوزی

نامور عرب مصنف ڈاکٹر خالد فوزی لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ میری بیوی بیمار ہوگئی اور مجھ سے دَم کرنے کا کہا۔ میں نے اس پر قرآن پاک کی مندرجہ ذیل آیت پڑھ کر پھونکنا شروع کر دیا:

فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ (4:3)

(ترجمہ: پس تم اپنی پسندیدہ عورتوں میں سے دو، یا تین، یا چار سے شادی کر سکتے ہو)

آیت سنتے ہی زوجہ محترمہ سارا درد بھول بھلا کر یکدم سے اُٹھ بیٹھیں، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

ڈاکٹر مسعود حسن خان

ڈاکٹر مسعود حسن خان اُردو ادب کی ایک اہم شخصیت ہیں۔ ایک جگہ انہوں نے لکھا: ''مجھے صرف ایک شاگرد نے مایوس کیا، جو اَب دہلی یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں۔ جب اسی یونیورسٹی کے ایک سینئر پروفیسر نے ان کی شکایت کرتے ہوئے مجھ سے کہا کہ ان کی استداد دیکھ کر مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ آپ کے شاگرد ہو سکتے ہیں تو میں نے کہا کہ میں عرصہ ہوا، ان سے دست بردار ہو چکا ہوں تو پروفیسر صاحب جواباً بولے: ''آپ ان سے دست بردار ہو چکے ہوں گے مگر وہ آپ سے دست بردار نہیں ہوئے ہیں۔''

ذوالفقار حسین شاہ

نامور ادیب سیّد ذوالفقار حسین شاہ المعروف شاہ جی جہلمی اُردو بازار کراچی معروف نعت گو شاعر طاہر سلطانی سے ملاقات کے لیے گئے۔ اُس دن اُن کے گھر پر طرحی مشاعرہ تھا، جن میں پروفیسر خیال آفاقی، ڈاکٹر شہزاد احمد، عزیز خاکی، قمر وارثی اور ذکا صاحب جبکہ گوجرانوالہ سے نعت گو شاعر قاری نازش صاحب بطور مہمانِ خصوصی آئے ہوئے تھے۔

شاہ جی جہلمی نے جب اُن کے بارے میں سُنا تو انہوں نے اُن کے اعزاز میں دعوت کے اہتمام کا اعلان کیا۔ اس پر سب مہمان تشریف فرما تھے۔

شاہ جی نے کہا: ''آج سب کو دعوتِ آم دی جاتی ہے۔''

اس پر پروفیسر خیال آفاقی صاحب کہنے لگے:

''پھر تو کئی لوگوں کو بلانا چاہیے کہ دعوتِ عام ہے۔''

اس پر شاہ جی نے برجستہ کہا:

''جناب! دعوتِ ''عام'' نہیں، دعوتِ ''آم'' ہے یعنی آموں کی دعوت ہے، چونکہ آج بارش بھی اپنے زوروں پر ہے اس لیے موسم کی مناسبت سے صرف آپ سبھی دوستوں کو دعوت دی جاتی ہے۔''

یہ سننا تھا کہ محفل کشت زعفران بن گئی۔

P.T.V کراچی سنٹر میں چائنہ سے ٹیلی ویژن سے وابستہ ایک آرٹسٹ پاکستان آیا، اُن کے اعزاز میں P.T.V سنٹر کے جنرل منیجر قاسم جلالی صاحب نے عشائیہ دیا اور ساتھ ہی پاکستان کے رائٹر ادیب شعرا آرٹسٹ حضرات کو بھی دی گئی۔ شاہ جی جہلمی اُن دِنوں بطور آرٹسٹ بچوں کی سیریز ''خواہش'' پروڈیوسر اقبال احمد خان کے ساتھ مل کے بنا رہے تھے۔ اُس میں چائلڈ سٹار آرٹسٹس اذان، عینی، انس، حسیب عالم، شعیب عالم خاں اور جعفر اقبال بھی شامل تھے۔ وہ سب اس سیریز سے وابستہ حضرات اقبال احمد خان پروڈیوسر، آرٹسٹ آفتاب سلجوقی، قاضی واجد، قاضی باسط، جمشید انصاری، آغا جعفر فلم آرٹسٹ آغا طالش کے بھائی اور دیگر خاتون آرٹسٹ کے علاوہ چھوٹے قد کے نامور آرٹسٹ مقصود حسن بھی موجود تھے، اتنے میں چائنہ کا ایک آرٹسٹ ہماری ٹیبل کے قریب آیا، ترجمان بھی اُن کے ہمراہ تھا۔ پاکستانی میزبان کمپیئر بھی موجود تھے، انہوں نے مقصود حسن سے مخاطب ہو کر پوچھا:

''آپ کی عمر کتنی ہے؟''

اس وقت ان کی عمر ساٹھ سال تھی لیکن مقصود حسن صاحب کے بولنے سے پہلے ہی چائلڈ سٹار عینی نے کہا:

''ویسے عمر تو ان کی بہت زیادہ ہے صرف قد سے مار کھا گئے ہیں۔''

مقصود حسن صاحب نے (ہنستے ہوئے) فی البدیہہ کہا:

''نانی اماں سچ کہہ رہی ہیں۔''

ساری محفل کشتِ زعفران بن گئی۔

راجہ طارق محمود نعمانی

ہزار ہا صفحات پر مشتمل کئی اسلامی، علمی و ادبی کتابوں کے مصنف جناب راجہ طارق محمود نعمانی سے تھک جانے کے ذکر پر کسی نے پوچھا: ''آپ اتنا لکھتے ہیں، کبھی تھکتے نہیں؟''

انہوں نے فرمایا: ''یہ کام میرے پڑھنے والے کرتے ہیں۔''

رسول حمزہ توف

جن دنوں میں اپنی نظم ''پہاڑی عورت'' لکھ رہا تھا تو مجھے کچھ کوسنوں کی ضرورت محسوس ہوئی، جسے ایک تند خو اور غصہ ور عورت کی زبان سے ادا کروانا تھا۔ مجھے خبر ملی کہ دُور ایک پہاڑی گاؤں میں ایک ایسی عورت ہے جو کوسنے دینے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی، بڑی مشکل سے میں اس عورت کے گھر تک پہنچا اور اس کو اپنے آنے کا مقصد بتایا کہ خاتون! میں شاعر ہوں اور ایک نظم لکھ رہا ہوں جس میں سخت قسم کے کوسنے درکار ہیں آپ کی مدد چاہیے۔

یہ سنتے ہی وہ عورت بھڑک اٹھی: ''خدا کرے تیری زبان پر کیڑے پڑ جائیں، تیری جورو کو تیرا نام بھی یاد نہ رہے۔ تیرا خانہ خراب ہو، تیرا کچا کوٹھا گر پڑے، تجھے برسات میں کالا ناگ ڈسے۔ اگر گھر میں مردہ نہ ہو تو رونے سے فائدہ، جب کسی نے میری بے عزتی نہیں کی۔ مجھے تنگ نہیں کیا تو میں محض تجھ کو کوسنے کو کیوں اپنی زبان خراب کروں، دفع دُور ہو

جا اس طرح کی بیہودہ فرمائش لے کر دوبارہ نہ آنا مَرن جوگے۔"

"شکریہ مہربان خاتون!" کہہ کر میں نے کان لپیٹے اور سر پر پیر رکھ کر بھاگنے کی کی۔

رضا علی عابدی

حریت میں ملازمت کے بیان میں رضا علی عابدی صاحب نے اپنے ساتھی عنایت اللہ کا ذکر کیا ہے جو اخبار کو پریس میں بھیجنے سے قبل ہمیشہ کہا کرتے تھے۔: "اس میں شک ڈالو" مطلب یہ کہ اچھی طرح دیکھ لو کہ کہیں کوئی غلطی تو نہیں۔

بقول رضا علی عابدی، "وہ کم بخت ہمیشہ نکلتی تھی۔"

اسی ضمن میں لکھتے ہیں:

"ایک بار میں اخبار پر آخری نظر ڈال رہا تھا، دیکھا کہ ایک چھوٹی سی خبر پر سرخی لگی ہے جس میں لکھا ہے "علامہ رشید شرابی علیل ہیں"، رشید ترابی کے نام کا یہ حشر پہلے تو کاتب نے کیا، پھر پروف ریڈر نے کیا۔

ایک مرتبہ ایک اور سانحہ ہوتے ہوتے رہ گیا، رات پوری طرح ڈھل چکی تھی، آنکھیں منتظر تھیں کہ کام ختم ہو اور گھر جائیں، آخری دو صفحات پر کڑی نظر ڈالی جا رہی تھی، سرخی لگی تھی: "صدر ایوب غلیل ہو گئے۔"

اگر یہ خبر یونہی چھپ جاتی تو میں اپنی زندگی کا آخری مصرعہ کہتا:

"ایک غلّہ میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے۔"

رضا علی عابدی نے مصطفیٰ زیدی کے ساتھ نیم مردہ حالت میں پائی جانے والی خاتون شہناز کا احوال بھی اپنے دلچسپ انداز میں لکھا ہے۔ واقعہ یوں ہوا کہ پہلے یہ خبر بطور ایک چھوٹی خبر موصول ہوئی کہ ایک سرکاری افسر نے خودکشی کر لی ہے، جب خبر پھیلی کہ متوفی مصطفیٰ زیدی ہیں تو تمام اخبارات اس خبر کی تفصیل کے پیچھے پڑ گئے اور بقول عابدی صاحب ایسی ایسی داستانیں نکال کر لائے کہ مصطفیٰ زیدی اگر اس وقت بچ جاتے تو اب مرجاتے۔ عدالت میں "حریت" کے فوٹو گرافر نے شہناز گل کی ایک قد آدم تصویر کھینچ لی۔ رضا علی عابدی

بیان کرتے ہیں کہ اس واقعے کے کافی عرصے کے بعد افتخار عارف نے ایک تقریب میں شہناز گل سے کہا کہ ''ابھی تو آپ پر دس بیس شاعر اور قربان ہو سکتے ہیں۔''

رضی الدین بسمل

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسے میں مولوی رضی الدین بسمل نے ایک بڑی درد انگیز قومی نظم حاضرین جلسہ کو سنائی۔ جسے سن کر ہر آنکھ پرُنم ہوگئی۔ نظم کے خاتمے پر نواب محسن الملک نے اٹھ کر کہا: ''مولوی رضی الدین انے اپنا تخلص تو بسمل رکھا ہے مگر نظم ایسی سنائی کہ دوسروں کو بسمل کر دیا۔''

سردار اوتار سنگھ

دہلی میں ہمارے ایک دوست ہیں سردار اوتار سنگھ جج۔ انگریزی کے صحافی ہیں لیکن پنجابی اور اردو میں بھی گہری قدرت رکھتے ہیں۔ ایسے زندہ دل اور فقرہ باز انسان ہیں کہ جس محفل میں بھی موجود ہوتے ہیں اسے اپنی دلچسپ باتوں کے ذریعہ قہقہہ زار بنا دیتے ہیں۔ بیس پچیس برس پہلے کافی ہاؤس میں ایک دن انھوں نے ہم سے پوچھا: ''یار! یہ اردو والے بھی اچھی خاصی اردو بولتے بولتے اچانک بیچ میں فارسی کے کچھ الفاظ بھی بول دیتے ہیں جیسے خورد و نوش، یہ کیا ہوتا ہے؟''۔ ہم نے کہا ''کھانا پینا''۔ پوچھا یہ گفت و شنید؟۔ ہم نے کہا: ''کہنا سننا۔'' بڑی معصومیت سے بولے: ''اول الزکر بہت اچھی چیز ہے۔ جب بھی کوئی ایسی صورت پیدا ہو تو مجھے ضرور یاد کرنا البتہ موخر الزکر چیز یعنی گفت وشنید سے مجھے ہمیشہ دور رکھنا۔''

سریندر پرکاش

افسانہ نگار سریندر پرکاش کی کہانی راجندر یادو نے اپنے رسالے ''ہنس'' میں شائع کی مگر معاوضہ نہیں بھیجا۔

سریندر پرکاش ان سے ملنے گئے۔ باتیں ہوتی رہیں۔ یادو نے معاوضہ کا کوئی ذکر

نہیں کیا تو سریند پرکاش نے کہا: ''دفتر میں جھاڑو تو ہوگی؟''

یادو نے کہا: ''ہاں! مگر کیوں پوچھ رہے ہو؟''

سریندر نے کہا: ''تمہارے دفتر میں جھاڑو لگانا چاہتا ہوں۔''

یادو نے مسکر کر کہا: ''کیا ہوا ہے تمہیں؟''

سریند پرکاش نے کہا: ''دیکھو! اگر ادیب کو پبلشر سے معاوضہ نہ ملے تو اسے کچھ کام تو کرنا ہی ہوگا تاکہ گزارہ ہو سکے۔''

سلطان جمیل نسیم

سلطان جمیل نسیم جو اَب افسانہ نگاری کرتے ہیں، کبھی شاعری بھی کرتے تھے اور استاد اختر انصاری اکبرآبادی کے شاگرد تھے۔ ایک بار انہوں نے استاد سے اپنی وہ غزل مانگی جو بہ غرض اصلاح دی تھی۔ استاد نے کہا: ''غزل بے مزہ تھی، میں نے پھاڑ کر پھینک دی۔''

کچھ عرصے کے بعد سلطان صاحب نے وہی غزل ان کے رسالے میں استاد کے نام سے چھپی دیکھی تو وہ استاد سے ملے اور کہا: ''آپ نے تو کہا تھا کہ غزل پھاڑ کر پھینک دی، پھر یہ رسالے میں آپ کے نام سے کیسے چھپ گئی؟''

استاد نے جواباً کہا: ''میاں غلطی ہوگئی تھی، جیب میں تمہاری غزل بھی تھی اور میری بھی، اپنی غزل میں نے پھاڑ کر پھینک دی اور تمہاری غزل کاتب کو دے دی۔ دیکھو آیندہ سے اصلاح کے لیے دو غزلیں دینا تاکہ ایک پھاڑ کر پھینک دوں تو دوسری اصلاح کے بعد تمہیں واپس کرسکوں۔''

سلمان رشید

سول لائنز کلب جہلم میں سلمان رشید کی کتاب کی تقریب رونمائی تھی۔ کمپیئر نے تعارفی کلمات میں کہا:

''یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ سلمان رُشدی صاحب کی نئی کتاب آگئی ہے۔''

اس پر سلمان رشید کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے:

’’آپ نے تو ’رُشدی‘ کہا ہے کچھ لوگ تو میری شکل بھی اس سے ملا دیتے ہیں۔‘‘

سیّد ذیشان نظامی

نامور مصنف سیّد ذیشان نظامی دعا مانگ رہے تھے۔

یا اللہ!! مجھے بنگلہ دے۔

یا اللہ!! میرا کاروبار بہتر کر دے۔

یا اللہ!! مجھے خوبصورت بیوی دے۔

پاس نوید احمد ربانی بیٹھے تھے، کہنے لگے کیا مانگتے ہو میں تو اللہ سے یوں مانگتا ہوں:

یا اللہ!! مجھے عزت دے۔

یا اللہ!! مجھے وقار دے۔

یا اللہ!! مجھے عقل دے۔

سیّد ذیشان نظامی نے کہا: ’’چھوڑو بھائی! جس کے پاس جو نہ ہو وہی مانگتا ہے۔‘‘

سیّد صادقین احمد نقوی

کراچی آتے تو صادقین ایک بار ٹیلی فون ضرور کرتے۔ ایک دن ملاقات ہوئی، تو دلچسپ باتیں ہوئیں۔ کہنے لگے، جوش صاحب میری نمائش میں آئے تھے۔ میں نے پوچھا، ’’حضرت! کیسی رہی؟‘‘ کہنے لگے، ’’بھئی سمجھ میں نہیں آئی۔‘‘ صادقین نے کہا، ’’جوش صاحب! جب میں بچہ تھا تو آپ کی شاعری بھی میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔‘‘

سیماب اکبر آبادی

ایک مرتبہ نہال سیوہاروی میرے پاس بیٹھے تھے۔ سیماب اکبر آبادی بھی تشریف لے آئے۔ سیماب صاحب نے کہا:

''ہم کیسے کیسے نوادر ہندوستان میں چھوڑ آئے۔ جب ملک تقسیم ہوا تو ہندوستان سب کچھ دبا کر بیٹھ گیا۔ اس تقسیم میں ہمیں کیا ملا؟''

نہال صاحب نے کہا:

''بجا فرمایا، اب شاعروں ہی میں دیکھئے پاکستان کے ہاتھ کیا آیا، یا آپ آئے اور یا میں آیا۔''

سیمانیڈیس

سیمانیڈیس یونان کا ایک مشہور شاعر تھا۔ ایک دن ایک پہلوان اس سے اپنی شہ زوری کی تعریفیں کرنے لگا۔ آخر سیمانیڈیس نے اکتا کر اس سے پوچھا:

''تم اپنے سے زیادہ طاقت ور کو پچھاڑتے ہو یا اپنے برابر کو یا اپنے سے کم تر کو پچھاڑتے ہو؟''

پہلوان نے سینہ تان کر جواب دیا:

''اپنے سے زیادہ طاقت ور کو۔''

شاعر نے کہا:

''یہ غلط ہے، کیوں کہ تم جسے پچھاڑ لو، وہ تم سے زیادہ طاقت ور نہیں ہوسکتا۔''

پہلوان نے خفت سے کہا:

''اپنے برابر کو۔''

یہ بھی غلط ہے شاعر نے کہا:

''اگر تمہارا حریف تمہارے برابر ہو تو تم اسے کبھی نہیں پچھاڑ سکتے۔''

پہلوان نے مجبور ہو کر کہا:

''اچھا اپنے سے کم تر کو۔''

سیمانیڈیس نے ایک قہقہہ لگایا:

''یہ تو کوئی بڑی بات نہیں ہے اپنے سے کم تر پر تو ہر شخص غالب آجاتا ہے۔''

شاذ تمکنت

حیدرآباد میں ایک مشاعرہ ہو رہا تھا جس کی صدارت علامہ حیرت بدایونی فرما رہے تھے۔ مشاعرے میں جگن ناتھ آزاد، مخدوم محی الدین، قاضی سلیم، بشر نواز، زبیر رضوی، انور معظم، راشد آزر، وحید اختر، شاذ تمکنت، عزیز قیسی، سعید شہیدی، طالب رزاقی، ابن احمد تاب ،منوہر لال شارب، کنول پرشاد کنول اور تاج مہجور شرکت کر رہے تھے۔ شاذ اور راشد آزر بازو بازو بیٹھے ہوئے تھے۔ جگن ناتھ آزاد کو دعوت کلام دی گئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر مائیک کی سمت جا رہے تھے۔ شاذ تمکنت نے آہستہ سے راشد آزر سے کہا:

''یہ اس قدر پڑھے لکھے، ماہرِ اقبالیات زبان و بیان کے ماہر ہیں مگر اتنی بری شاعری کیوں کرتے ہیں۔''

راشد صاحب نے پوچھا: ''پھر تم نے کبھی ان سے کہا؟''

شاذ نے برجستہ جواب دیا: ''ہم نے کبھی تم سے کہا؟''

شاہ اسماعیل شہید

مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ سے کسی انگریز نے کہا: ''انسان ڈاڑھی کے بغیر پیدا ہوا ہے اس لیے اسے ڈاڑھی نہیں رکھنی چاہیے۔'' مولانا نے برجستہ کہا: ''پھر تو انسان دانتوں کے بغیر پیدا ہوا ہے، اس کے دانت بھی توڑ دینے چاہئیں۔''

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی

ایک شخص نے آپ (شاہ عبدالعزیز فرزند شاہ ولی اللہ) سے مسئلہ پوچھا کہ مولوی صاحب، یہ طوائف یعنی کسبی عورتیں مرتی ہیں تو ان کے جنازے کی نماز پڑھنی درست ہے یا نہیں؟ آپ نے فرمایا کہ جو مرد ان کے آشنا ہیں، ان کی نمازِ جنازہ پڑھتے ہو یا نہیں؟ اس نے عرض کیا کہ ہاں پڑھتے ہیں۔ حضرت نے کہا تو پھر ان کی بھی پڑھ لیا کرو۔

شاہد احمد دہلوی

ماہنامہ ساقی کے مدیر شاہد احمد دہلوی کے پاس ایک نوآموز شاعر نے اپنی غزل ایک مشہور شاعر کے سفارشی خط کے ہمراہ بغرض اشاعت بھیجی، شاہد احمد دہلوی نے انہیں جواب لکھا:

''آپ کی غزل تو اچھی ہے لیکن جن صاحب سے سفارش کرائی ہے ان کے بارے میں میری رائے اچھی نہیں لہٰذا غزل واپس بجھوا رہا ہوں۔''

شوق قدوائی

شوق قدوائی لکھنو کے بڑے شاعر تھے۔ اپنا کلام سنانے کے بہت شوقین تھے۔ اسی لیے ان کے دوست، ہمسائے ان سے بہت گھبراتے۔ یہ ان کو دعوت کے بہانے یا بیماری کا دھوکا دے کر بلاتے۔ مرغن کھانے، آم، خربوزے کھلاتے، پھر اپنا کلام سنانے بیٹھ جاتے۔ سہ پہر کا پھنسا شکار رات تک ان کے کلام سے مستفید ہوتا، پھر اس کو ڈنر کراتے اور دسترخوان سے اٹھا کر غزلوں پر غزلیں سناتے۔ تھکاوٹ کے آثار دیکھتے تو چائے منگواتے، پان پیش کرتے یا حقہ بڑھاتے۔ وہ اجازت چاہتا تو اصرار کر کے اپنے ہاں سلا لیتے اور اس کے بیدار ہونے پر یہ سلسلہ پھر سے شروع کر دیتے۔ اگر شوق صاحب غسل خانے جاتے یا کسی ضرورت سے اٹھتے تو ان کی جگہ ان کے چھوٹے بھائی ابر قدوائی آن موجود ہوتے اور وہ اپنی غزلوں سے شوق فرمانا شروع کر دیتے، مشکل ہی سے بے چارے سامع کی جان چھوٹتی۔

شہرت بخاری

اُردو کے ایک شاعر شہرت بخاری ایک مرتبہ اپنی بیوی کے ساتھ فلم دیکھنے گئے۔ فلم دیکھنے کے بعد وہ بیوی کے ساتھ گھر کی طرف چلے۔ ذرا آگے جا کر انہوں نے ان کا ہاتھ تھام لیا تو بیوی نے جھٹکے سے اُسے چھڑا لیا۔ انہوں نے حیرانی سے بیوی کی طرف دیکھا تو ان کا

ذہن سنسنا گیا...... وہ کوئی اور عورت تھی۔

بخاری صاحب کو دراصل یہ یاد نہیں رہا تھا کہ ان کی بیوی کے کپڑوں کا رنگ کیا ہے۔

شیخ سعدی شیرازی

شیخ سعدی ایک مکان کی خرید وفروخت میں مشغول تھے۔ وہاں ایک یہودی رہتا تھا۔ اس نے شیخ کو ترغیب دی کہ یہ مکان خرید لیجیے، میں اس کا ہم سایہ ہوں۔ اس مکان میں کوئی عیب نہیں ہے۔

شیخ سعدی نے جواب دیا:

''بس یہی عیب ہے کہ آپ یہاں رہتے ہیں۔''

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

اُردو زبان و ادب کے محقق شیخ محمد اسماعیل پانی پتی کے ایک بے تکلف دوست تھے، اُن کا نام محمد نوح تھا۔ ایک بار محمد نوح افسوس سے اپنے ناخلف لڑکے کی نافرمانی کا ذکر کرنے لگے۔ شیخ اسماعیل ہمدردی سے بولے: ''کیا کِیا جائے آخر نوح کا بیٹا ہے۔''

ضیاء الحق قاسمی

کاتب یا کمپوزر کی غلطیاں زمانے بھر سے مشہور ہیں۔ ہر کوئی اِن کا زخم خوردہ ہے۔ غلطی تو ہو جاتی ہے، مگر جان بوجھ کر بزعِم خویش اصلاح کے نام پر غلطی 'غلطی' نہیں 'حماقت' کہلاتی ہے۔ ضیاء الحق قاسمی نے اپنی کتاب میں ایک جگہ لکھا:

''میرا دِل خوشی سے بلیوں اچھلا۔''

کاتب سمجھا شاید مصنف سے غلطی ہوگئی ہے، اُس نے اِس کی یوں 'تصحیح' کر دی:

''میرا دِل خوشی سے بلیوں کی طرح اچھلا۔''

ظ۔انصاری

صحافتی لطائف کی اکثریت کا تعلق ترجمے سے ہوتا ہے۔ ایسے ہی دو ترجمے ہم نے بھی دیکھے تھے۔ بچپن میں چارلس ڈکنس کی مشہور کتاب ''اے ٹیل آف ٹوسٹیز'' پر فلم بنی تھی اس کا ترجمہ اخباروں کے اشتہارات میں تھا: ''دوشہروں کی دم''

ایک لطیفہ ظ۔انصاری صاحب نے سنایا تھا۔ ان کا ہفتہ وار ''آئینہ'' بند ہوا تو اس کے عملہ کے ایک صاحب نے کہیں نوکری دلوانے کی درخواست کی۔ ظ۔انصاری صاحب نے حیدرآباد کے روزنامہ ''سیاست'' کے مدیر عابد علی خان مرحوم کے نام سفارشی خط لکھ کر ان صاحب کو حیدرآباد بھجوا دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ویتنام کی جنگ زور پر تھی اور امریکی فضائیہ روزانہ شہری علاقوں پر بمباری کر رہی تھی۔

ان ہوائی حملوں کے لئے انگریزی میں سرکاری اصطلاح (Air Strikes) تھی۔ عابد علی خاں نے امتحاناً ان صاحب کو ایک چھوٹی سی خبر ترجمہ کے لئے دی۔ ان صاحب نے ترجمہ کیا:

''امریکہ نے ویتنام میں ہوائی ہڑتالیں کر دیں۔''

عابد علی خان نے ترجمہ شدہ خبر ڈاک سے اور ان صاحب کو ٹرین سے ظ۔انصاری صاحب کے پاس بھیج دیا۔

ظفر اقبال

انیس ناگی ایک نہایت عمدہ ادبی رسالے ''دانش وَر'' سے بھی وابستہ ہیں۔ یہ رسالہ گذشتہ کئی برس سے شائع ہو رہا ہے۔ اس رسالے کی پیشانی پر درج ہوتا ہے ''نئے ادب کا ترجمان'' لیکن جو ادب اس میں چھپتا ہے وہ نئے پن سے آگے کی چیز ہے۔ مثلاً اِس کے تازہ شمارے میں ظفر اقبال کی نئی غزلیں شامل ہیں۔ ایک غزل کے یہ دو شعر ہم نے بہ طورِ نمونہ اُستاد لاغر مرادآبادی کو سنائے:

جو آن کے ہمسائے ہمارے میں رہیں گا
تحقیق کہ وہ خود ہی خسارے میں رہیں گا
اِس گھر کی بناوٹ ہی کچھ ایسی ہے کہ وہ شوخ
اِک بار رہیں گے تو دوبارے میں رہیں گا

اُستادِگرامی نے یہ شعرسن کرفی البدیہ فرمایا:

ناگی نے چھاپیں ظفراقبال کی غزلاں
جو اِن کو پڑھیں گے، وہ خسارے میں رہیں گا

مگر ہم خسارے میں نہیں رہے کیوں کہ ہم ظفراقبال کے سارے مجموعے پڑھ چکے ہیں۔ اب ہمیں کسی قسم کی شاعری، یہاں تک کہ انیس ناگی کی شاعری بھی کوئی نقصان نہیں پہنچاسکتی۔

ظہیرکاشمیری

نہرسویز پر قبضہ ہوا تو جنرل ناصر کی حمایت میں ہم کالج کے طلبا و طالبات نے بھی جلوس نکالے۔ ظہیرکاشمیری اپنی مخصوص جگہ پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ سامنے سے علامہ مشرقی بیلچہ اٹھائے جلوس کی قیادت کرتے چلے آ رہے تھے۔

ظہیرصاحب نے پوچھا: ''کہاں تک جائیں گے؟''

علامہ صاحب نے جواب دیا:

''سیدھے مصرجائیں گے۔''

ظہیرصاحب نے کہا:

''اے بیڈن روڈ تھانیں نکل جاؤ، نیڑے پئے گا۔'' (بیڈن روڈ سے ہو کے نکل جاؤ، نزدیک پڑے گا۔)

ایک مشاعرے میں ظہیر کاشمیری گئے۔ شاعر آتا شعر پڑھتا واپس چلا جاتا۔ کوئی شخص بھی نہ منہ سے ہاں نہ منہ سے ناں نہیں کرتا تھا۔ ظہیر صاحب کی باری آئی تو اپنی دبنگ آواز میں بولے اے سامنے بیٹھے شخص میرے پاس آ...... ڈرتے ڈرتے ایک شخص اٹھا سامنے آیا تو ظہیر بولے باہر جا کر ایک اینٹ لے آ میرے سر میں مار۔ اے کچھ تو کرو، ایک دم سارا ہال قہقہوں سے گونج اٹھا۔ پھر مشاعرہ خوب چلا۔

صہبا لکھنوی

ایک شاعر ماہانہ ''افکار'' کراچی میں ہر ماہ اپنی دو چار نظمیں اشاعت کے لیے دے جاتے تھے۔ افکار ایک نہایت معیاری ادبی رسالہ تھا اور اس کے مدیر صہبا لکھنوی خود بھی ایک بلند پایہ شاعر تھے اور افکار میں ہمیشہ اعلیٰ معیار کی شاعری شائع کرتے تھے۔ اس مبتدی شاعر کی کوئی بھی نظم ایسی نہیں ہوتی تھی کہ گوارا ہی کہی جاسکے اور اشاعت کے قابل ہو۔
صہبا صاحب نے کبھی واضح الفاظ میں تو کبھی اس شاعر کی دل شکنی نہیں کی لیکن کبھی حوصلہ افزائی بھی نہ کی۔
ایک روز وہ شاعر ان کے دفتر میں آئے اور بے چینی سے پوچھا۔ میری آخری نظم کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔
یہ جان کر کہ وہ آپ کی آخری نظم ہے میں اسے بہت غور سے پڑھوں گا۔ صہبا صاحب نے جواب دیا۔

عادل لکھنوی

ایک مشاعرے میں انور جلالپوری نظامت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انھوں نے ممتاز مزاحیہ شاعر عادل لکھنوی کو بلانے سے قبل ایک واقعہ سناتے ہوئے کہا کہ ایک دفعہ ایک بڑا مصور راستے سے گزر رہا تھا، اس نے ایک پینٹر کو پینٹ کرتے ہوئے دیکھا، اس کے پیر چھوئے۔ پینٹر حیران ہوا، اتفاق سے وہ مصور کو پہچانتا تھا۔ اس نے کہا کہ آپ اتنے

بڑے مصور ہیں اور مجھ جیسے معمولی پینٹر کے پیر چھو رہے ہو؟ مصور نے کہا۔ میں کئی دن سے پریشان تھا کہ جنات کی تصویر کیسے بناؤں، تمھیں دیکھا تو میری پریشانی دُور ہوگئی۔ انور جلالپوری نے اس کے بعد جنات کے نمائندے شاعر عادل لکھنوی کو آواز دی۔

عادل لکھنوی نے مائیک سنبھال کر انور جلالپوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ بھائی آپ کو علم نہیں کہ یہ جنات شاعر صاحبِ اولاد بھی ہے۔

عبدالصمد خان

نوجوان شاعر عبدالصمد خان کی ملاقات مشاعرے کے وقفے میں ایک نئی شاعرہ شاہدہ کمال سے ہوئی۔ باتوں باتوں میں وہ بتانے لگے کہ شاعری تو بس میرا مشغلہ ہے، ہر بڑے شہر میں میرا کاروبار پھیلا ہوا، بنگلے ہیں فلیٹ ہیں، جب تم مجھے ملنا چاہو مجھے فون کر دینا میں تمہیں گاڑی بھیج دوں گا۔ شاہدہ کمال بے حد متاثر ہوگئی اور مرعوب ہوتے ہوئے بولی:

''آپ کا فون نمبر کیا ہے۔''

یہ سن کر وہ جیبیں ٹٹولنے لگے اور مڑے تڑے کاغذ پر چند ہندسے گھسیٹ کر بولے:

''یہ نمبر اس نائی کی دکان کا ہے جس کے اوپر والے کمرے میں مَیں رہتا ہوں وہ مجھے بلا دے گا۔''

عبدالعزیز خالد

ریل کے سفر کے دوران دو مسافر گفتگو کر رہے تھے۔ ایک نے کہا: ''عبدالعزیز خالد کے شعر کسی کو یاد نہیں رہتے، اگر آپ ان کے پانچ شعر سنا دیں تو میں آپ کو پانچ سو روپے دوں گا۔'' دوسرے شخص نے فوراً خالد کے پانچ شعر سنا دیئے۔ پہلا بہت متعجب ہوا۔ اس نے پانچ سو روپے کا نوٹ نکالا اور شرط جیتنے والے کے حوالے کرتے ہوئے کہا، اپنا تعارف تو کرائیے۔ شرط جیتنے والے نے نوٹ اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا: ''میں ہی عبدالعزیز خالد ہوں۔''

عبدالقادر قادری قادرؔ

دینہ کے معروف شاعر عبدالقادر قادری، قادر تخلص کرتے تھے۔ ایک دن جہلم میں ایک کاتب کے پاس بیٹھے تھے۔ کاتب نے لفظ قادر لکھتے ہوئے کہا: ''قادر اگر میں آپ کے نام پر ایک ہی نقطہ لگاؤں تو آپ کا کیا بنے گا؟ (یعنی فادر)''

قادر صاحب کہاں چوکنے والے تھے۔ فوراً بولے:

''اور اگر میں وہ ایک نقطہ بھی مٹا دوں تو آپ کی کیا بنے گی؟ (یعنی مادر)''

عبداللہ حسین

جب سے ''اداس نسلیں'' لکھی گئی اس وقت سے اس کتاب کی خوش قسمتی اور ہماری بدقسمتی ہے کہ ہر نسل اداس سے اداس تر ہوتی جا رہی ہے۔

بھارت کے ایک نقاد نے جب عبداللہ حسین سے ناول ''اداس نسلیں'' میں گالیوں کی موجودگی پر ناگواری ظاہر کی تو انہوں نے مختصراً صرف اتنا جواب دیا تھا کہ ''میں نے یہ ناول آپ جیسے شریف آدمی کے لیے نہیں لکھا تھا!!''

عبیداللہ علیم

جمال احسانی بہت طرح دار شاعر تھے۔ اُن کی ایک غزل نے تو دیکھتے ہی دیکھتے سرحدیں پھلاند لی تھیں۔ کہتے ہیں عبیداللہ علیم، جمال احسانی کو ملازمت دلوانے کے لیے گئے تو ملازمت دینے والا بھی شاعر تھا۔ جمال احسانی نے فرمائش پر یہی غزل سنائی جس کا مطلع تھا:

یہ سانحہ مرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا
چراغ سامنے والے مکان میں بھی نہ تھا

افسر نے کہا: ''اچھا لکھتے ہیں۔''

عبیداللہ علیم نے کہا:

''اوئے بدبخت! تمہاری نوکری اس غزل کے ایک شعر کے برابر بھی نہیں۔''

یہ سنتے ہی افسر نے درخواست پر لکھا: ''Appointed''

عبید زاکانی

عبید زاکانی عربی زبان کا مایہ ناز ادیب اور صاحبِ فن شاعر تھا۔ برجستہ گوئی میں کوئی اُس کا ثانی نہ تھا۔ گفتگو کرتا تو گویا ادب کے پھول جھڑتے، ایک ایک جملے میں شگفتگی اس طرح بھری ہوتی جیسے تاتاری ہرن کے نافے میں مُشک اور محبوب کی نیم باز آنکھوں میں شراب کی مستی۔ ایک مرتبہ اُس کے ارادت مندوں نے اُسے بتایا کہ "فلاں شاعر نے ہجویہ اشعار کے ذریعے آپ کے فن اور ذات میں کیڑے نکالنے کی کوشش کی ہے۔"

عبید زاکانی نے اپنے عقیدت گزاروں کی بات سنی تو یکا یک اس کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے تُرت جواب دیا:

"میراثی کی جُگت، بھانڈ کی پھبتی، مسخرے کے طنز، زنخے کے طعن، عورت کے تھپڑ اور معشوق کی گالی کا بُرا نہیں منانا چاہیے۔"

عتیق احمد

ہندوستان کے شاعر اور نقاد فضیل جعفری نے ایک کتاب لکھی ''زخم اور کمان''۔ وہیں کے دوسرے ناقد عتیق احمد نے اس کے بارے میں کہا: ''یہ کتاب صدفی صد سرقہ ہے۔ اس عزیز نے ایڈمنڈ ولسن کی کتاب "The Wound and The Bow" کا ترجمہ چھاپا ہے۔''

کسی نے کہا: ''مگر مواد مختلف ہے۔''

عتیق بولے: ''جب نام ہی سے سرقہ جھانک رہا ہے تو مواد پڑھنے کی کیا ضرورت؟''

عصمت چغتائی

جب ''لحاف'' کے سلسلے میں عصمتؔ چغتائی پر مقدمہ دائر ہو گیا اور اسے اپنے شوہر کے ساتھ مقدمہ کے پیروی کے لیے بمبئی سے لاہور آنا پڑا تو لاہور میں دونوں نے میاں ایم اسلم کے ہاں قیام کیا۔ میاں صاحب نے حسبِ عادت نہایت خندہ پیشانی سے اپنے مہمانوں کا خیر مقدم کیا، لیکن رات کو کھانے کے بعد عصمت سے انتہائی مشفقانہ لہجے میں کہنے لگے۔ ''تمہیں علم ہے عصمتؔ! تمہارے بھائی عظیم بیگ کے میرے ساتھ برادرانہ مراسم تھے۔ اس رشتہ سے میں تمہیں اپنی چھوٹی بہن سمجھتا ہوں۔'' اس ابتدا کے بعد انھوں نے بزرگانہ متانت سے عصمتؔ کو سمجھانا شروع کیا۔ ''شریف گھرانوں کی بہو بیٹیوں کو ایسی کہانیاں نہیں لکھنی چاہیے کہ عدالتوں، کچہریوں تک کی نوبت آ جائے، اب تم خود ہی سوچو کہ ایک بھائی کے لیے کتنی شرم کی بات ہے، کہ اس کی بہن.........'' عصمتؔ نے فوراً بات کاٹتے ہوئے جواب دیا: ''بھیا! شروع میں تو میرا بھی یہی ارادہ تھا کہ چڑے چڑیا کی کہانیوں سے آگے نہ بڑھوں، لیکن آپ کی ''گناہوں کی راتیں'' پڑھ کر نیت خراب ہو گئی۔''
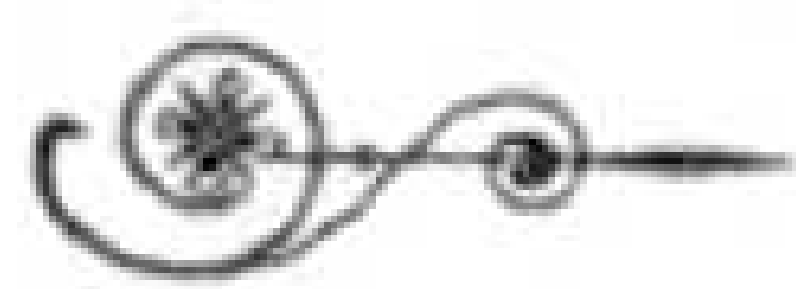
پونا میں جاں نثار اختر کا قیام جوشؔ کے گھر پر تھا۔ عصمت چغتائی وہاں جاں نثار سے ملنے کے لیے آئیں۔ گفتگو کے دوران عصمت نے کسی جملے میں لفظ ''دِماغ'' (زیر سے) کا استعمال کیا۔

جوشؔ صاحب نے حسبِ عادت تلفظ کی اصلاح کی اور کہا:

''دَماغ'' (زبر سے) بولو۔''

عصمت نے برجستہ جواب دیا:

''ہمارا تو دماغ چھوٹا ہے ہم تو دِماغ ہی بولیں گے۔ آپ کا دماغ بڑا ہے آپ دَماغ (زبر سے) بولیے۔''

علامہ ابن جوزی

علامہ ابن جوزی بغدادی کی تالیف ''لطائف حلیمہ'' میں ہے کہ ایک شخص مسجد میں نماز پڑھنے گیا۔ اس نے نیت باندھی تو کسی نے اس کا جوتا چرا کر یہودیوں کے کلیسا میں رکھ دیا جو بالکل مسجد کے متصل تھا۔ نماز سے فارغ ہو کر اس نے جوتا ڈھونڈتا شروع کیا تو اسے کلیسا میں رکھا ہوا پایا تو کہنے لگا۔ برا ہو تیرا۔ میں اسلام لایا تو تو یہودی ہو گیا۔

علامہ کیفی چریا کوٹی

علامہ کیفی کو ایک صاحب نے پان پیش کیا، اس وقت کیفی صاحب مصنوعی دانت نہیں لگائے ہوئے تھے، انہوں نے پان لینے سے معذرت کی اور کہا: ''اس وقت کھانے کی مشین نہیں ہے۔''

علامہ نیاز فتح پوری

علامہ نیاز فتح پوری صاحب زیادہ تر سائنٹفک فلمیں پسند کرتے تھے۔ عائشہ خاں نے ایک بار پوچھا: ''آپ رومانی فلمیں کیوں نہیں دیکھتے؟'' تو بولے: ''رومان کیا جاتا ہے، دیکھا نہیں جاتا۔''

عمر خیام

جدید تعلیم سے فارغ ہونے والے دو نوجوان دوستوں کو ایک ہی ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھی ملازمت مل گئی۔

ایک بار باس نے کمپنی کے ملازمین کو دعوت دی۔ دعوت کے دوران باس نے ان میں سے ایک نوجوان کے ادبی ذوق کا اندازہ کرنے کے لیے پوچھا: ''عمر خیام کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

نوجوان نے جواب دیا: ''اچھی جگہ ہے سر---لیکن ذاتی طور پر میں کے ایف سی میں جانا زیادہ پسند کرتا ہوں۔''

باس نے ناگواری سے منہ بنایا اور دوسرے مہمانوں سے باتیں کرنے لگا:

دعوت سے واپسی پر راستے میں دوسرے دوست نے پہلے کو ڈانٹا: ''بے وقوف آدمی! اگر تمہیں معلوم نہیں تھا کہ عمر خیام کیا ہے-----تو بات بدل دیتے-----احمقانہ جواب تو نہ دیتے-----گدھے کہیں کے! تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ عمر خیام کسی ریسٹورنٹ کا نہیں بلکہ شراب کا نام ہے۔''

عنایت اللہ دہلوی

مولانا عنایت اللہ دہلوی ترجمہ کرنے میں غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے۔ یوں تو ان کے والد شمس العلما منشی ذکاء اللہ دہلوی بھی اپنے وقت کے مشہور مترجم تھے اور انھوں نے بھی بہت ترجمے کیے مگر ان ترجموں میں وہ روانی اور بے ساختگی نہیں ہے جو مولانا عنایت اللہ کے تراجم میں پائی جاتی ہے۔ ان کی اس صلاحیت کا احساس سب سے پہلے سرسیّد احمد خاں کو ہوا۔ جب سرسیّد نے مولانا عنایت اللہ سے آرنلڈ کی کتاب ''دی پریچنگز آف اسلام'' کا ترجمہ کرایا۔

جسے دیکھ کر سرسیّد پھڑک اُٹھے اور مزاحاً اپنے ایک خط میں منشی ذکاء اللہ کو لکھا ''میاں تم اپنے لڑکے سے ترجمہ کرنا سیکھو!''

فانی بدایونی

ایک نشست میں تابش دہلوی نے فانی بدایونی سے متعلق ایک قصہ بیان کیا۔ یہ جامعہ عثمانیہ کے یومِ تاسیس پر ہونے والے کل ہند مشاعرے کے حوالے سے تھا۔ مشاعرے میں سیماب اکبر آبادی اور حفیظ جالندھری پہلی مرتبہ حیدر آباد دکن آئے تھے۔ اس مشاعرے میں فانی صاحب اور تابش صاحب ایک ساتھ پہنچے۔ اسٹیج پر حفیظ ان دونوں کے قریب ہی

تشریف فرما ہوئے۔ مشاعرہ ختم ہوا تو حفیظ صاحب اور فانی بدایونی کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ غالباً یہ دونوں کی پہلی ملاقات تھی۔ حفیظ نے کہا، میں نے بچوں کے نصاب کے لیے ایک نظم لکھی ہے اور اس کے مجھے اتنے روپے ملے ہیں۔ تابش نے فرمایا کہ مجھے اس نظم کی ٹیپ یاد رہ گئی ہے جو اس طرح تھی ''چل رے چرغ چرغ چوں۔''

حفیظ صاحب نے فانی سے کہا کہ آپ بھی بچوں کے لیے لکھا کریں کیوں کہ جو شاعری آپ کرتے ہیں اس کی زیادہ سے زیادہ قدر یہی ہوگی کہ لوگ آپ کا دیوان خرید کر لائبریری میں رکھ لیں گے۔

اس پر فانی بدایونی نے متانت کے ساتھ جواب دیا: ''جی ہاں! میری شاعری کا مجموعہ لائبریری میں ہوگا اور آپکا کلام بچے پڑھیں گے۔''

فرزوق

مشہور شاعر ''فرزوق'' نے ایک نوعمر لڑکے سے کہا! کیا تو اس سے خوش ہوگا کہ میں تیرا باپ بن جاؤں؟ لڑکے نے جواب دیا! مجھے آپ کے ماں بن جانے کی زیادہ خوشی ہوگی تاکہ میرے والد آپ کی خوبیوں سے مستفید ہوتے رہیں۔

فیض الحسن سہارنپوری

سہارن پور میں عیدن ایک طوائف تھی، بڑی باذوق، سخن فہم اور سلیقہ شعار، شہر کے اکثر ذی علم اور معززین اس کے ہاں چلے جایا کرتے تھے۔ ایک دن مولانا فیض الحسن سہارنپوری بھی پہنچے، وہ پرانے زمانے کی عورت نئی تہذیب سے ناآشنا، بیٹھی نہایت سادگی سے چرخہ کات رہی تھی۔

مولانا اس کو اس ہیئت میں دیکھتے ہی واپس لوٹے، اس نے آواز دی، ''مولانا آیئے، تشریف لایئے، واپس کیوں چلے؟''

مولانا یہ فرما کر چل دیئے کہ ''ایسی تو اپنے گھر بھی چھوڑ آئے ہیں۔''

قدرت اللہ شہاب

قدرت اللہ شہاب ''شہاب نامہ'' میں لکھتے ہیں:

ماسٹر منگل سنگھ کو اُردو پڑھانے میں خاص ملکہ حاصل تھا۔

ایک بار غالب کا یہ شعر آیا:

سادگی و پرکاری، بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

اس شعر کو انہوں نے یوں سمجھایا:

''سادگی نے اس دے نال پرکاری، بے خودی نے اس دے نال ہشیاری، حسن نوں تغافل دے وچ کیا پایا؟ شاعر کہندا اے، اس نے حسن نوں تغافل وچ جرأت آزما پایا۔ لوا ینی جی گل سی، غالب شعر بناندا بناندا مرگیا۔ میں شعر سمجھاندا مرجاڑاں اے، تہاڈے کوڑھ مغزاں دے پلے ککھ نئیں پینا۔''

قمر تسکین

قمر تسکین اور راولپنڈی کے ایک شاعر سلطان نصیب دانی ایک دفعہ دوست اور دوستی پر بات چیت کر رہے تھے۔

قمر صاحب نے دانی صاحب سے کہا۔ ایک دفعہ ہم دو قلم کار دوستوں نے فیصلہ کیا کہ ہم ایک دوسرے کی غلطیوں کی نشاندہی کریں گے اور ایسا کرنے سے ہماری دوستی مزید گہری بنیادوں پر استوار ہو جائے گی۔

دانی صاحب نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

''پھر اس کا کیا نتیجہ برآمد ہوا۔''

یہی کہ آج چار برس گزر چکے ہیں، ہم نے ایک دوسرے کی شکل تک نہیں دیکھی۔

قمر تسکین نے جواب دیا۔

کارل مارکس

مشہور زمانہ ماہر معاشیات اور شاعر کارل مارکس کی کتاب ''داس کیپٹل'' ایک انقلابی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ مارکس کی موت کے بعد اس کی بیوہ سے کسی نے انٹرویو لیتے ہوئے پوچھا:

''آپ اپنے شوہر کے بارے میں کیا کہنا چاہیں گی؟''

بیوی نے کہا: ''اس نے تمام عمر کیپٹل (سرمایہ) کے بارے میں لکھتے گزار دی۔ کہیں اچھا ہوتا کہ اس نے اپنے لیے تھوڑا سا کیپٹل بھی جمع کر لیا ہوتا۔''

کرشن چندر

ممتاز افسانہ نگار کرشن چندر اپنی کہانی کا 500 روپیہ معاوضہ لیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ اردو زبان کے دفاع کی تحریک کے سلسلے میں کرشن چندر نے بمبئی میں دوسرے اہلِ قلم کے ساتھ مختلف بینر لگائے۔ اگلے دن صبح سویرے ان کے ایک دوست نے آ کر اطلاع دی کہ رات جن بینروں کو انہوں نے بڑی محنت سے لگایا تھا۔ فٹ پاتھ پر سونے والوں نے انہیں اتار کر بطور چادر استعمال کر لیا ہے۔

کرشن چندر نے دوست کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا: ''یار صبح صبح تم نے 500 روپے کا فائدہ کرا دیا۔ مجھے ایک کہانی لکھنے کا موضوع مل گیا ہے۔''

کشور ناہید

پاکستان نیشنل سینٹر کی ریذیڈنٹ ڈائریکٹر کشور ناہید کسی مسجد کے متعلق ڈاکٹر عبداللہ چغتائی سے بار بار کہہ رہی تھیں۔ ''ڈاکٹر صاحب! مسجد کے صحن کی لمبائی میرے ذہن میں اٹکی ہوئی ہے۔ یہ صحن اتنا بڑا کیوں ہے؟'' اس پر مشہور مصور عبدالرحمن چغتائی (ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کے بڑے نے ایک واقعہ سنا دیا۔ میں مسجد میں بیٹھا پڑھ رہا تھا کہ ایک دیہاتی جاٹ مسجد

دیکھنے آیا۔ لمبے چوڑے وسیع صحن میں کھجور کی بنی ہوئی ایک ہی بہت بڑی چٹائی بچھی ہوئی تھی۔
اس نے مجھ سے پوچھا: ''یہ اتنی لمبی چوڑی چٹائی بچھائی کس طرح گئی تھی۔''

کیفی اعظمی

ڈی۔سی۔ایم کے مشاعرے میں کیفی اعظمی پڑھنے کے لیے آئے تو سامعین سے کہا: ''حضرات! میں نے زندگی بھر زبانی مشاعرے پڑھے مگر آج غزل لکھ کر لایا ہوں، تاکہ آپ کو یقین ہو جائے کہ میں بھی پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ اتنے میں قتیل شفائی نے آوازہ کسا، حضرات کیف صاحب کے ہاتھ میں جو کاغذ ہے، وہ کورا ہے۔ اس پر کیفی صاحب نے کہا: ''یہ قتیل بھی ان پڑھ ہے۔ لکھے ہوئے کو کورا کہہ رہا ہے۔''

کیفی دہلوی

پنڈت برج موہن دِتاتریہ کیفی دہلوی ایک بار لکھنؤ گئے تو ان کی اعزاز میں محفل شعر وسخن سجی۔ حامد علی خان بیرسٹر ایٹ لاء جو شعر وسخن کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ محفل میں موجود تھے، ان سے غزل یا نظم کی فرمائش کی گئی تو انہوں نے کیفی دہلوی کے کان کے پاس منہ لے جا کر یہ شعر کہا:

اکہتر، بہتر، تہتر، چوہتر
پچھتر، چھہتر، ستتر، اٹھتر

اس مذاق پر کیفی دہلوی نے خوش دلی سے داد دی۔ آخر میں جب کیفی صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش کی گئی تو انہوں نے بیرسٹر حامد علی خان کے کان کے پاس اپنا منہ لے جا کر کہا:

اکیاسی، بیاسی، تراسی، چوراسی
پچاسی، چھیاسی، ستاسی، اٹھاسی

اس پر ساری محفلِ سخن کشتِ زعفران بن گئی اور یہ لطیفہ ہمیشہ کے لیے امر ہو گیا۔
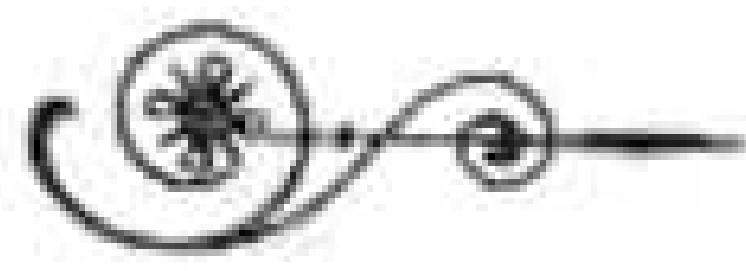
پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی ویسے تو سنجیدہ شاعر تھے، مگر اندھیرے اجالے ظرافت سے بھی نہ چوکتے تھے۔ایک قطعہ کی صورت میں یہ ادبی لطیفہ دنیائے لطافت کو عطا کیا:

کل یہ شاگرد سے استاد نے جھنجھلا کے کہا
تو پڑھے گا نہ کبھی ہٹ میرا بھیجہ مت کھا
کند ہے ذہن ترا، ٹھس ہے طبیعت تیری
کچھ نہ آئے گا تجھے، قوم کا شاعر بن جا!

گلزار دہلوی

علی گڑھ کے ایک مشاعرے میں جب گلزار دہلوی پڑھنے آئے تو مشاعرے کی ہوٹنگ کا ماحول دیکھ کر کہا: ''حضرات، آج میرے پاس غزل نہیں ہے، میں نعت پیش کروں گا۔نعت کا سن کر ہوٹنگ کرنے والوں نے با آواز بلند درود شریف پڑھنا شروع کر دیا۔''

گوہر الیاس جلالی

نامور شاعر اور ناول نگار گوہر الیاس جلالی اپنی داستانِ حیات سناتے ہوئے کہہ رہا تھے:''بالآخر دس سال بعد مجھے علم ہو گیا ہے کہ میں تخلیقِ ادب کی صلاحیت سے قطعی عاری ہوں۔''

ایک پرانے واقف کار نے کہنے لگے:
''پھر کیا تم نے اپنے ادبی شغل سے کنارہ کشی کا سوچا ہے؟''
گوہر بولا:
''کہاں یار! اَب تو میں ادیب کی حیثیت سے بہت مشہور ہو چکا ہوں۔''

گھسیٹا رام

نامور مصنف گھسیٹا رام نے ایک ملاقاتی سے پوچھا آپ کا نام کیا ہے؟

گھ......گھ......گھ......سی......ٹا......

پھر اس نے مصنف سے پوچھا:

سر آپ کا اصل نام کیا ہے؟

نام تو میرا بھی گھسیٹا ہے لیکن اتنا نہیں جتنا تم نے گھسیٹا ہے۔

گوپی ناتھ امنؔ

گوپی ناتھ امنؔ جن دِنوں زندگی اور موت کی کشمکش میں بستر پر دراز تھے۔ ڈاکٹر انہیں دیکھنے آیا تو اس نے امنؔ صاحب سے کہا:

''ذرا زبان نکالیے!''

امنؔ صاحب نے مسکرا کر کہا: ''جناب زبان درازی اچھی نہیں ہوتی۔''

شعر خوانی سے قبل شعرا حضرات کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے یہ فیصلہ ہوا کہ فرشی نشست ہو۔ چنانچہ گوپی ناتھ امنؔ نے شعرا کو کرسیوں پر سے فرش پر بلاتے ہوئے کہا:

''حضرات! اب اہل فن کا زوال ہو رہا ہے۔''

لیو ٹالسٹائی

ٹالسٹائی ایک مرتبہ بازار سے گزر رہا تھا کیا دیکھتا ہے کہ پولیس کا ایک کانسٹیبل ایک بھکاری کو ڈانٹ ڈپٹ کر رہا تھا۔ ٹالسٹائی نے کانسٹیبل کے قریب جا کر کہا۔ کیا تم نے انجیل

پڑھی ہے؟ اور تمہیں معلوم ہے کہ اس میں گداگروں سے نیک سلوک کے متعلق کیا لکھا ہے؟''
کانسٹیبل نے جواب دیا: ''کیا تم نے ضابطہ فوجداری کا مطالعہ نہیں کیا، اور تمہیں معلوم نہیں کہ اس میں بھیک مانگنے کے متعلق کیا لکھا ہے؟''

ماہر القادری

ایک زمانہ تھا کہ فلمی دنیا اس طرح سے ایک طلسماتی دنیا نظر آتی تھی کہ شوٹنگ دیکھنے کا شوق ہر شخص کو ہوتا تھا۔ اکثر باریش اور مذہبی حضرات بھی اس خواہش پر قابو نہیں پا سکے۔ ایک بار اتفاق سے ماہر القادری صاحب اپنے اس شوق کی تسکین کے لئے کسی کے ساتھ اسٹوڈیو پہنچ گئے کہ وہاں ان کا جاننے والا کون ملے گا۔ اتفاق سے اسی دن شورش کاشمیری بھی پہلی مرتبہ شوٹنگ دیکھنے پہنچے اور دونوں کی ملاقات ہوئی تو ماہر القادری نے ہنستے ہوئے فی البدیہہ یہ شعر کہا:

دل لگانے کا جہاں موقع بھی تھا کوشش بھی تھی
ہائے وہ محفل جہاں شورش بھی تھا شورش بھی تھی

مجنوں گورکھپوری

برسات کا موسم تھا۔ یونیورسٹی میں چاروں طرف گھاس اگ آئی تھی۔ گھسیارے گھاس کاٹنے میں جتے ہوئے تھے۔ ممتاز شاعر پروفیسر مجنوں گورکھپوری کی کلاس جاری تھی۔ ایک گھسیارن کلاس کے سامنے والے برآمدے سے گزری۔ طلبا کی نظریں لامحالہ اس کی طرف اٹھیں۔ مجنون نے بھی اس جانب دیکھا اور بے ساختہ بولے:

''یہ کون ہے؟''

ایک گوشے سے آواز آئی:

''لیلیٰ گورکھپوری''

یہ سننا تھا کہ سارے کلاس میں قہقہے گونجنے لگے۔

محمد حامد سراج

مشہور افسانہ نگار محمد حامد سراج جب بک کارنر شوروم پر تشریف لائے تو اُن سے چائے میں چینی کی مقدار کا پوچھا گیا۔ چونکہ حامد صاحب شوگر کے مریض تھے لہٰذا کہنے لگے:
''دو چمچ پیالی میں ڈال دیجیے ---- مگر ہلایئے گا نہیں!''

محمد طفیل

نقوش کے مدیر، محمد طفیل نے ایک بار اپنے معاصر میرزا ادیب کو اپنی کوئی کتاب دی اور داد کے طالب ہوئے۔ میرزا ادیب نے کہا، ''ٹائٹل اچھا ہے۔'' محمد طفیل اس خاموش طنز کو پی گئے۔ کئی سال بعد میرزا ادیب نے اپنی کتاب ''نقوش'' میں تبصرہ کے لیے دی۔ محمد طفیل نے کسی رائے کا اظہار کیے بغیر کتاب ایک طرف رکھ دی۔ میرزا ادیب نے بے چینی سے ان کی طرف دیکھا اور کہنے لگے: ''طفیل صاحب! کیا خیال ہے، کتاب پسند آئی؟'' طفیل صاحب نے سادگی سے جواب دیا: ''اس کا تو ٹائٹل بھی اچھا نہیں۔''

محمود نظامی

محمود نظامی اپنے سفر نامے میں لکھتے ہیں کہ میں اسلامیہ کالج میں نیا نیا داخل ہوا تھا۔ ڈاکٹر تاثیر انگریزی کی کلاس لیا کرتے تھے۔ ایک دن اپنے لیکچر کے دوران انہوں نے کہا: ''موپاساں کی کہانیوں کا ایک مجموعہ کالج کی لائبریری میں آیا ہے، لیکن مصنف کی صاف گوئی اور بے باکی اِس امر کی متقاضی ہے کہ نوعمر طلبہ کو یہ کتاب پڑھنے کو نہ دی جائے۔ چنانچہ لائبریرین کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ یہ شجرِ ممنوعہ تصور کی جائے۔''

جیسے ہی چھٹی ہوئی، ہاسٹل کا رُخ کرنے کے بجائے میں سیدھا راما کرشنا کے ہاں پہنچا اور اُس سے یہ کتاب طلب کی۔ اُس بڈھے تاجر نے مسکرا کر پوچھا: ''کیا اسلامیہ کالج میں پڑھتے ہو؟'' میں نے سر کی جنبش سے اثبات میں جواب دیا۔ اُس نے الماری سے کتاب

نکالی۔ پھر اس کے دام بتاتے ہوئے بولا: ''اِس کتاب کی 8 کاپیاں پچھلے دو گھنٹے میں اسلامیہ کالج کے طلبہ کے ہاتھ بیچ چکا ہوں، کیا یہ کتاب کورس میں داخل ہوگئی ہے؟''

مرتضیٰ احمد خان میکش

مولانا ظفر علی خان اور مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش ایک مشاعرہ میں اکٹھے تھے۔ میکش نے پانی مانگا تو ایک سفید ریش بزرگ پانی لے کر آئے۔

اس پر میکش نے مصرع کہا:

لے کے خود پیرِ مغاں ساغر و مینا آیا

ظفر علی خان نے فوراً گرہ لگائی:

میکشو! شرم، تمہیں پھر بھی نہ پینا آیا

مرزا حسنین اعظم

شاعر مرزا حسنین اعظم کا نیا شعری مجموعہ ''ہم سفر'' مارکیٹ میں آیا تو ان کے ایک قاری نے ایک محفل میں ملاقات کے دوران میں انہیں مجموعے کے بارے میں مبارک باد دی اور بولا: ''اس مجموعے کا اختتام بہت اچھا ہے۔''

''اور آغاز کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟'' شاعر نے پوچھا۔

''ابھی میں وہاں تک پہنچا نہیں۔'' قاری نے جواب دیا۔

مدن موہن مالویہ

معروف ہندو رہنما مدن موہن مالویہ کی بے ہنگم ڈاڑھی پر ایک شاعر نے پھبتی کسی تھی:

ہزار شیخ نے ڈاڑھی بڑھائی سن کی سی
مگر وہ بات کہاں مالوی مدن کی سی

اس شعر کے ساتھ ''حسن سلوک'' یہ ہوا کہ بعد کے دور میں کسی کاتب نے اس کی ''اصلاح'' کر دی اور مالوی کو مولوی کر دیا۔ اس نے سوچا ہو گا، ایک مولوی ہوتا ہے ایک مولانا، یہ مالوی تو سنا نہیں۔ ضرور پہلے والے کاتب کی غلطی ہے۔ چنانچہ اب یہ شعر یوں لکھا جاتا ہے:

ہزار شیخ نے ڈاڑھی بڑھائی سن کی سی
مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

حالانکہ بے چارے ''مدن'' نام کا کوئی مولوی کبھی تھا ہی نہیں۔

مرزا ظفر الحسن

کراچی کی ''غالب لائبریری'' کے بانی مرزا ظفر الحسن، فیض احمد فیض کے زبردست مداح تھے۔ ان کی دوستی مشفق خواجہ صاحب سے بھی بہت تھی۔

ایک روز خواجہ صاحب ان کے پاس گئے، وہ کچھ بیٹھے لکھ رہے تھے۔ خواجہ صاحب نے کہا:

''ایک شعر سنتا۔ دیکھو کیسا ہے۔'' پھر انہوں نے فیض احمد فیض کا ایک شعر انہیں سنایا۔

مرزا صاحب نے شعر سنا اور سرسری انداز میں بولے:

''کوئی خاص نہیں۔''

''کیا کہہ رہے ہو۔ ارے یہ شعر فیض صاحب کا ہے۔'' خواجہ صاحب بولے۔

''اچھا'' مرزا صاحب ذرا چونکے اور قلم چھوڑتے ہوئے بولے:

''ذرا پھر سے سنانا۔''

خواجہ صاحب نے شعر دوبارہ سنایا۔

مرزا نے اچھل کر زبردست داد دی اور بولے:

''کیا اچھا شعر ہے۔ تم نے نہایت بُری طرح سنایا تھا۔''

مظفر حنفی

بنگال میں بنگالیوں کی ہندی اُردو کا جہاں تلفظ غلط ہوتا ہے وہیں جمع واحد اور تذکیر و تانیث کے اصول بھی بالکل الگ ہیں۔ مظفر حنفی کا جب کلکتہ یونیورسٹی میں تقرر ہوا تو کچھ عرصے بعد وائس چانسلر بھاسکر راؤ چودھری نے ان سے پوچھا: ''پروفیسر حنفی! آپ تو بنگلہ بول لیتے ہوں گے؟''

حنفی نے ہنس کر جواب دیا: ''جی سر! چائے کھابو اور جول کھابو کی حد تک۔''

بنگلہ تو بہت آسانی سے سیکھی جا سکتی ہے۔ چودھری صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے چودھری صاحب۔'' حنفی صاحب نے کہا: ''لیکن میرے پاس وقت ہی کہاں ہے، میں تو چوبیس گھنٹے اپنی اُردو بچانے میں لگا رہتا ہوں۔''

مولانا احمد رضا خان بریلوی

ایک دفعہ مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ کی خدمت میں ایک آدمی حاضر ہوا اور ایک کتاب پیش کر کے جس کا نام تھا ''آریہ دھرم پر چار'' مولانا سے اس کتاب پر تبصرہ کرنے کو کہا۔ مولانا نے اسی وقت قلم اٹھائی اور ''آریہ دھرم پر چار'' کے آگے لفظ ''حرف'' لکھ دیا۔ اس طرح کتاب کا نام یوں ہوگیا ''آریہ دھرم پر چار حرف'' یہ اتنا بڑا تبصرہ تھا کہ اس کے بعد کسی اور تبصرہ کی ضرورت ہی نہ رہی۔ محفل میں موجود تمام سامعین حضرت بریلوی کی اس ذہانت سے بیحد محظوظ ہوئے۔

مولانا اشرف علی تھانوی

کسی نے مولانا اشرف علی تھانوی سے پوچھا: ''مولانا، کیا جنت میں حقے بھی ملیں گے؟''

''ضرور ملیں گے۔'' مولانا اشرف علی تھانوی نے جواب دیا۔ ''مگر ان کے لیے آگ تمہیں دوزخ سے جا کر خود ہی لانی ہوگی۔''

مولانا جلال الدین رُومی

مولانا روم رحمۃ اللہ صلح جو اور میانہ رو بزرگ تھے۔ ایک دفعہ دوران تقریر فرمایا! اسلام میں اتنے فرقے اور مسلک ہیں میں ان سے متفق ہوں۔ ایک متعصب مولوی یہ سنتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور انہیں برا بھلا کہنے لگ گیا۔ مولانا ان کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا! جو کچھ آپ میرے متعلق ارشاد فرما رہے ہیں میں اس سے بھی متفق ہوں۔

مولانا حسرت موہانی

مولانا حسرت موہانی نے جب ستیہ گرہ کیا تو پولیس انھیں گرفتار کرنے آئی۔ مولانا بھی اپنی طبیعت کے لیڈر تھے۔ انھوں نے کہا: ''میں اپنی گرفتاری میں تمہاری مدد کیوں کروں، میں تو نہیں چلتا، تمہیں غرض ہو تو لے چلو۔'' چناں چہ چار پولیس والے انھیں اُٹھا کر موٹر تک لے گئے۔

مولانا ظفر علی خاں نے اخبار ''زمین دار'' میں لکھا۔ ''حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو ایک گدھے پر چڑھا کرتے تھے مگر مولانا حسرت موہانی نے بیک وقت چار گدھوں پر سواری کی۔''

مولانا شوکت علی

مولانا شوکت علی عربی نہیں جانتے تھے لیکن جب کبھی بعض عرب بزرگ ان سے ملنے آتے تو مولانا ان سے عربی میں باتیں کرنے کی کوشش کرتے یعنی عربی کے دو تین سُنے سُنائے لفظ کہے اور جو کمی رہ گئی وہ ہاتھوں اور آنکھوں کے بلیغ اشاروں سے پوری کر دی۔ مثلاً ایک عرب سے باتیں کر رہے تھے۔ یا شیخ، المسلمون نائمون (آنکھیں بند کر لیں) فی کلِ

عالم نائمون (انگلی فضا میں گھمائی) خلوص مافش۔فلوس بافس۔خیر۔ان اللہ کلی شیٔ قدیر (اور اوپر اللہ کی طرف اشارہ کر دیا)

ایک دن چند نوجوان سر ہو گئے کہ آپ عربی تو جانتے نہیں، عربی میں باتیں کیسے کر لیتے ہیں، کہنے لگے ''واہ، عربی کیوں نہیں جانتے، ہم خوب عربی جانتے ہیں۔'' کسی لڑکے نے پوچھا، ''اچھا یہ تو بتایئے گھٹنے کو عربی میں کہتے ہیں؟'' بلا تامل جواب دیا، ''گھٹنا تو عرب میں ہوتا ہی نہیں۔'' لڑکے مارے قہقہوں کے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

مولانا عبدالسلام نیازی

مولانا عبدالسلام نیازی کو میں نے پہلی مرتبہ حکیم نصیر میاں کے دیوان خانے میں دیکھا تو میں یہ سمجھا، یہ کوئی پہلوان ہیں۔سر گُھٹا ہوا، چاراَبرو کا صفایا، سر پر چوٹی ہوتی اور دھوتی باندھے ہوتے تو متھرا کے چوبے معلوم ہوتے۔

شاہ نظام الدین حسن بریلوی رحمۃ اللہ کے مرید تھے۔جن لوگوں نے مولانا کا ناریل چٹختے دیکھا ہے، اُن کا کہنا ہے کہ

> ''مولانا کا جلال دیکھنے کا ہوتا تھا۔اپنے حریفوں پر ایسا گرجتے تھے کہ اللہ کی پناہ! گالیاں دینے پر آتے تو اُن گالیوں میں بھی علمی و ادبی رنگ جھلکتا۔وہ عالموں میں عالم تھے، رندوں میں رند، پابندِ شرع اور عابدِ شب زندہ دار تھے۔''

کہتے ہیں کہ خواجہ حسن نظامی کی فرمائش پر مولانا نے تصوّف پر ایک کتاب لکھی تھی۔مولانا یہ کتاب خواجہ صاحب کے پاس لے کر آئے تو خواجہ صاحب نے کہا:

> ''مولانا! اس کتاب پر آپ کا نام شائع نہیں ہو گا۔اِسے ہم شائع کریں گے۔''

مولانا نے خواجہ صاحب کے ہاتھ سے کتاب لے کر اُس کے پُرزے اُڑا ڈالے۔

خواجہ صاحب نے کہا:

''یہ کیا غضب کیا؟''

مولانا نے فرمایا:

''کوئی بات نہیں بس شیخ، اِسی بات پر چائے پلوادو۔''

مولانا بڑے خوش طبع اور حاضر جواب تھے۔ جملہ ایسا چست کرتے کہ سبحان اللہ! صابر صاحب رحمہ اللہ کے عرس پاک میں شریک ہونے کے لئے مولانا ایک لاری میں سوار ہوئے۔ لاری میں ایک صوفی صاحب بھی تھے۔ گیروارنگ کے کپڑے، بڑی بڑی زلفیں۔ ایک چھیل چھبیلی، کم سِن، خوب رُو طوائف لاری میں داخل ہوئی تو صوفی صاحب نے چلا کر کہا:

''جلّ جلالہٗ''

اُس کے پیچھے اُس کی نائیکا تھی، بدہیئت، عمر رسیدہ، موٹی۔ مولانا نے فوراً صوفی صاحب سے کہا:

''حضرت سنبھالیے جلّ جلالہٗ کے پیچھے عمّ نوالہٗ بھی تشریف لا رہی ہیں۔''

مولانا عبدالماجد دریا آبادی

ایک دفعہ برصغیر کے نامور سکالر مولانا عبدالماجد دریا آبادی مرحوم (مدیر ہفت روزہ ''صدقِ جدید'') لکھنؤ سے کسی نے شکایتاً کہا:

''مولانا صاحب! یہ کتنی قابلِ شرم بات ہے کہ آج کل چوری چکاری کے واقعات میں بہت سے مولوی لوگ بھی ملوث پائے گئے ہیں؟''

مولانا موصوف نے متبسم فرمایا:

''برخوردار مولوی چوریاں نہیں کرتے بلکہ چوروں نے ''ڈاڑھیاں'' بڑھالی ہیں!!''

مولانا گرامی

مولانا گرامی اونچا سنتے تھے۔ ان کی بیگم کو بھی یہی عارضہ تھا۔ جالندھر کے ان کے احباب کا بیان ہے کہ رات کو جب کبھی ہم مولانا کے گھر کے پاس گزرتے تو دیوار سے لگ کر

خوب شعر سنتے کیونکہ دنوں میاں بیوی ایک دوسرے کو چلا چلا کر اپنے اپنے شعر سنایا کرتے تھے۔

مولانا محمد حسین آزاد

''آبِ حیات'' کے مصنف مولانا محمد حسین آزاد کی اپنے کسی ہم عصر سے چشمک تھی۔ وہ انہیں دیکھ کر کھنکھارتے اور تھوکا کرتے تھے۔ ایک روز مولانا کو دیکھ کر انہوں نے یہی حرکت کی اور تھوکا تو محمد حسین آزاد سے رہا نہ گیا۔ بلند آواز سے بولے۔

''میں تو تھوکتا بھی نہیں۔''

مولانا مظفر الدین

مولانا مظفر الدین نے معزز الدین شاہ کے لیے ایک قصیدہ لکھا جس کا ایک شعر ''خاقانی'' کا سرقہ تھا۔ بادشاہ نے اعتراض کیا۔ مولانا نے کہا! خاقانی نے میرا مضمون چرایا ہے۔ بادشاہ نے کہا! خاقانی تمہاری پیدائش سے پہلے مر چکا ہے۔ مولانا بولے! جب عالم ارواح میں اس شعر کا مضمون میری روح کی طرف آرہا تھا خاقانی اچک کر لے گئے۔

مولوی سیّد ممتاز علی

ایک دن مولوی سیّد ممتاز علی نماز کی اہمیت پر گفتگو کر رہے تھے۔ کہنے لگے! نماز تو ہر حال میں فرض ہے۔ باقی رہے اس کے ارکان تو وہ بعض خاص ضرورتوں اور مجبوریوں کی حالت میں ساقط بھی ہو جاتے ہیں۔ مثلاً جو شخص کھڑا ہو کر نماز نہ پڑھ سکے وہ بیٹھ کر پڑھ لے اور جو بیٹھ کر نہ پڑھ سکے وہ لیٹ کر بلکہ خاص حالات میں اشاروں ہی سے پڑھ لے۔ پھر کہنے لگے! ایک دفعہ میں ٹرین میں لاہور سے دیوبند جا رہا تھا۔ ایک ہم سفر کو دیکھا کہ اس نے نماز کے لیے اپنے پاس بیٹھنے والوں کو جگہ خالی کرنے کی تکلیف دیئے بغیر ٹرین کی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ہاتھ باندھ لیے اور اشارے سے رکوع و سجود کر کے نماز ادا کر دی۔

میں دیوبند پہنچا تو مولانا محمود الحسن سے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا! مولوی صاحب اس شخص کی نماز نہیں ہوئی۔ میں نے برجستہ کہا! حضرت ہمارے سامنے تو ہو گئی تھی۔ اس پر مولانا محمود الحسن بے اختیار ہنس دیئے۔

مولوی محمد یحییٰ تنہا

غالباً ۱۹۰۹ء یا ۱۹۱۰ء عیسوی کی بات ہے کہ مولوی محمد یحییٰ تنہا، بی۔ اے۔ وکیل میرٹھ نے مولانا حالی کو اپنی شادی میں پانی پت سے بلایا۔ شادی کے بعد مولانا حالی اور مولوی محمد اسماعیل میرٹھی اور بعض دوسرے بزرگ بیٹھے آپس میں گفتگو کر رہے تھے کہ مولانا محمد اسماعیل میرٹھی نے مسکراتے ہوئے مولوی محمد یحییٰ تنہا سے کہا: ''اب آپ اپنا تخلص بدل دیں، کیونکہ اب آپ تنہا نہیں رہے۔'' اس پر مولانا نے فرمایا کہ ''نہیں، مولوی صاحب یہ بات نہیں، تن ہا تو یہ ابھی ہوئے ہیں۔'' اس پر تمام مجلس مولانا حالی کی جودت طبع پر حیران رہ گئی۔

میر ناصر علی

مغل بادشاہ اورنگزیب عالمگیر کو اپنی بیٹی زیب النساء کے لیے اُستاد درکار تھا۔ یہ خبر سن کر ایران اور ہندوستان کے مختلف علاقوں سے بیسیوں قادر الکلام شاعر دہلی آ گئے کہ شاید قسمت یاوری کرے اور وہ شہزادی کے استاد مقرر کر دیئے جائیں۔

ان ایام میں دہلی میں اس زمانہ کے نامور شاعر برہمن اور میر ناصر علی سرہندی بھی موجود تھے۔ نواب ذوالفقار علی خان، ناظمِ سرہند کی سفارش پر برہمن اور میر ناصر کو شاہی محل میں اورنگزیب کے روبرو پیش کیا گیا۔ سب سے پہلے برہمن کو اپنا کلام سنانے کا حکم ہوا، برہمن نے تعمیلِ حکم میں جو غزل پڑھی، اس کا مقطع تھا:

مرا دلیست بکفر آشنا کہ چندیں بار
بکعبہ بُردم و بازم برہمن آوردم

(میرا دل اس قدر کفر آشنا ہے کہ میں جب بھی کعبہ گیا، برہمن کا برہمن ہی واپس آیا)

گو یہ محض شاعرانہ خیال تھا اور تخلص کی رعایت کے تحت کہا گیا تھا لیکن عالمگیر انتہائی پابند شرع اور سخت گیر بادشاہ تھا، اس کی تیوری چڑھ گئی اور وہ برہمن کی طرف سے منہ پھیر کے بیٹھ گیا۔

میر ناصر علی نے اس صورتِ حال پر قابو پانے کے لیے اٹھ کر عرض کی کہ جہاں پناہ اگر برہمن مکہ جانے کے باوجود برہمن ہی رہتا ہے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں، شیخ سعدی بھی تو یہی کہہ گئے ہیں:

خرِ عیسیٰ اگر بمکہ رود
چوں بیاید ہنوز خر باشد

(عیسیٰ کا گدھا اگر مکہ بھی چلا جائے وہ جب واپس آئے گا، گدھے کا گدھا ہی ہوگا)

عالمگیر یہ شعر سن کر خوش ہوگیا اور برہمن کو معاف کر دیا۔

میرزا ادیب

افسانہ نگار، ڈراما نویس میرزا ادیب نے بتایا کہ انہوں نے اپنی کتاب ''صحرا نورد کے خطوط'' قلعہ لاہور کے سائے میں بیٹھ کر لکھی تھی ''میں اپنے ساتھ میں بھنے ہوئے چنے لے جاتا تھا، بھوک لگتی تھی تو یہی کھا لیتا تھا۔''

ایک صاحب نے کہا: ''حیرت ہے کہ آپ یہ چنے کھا کر ایک ایسی عمدہ کتاب لکھ دی ورنہ آج کل کے مصنف تو ایسی کتابیں لکھتے ہیں جنہیں پڑھتے ہوئے لگتا ہے جیسے لوہے کے چنے چبا رہے ہوں۔''

میزا ادیب کا خط، خطِ مرموز قسم کی چیز ہے۔ اچھی طرح پڑھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

ایک مرتبہ کسی رسالے کے مدیر نے اُن کا ایک مضمون کاتب کو لکھنے کے لیے دیا۔

کاتب ذرا دیر بعد ہی واپس آ گیا اور مسودہ مدیر کو واپس کرتے ہوئے بولا:

''جناب! میں کاتب ضرور ہوں، مگر صرف اُردو زبان کے مسوّدے کتابت کرتا ہوں۔ موئن جودڑو کے رسم الخط سے مجھے کوئی واقفیت نہیں۔''

ناصر زیدی

ناصر زیدی کافی لمبے بال رکھتے ہیں۔ ایک بار بال ترشوانے کے لیے حجام کی دکان پر گئے اور حجام سے پوچھا:

''کیا پچھلی بار آپ نے میری حجامت بنائی تھی۔''

اس نے مسکرا کر جواب دیا:

''نہیں حضور! مجھے تو ابھی یہاں آئے صرف تین سال ہوئے ہیں۔''

ناصر کاظمی

شاعر ناصر کاظمی جوتا خریدنے بازار تشریف لے گئے۔ دکاندار ناصر صاحب کا دوست اور پرمزاح طبیعت کا مالک تھا۔ ناصر صاحب نے کئی جوتے پہنے اور کہنے لگے، ''پہلے تو مجھے چھوٹا نمبر پورا آجاتا تھا لیکن اب وہی نمبر پاؤں میں چھوٹا پڑ رہا ہے۔''

دکاندار نے کہا: ''جناب! اس کی وجہ یہ ہے کہ اب آپ کا پاؤں بھاری ہو گیا ہے۔''

ایک مرتبہ حبیب جالب نے ناصر کاظمی سے کہا:

''جب بھی آپ کی کوئی غزل کسی رسالے میں دیکھتا ہوں، دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے، کاش یہ غزل میرے نام سے چھپتی!''

ناصر کاظمی نے شکریہ ادا کیا۔ کچھ دیر بعد حبیب جالب نے پوچھا: ''میری غزل

دیکھ کے آپ کا کیا ردِعمل ہوتا ہے؟''

ناصر کاظمی نے کہا: ''شکر ادا کرتا ہوں کہ یہ غزل میرے نام سے نہیں چھپی۔''

نذیر بنارسی

گورکھ پور میں نئے سال کے سلسلے میں مشاعرہ تھا۔ عمر قریشی نے نظامت فرماتے ہوئے کہا: ''بہت حسین اتفاق ہے کہ نئے سال کی خوشی میں مشاعرہ ہے اور شاعر بھی کل بارہ ہیں۔ گویا ہر مہینے کے حساب سے ایک شاعر ہے۔''

شاعروں میں سب سے چھوٹے قد والے شاعر نذیر بنارسی سب سے پہلے مائیک پر آئے تو سامعین میں سے کسی نے زور سے کہا:

''فروری کے مہینے کو پہلے کیوں بلا لیا؟''

نصر اللہ خاں

کسی ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا لوہے کے چنے چبانا ہے۔ ترجمے میں یوں ہوتا ہے کہ اصل زبان میں جس نے جو کہا تھا، مترجم نے اسے اپنی زبان میں ایسا بدلا کہ اگر مصنف اس زبان سے واقف ہوتا تو وہ خودکشی کر لیتا یا مترجم صاحب کا ایسا حلیہ بگاڑتا جیسا مترجم صاحب نے اپنے ترجمے میں اس کا بگاڑا ہے۔ بعض مترجم ترجمے اور تشریح میں تمیز نہیں کر پاتے۔ ترجمے کے بجائے شرح فرما کر مصنف کو خودکشی پر اکساتے ہیں۔ کل ہماری نظر سے مرزا غالب کے اشعار کا انگریزی ترجمہ گزرا، جو ایک اردوداں انگریزی خواں نے کیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟

آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟

What is wrong with you foolish heart?

Does love's pain have a remedy?

وہ تو کہیے، مترجم نے ''دل ناداں'' کا ترجمہ "Foolish Heart" کیا ہے۔ اگر مترجم صاحب غصے میں آ کر ''یوڈیم بلڈی فلش ہارٹ'' کر دیتے تو کوئی ان کا کیا بگاڑ لیتا اور ''آخر اس درد کی دوا کیا ہے'' میں جو ایک ابہام تھا، کس آسانی سے کھول دیا ہے۔ سبحان اللہ! اسے کہتے ہیں ترجمہ!

نصر اللہ خاں لکھتے ہیں:

پچھلے دنوں میں نے ایک مسجد کی دیوار پر ڈامر سے یہ لکھا دیکھا: ''شراب بند کرو۔''
اور ایک شراب خانے کی دیوار پر لکھا تھا: ''نماز قائم کرو۔''

میرے دماغ میں یہ سوال پیدا ہوا کہ لکھنے والا کون ہوسکتا ہے، شرابی یا نمازی؟ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ میں نے اپنے دوستوں سے پوچھا تو ایک دوست نے کہا، ''یہ کام کسی شرابی کا معلوم ہوتا ہے۔''

میں نے کہا، ''اگر اول الذکر شرابی تھا تو اس نے شراب خانے کی دیوار پر یہ کیوں لکھا: ''نماز قائم کرو؟''

دوست نے کہا، ''شراب کا نشہ بڑھ گیا ہوگا۔''

میں نے کہا، ''اچھا، اگر ایسا ہی ہے تو اس نے مسجد کی دیوار پر یہ کیوں لکھا: ''شراب بند کرو؟''

دوست نے کہا: ''شراب کا نشہ اتر گیا ہوگا۔''

نظامت تاجدار

عام طور پر ہندی داں حضرات کے ساتھ یہ مسئلہ رہتا ہے کہ یہ حضرات عموماً اُردو الفاظ یا ناموں میں 'ز' اور 'ج' کی آوازوں کو آپس میں بدل دیتے ہیں۔ اس پر ایک واقعہ یاد آیا جو ہمارے محترم دوست و شاعر تاجدار تاج صاحب نے ہمیں سنایا تھا۔ ان کا تعلق بھی

دیوبند سے ہے۔ ایک مرتبہ ایک جلسے میں صدارت ایک جلیل صاحب کر رہے تھے۔ اس میں وہاں کے ایک مشہور زمیندار شام لال جی بھی تھے جو مہمانِ خصوصی تھے۔ جلسے کی نظامت تاجدار صاحب کر رہے تھے۔ جلیل صاحب نے تاجدار صاحب کے کان میں کہا کہ اب دیکھئے یہ شال لال جی تقریر کریں گے اور یقینی طور پر مجھے ذلیل (جلیل کے بجائے) کریں گے۔ تاجدار صاحب نے کہا آپ فکر نہ کیجئے ایسا نہیں ہوگا اور واقعی جب شال لال جی آئے تو انہوں نے صحیح نام لیا یعنی جلیل صاحب کہہ کر مخاطب کیا۔ جلسے کے بعد جلیل صاحب نے پوچھا کہ یہ کرشمہ کیسے ہوگیا۔ تاجدار صاحب نے کہا: بہت آسانی سے۔ میں نے ہندی میں آپ کا نام انہیں ذلیل صاحب لکھ کر دیا ہے، اس لئے انہوں نے اسے جلیل صاحب پڑھا۔

نظیر اکبرآبادی

مائی تھان جاتے ہوئے کناری بازار پڑتا ہے۔ کوٹھے پر سے ایک مہوش نے مسکرا کر (نظیر اکبرآبادی سے) کہا کہ میاں! ہم کو بھی اپنا کلام سنا دو، یاد کرلیں، گائیں گے اور کمائیں گے۔"

وہ اس فرمائش پر بہت جزبز ہوئے۔ اس کا اصرار بڑھ رہا تھا اور وہ ماننے والی نہ تھی، کہنے لگے:

لکھیں ہم عیش کی تختی پہ کس طرح اے جاں
قلم زمین کے اوپر، دوات کوٹھے پر

وہ جھینپ کر چپ ہوگئی، یہ چلتے بنے۔

نظیر صدیقی

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں شادانی صاحب کے علاوہ نظیر صدیقی اور دوسرے اساتذہ موجود تھے۔ ٹفن کا گھنٹا بجتے ہی دس بارہ طلبہ کا گروہ شعبے میں در آیا اور شکایت کرنے لگا کہ چونکہ نماز پڑھنے کا کمرہ طالبات کے کامن روم کے مقابل ہے،

اس لیے لڑکیوں کی ''چیں چیں، میں میں'' کہ یا تو نماز کا کمرہ بدل دیا جائے گا یا طالبات کا کامن روم۔ اس کے بعد انہوں نے کہا: ''مگر آپ لوگ ایک لطیفہ سنتے جائیں: ''ایک مرتبہ ایک شخص کسی میدان میں نماز پڑھ رہا تھا کہ اس کے سامنے سے مجنوں کا گزر ہوا۔ نمازی جلدی سے نماز ختم کر کے مجنوں کو ملامت کرنے لگا، ''دیکھتا نہیں، میں نماز پڑھ رہا ہوں اور تو میرے سامنے سے گزر گیا۔'' اس پر مجنوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا، ''میں تو اپنے مجازی محبوب (لیلا) کے خیال میں اس درجے محو تھا کہ مجھے اپنے اردگرد کا احساس باقی نہ رہا۔ تعجب ہے کہ تجھے محبوب حقیقی کے حضور میں کھڑے ہونے کے باوجود میرے گزرنے کا احساس کیونکر ہوا۔'' یہ لطیفہ سن کر تمام طلبہ کے چہروں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ دوڑ گئی، جیسے وہ مذکورۂ بالا شکایت لے کر آنے پر شرمندہ بھی ہوئے اور ایک بڑے پتے کی بات سیکھ کر واپس جانے پر شادماں بھی۔

ن۔م۔راشد

ایک دفعہ آل انڈیا ریڈیو میں ذاکر حسین صاحب تشریف لائے۔ ن۔م۔ راشد نے اپنے ایک عزیز دوست تابش دہلوی کا ان سے تعارف کراتے ہوئے کہا: ''ڈاکٹر صاحب! یہ تابش دہلوی ہیں ہمارے بہت اچھے اناؤنسر ہیں۔ فانی بادایونی کے رنگ میں شعر کہتے ہیں (تابش کو اس بات پر بڑا ناز تھا) ڈاکٹر صاحب نے کہا: ''بھئی کیا حرج ہے اگر یہ اپنے رنگ میں ہی شعر کہیں؟''

نواب محسن الملک

محفل میں کسی شخص نے سر عبدالقادر کے سامنے عطاء اللہ بخاری کی جادو بیانی کی بہت تعریف کی۔ سر عبدالقادر بولے: ''ہاں بھائی، عطاء اللہ شاہ بخاری خوب بولتے ہیں لیکن محسن الملک مرحوم بھی کسی سے کم نہ تھے۔'' پھر انہوں نے نواب محسن الملک مرحوم کی جادو بیانی کا ذکر کرتے ہوئے دو واقعات سنائے، کہنے لگے:

1900ء میں یوپی کے لیفٹیننٹ گورنر سر انتھونی میکڈانل نے اُردو کے خلاف مہم شروع کی تو نواب محسن الملک نے اس کا جواب دینے کے لیے لکھنؤ میں ایک بہت بڑا جلسہ کیا جس میں مَیں بھی شریک ہوا۔ محسن الملک نے اس جلسے میں جس جوش وخروش سے تقریر کی، اس کی نظیر میں نے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ یوں سمجھئے کہ الفاظ کا ایک لاوا تھا جو اُبل اُبل کر پہاڑ سے نکل رہا تھا۔ آخر میں نواب محسن الملک نے یہ کہتے ہوئے کہ اگر حکومت اُردو کو مٹانے پر ہی تُل گئی ہے تو بہت اچھا، ہم اُردو کی نعش کو گومتی دریا میں بہا کر خود بھی ساتھ ہی مٹ جائیں گے اور والہانہ انداز میں یہ شعر پڑھا:

چل ساتھ کہ حسرت دل محروم سے نکلے
عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

ہنری کسنجر

امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر نے امریکا اور یورپی ممالک کے درمیان تعلقات میں مشکلات پر ایک کتاب لکھی جس کا نام تھا:

"The Troubled Partnership"

''ساتھ نبھانے کا بکھیڑا۔''

یہ کتاب امریکا کے تمام مقامات پر بہت کم بِکی۔ لیکن حیرانی اِس بات پر ہوئی کہ ایک شہر کے ایک بک اسٹور میں بہت زیادہ بِکی۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ اُس دکان کے سیلز مین نے اِس کتاب کو غلطی سے ''میرج گائڈ بکس'' کے شیلف میں رکھ دیا تھا۔

یوسف ظفر

ایک ریڈیو مشاعرے میں ایک گستاخ نے یوسف ظفر کی غزل پر اعتراض کیا کہ ''اشعار بے جان ہیں۔'' آپ نے چمک کر فرمایا: ''میں شاعر ہوں، ابن مریم نہیں کہ مُردہ اشعار میں رُوح پھونک سکوں۔''

واجدہ تبسم

مشہور نقاد پروفیسر آل احمد سُرور ایک بار پاکستان آئے ان سے کسی نے پوچھا:
''واجدہ تبسم کے افسانوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''
جواب ملا: ''کون واجدہ تبسم؟''
کسی نے واجدہ تبسم سے تصدیق چاہی کہ کیا واقعی ایسا کوئی واقعہ ہوا تھا؟
واجدہ تبسم نے بڑی معصومیت سے سوال کیا: ''یہ آل احمد سُرور کون ہیں؟''

والی آسی

اُردو اکیڈمی دہلی کا ایک مشاعرہ تھا۔ صدارت استاد شاعر والی آسی کر رہے تھے۔ مشاعرے میں محمود ہاشمی، زبیر رضوی، مخمور سعیدی، گلزار دہلوی، راحت اندوری، منور رانا، منظر بھوپالی، چند شاعرات اور دیگر شعرا شرکت کر رہے تھے۔ نظامت مخمور سعیدی کر رہے تھے۔ انہوں نے مشاعرے کا آغاز کرتے ہوئے شعرا سے درخواست کی کہ وہ اپنے پانچ منتخب شعر سنائیں۔ سبھی شعرا نے اس کی پابندی کی اور صدارتی کلام کی باری آئی۔ حضرت والی آسی کو دعوت کلام دی گئی۔

آسی صاحب نے مائیک سنبھالا اور کہا: ''کیا ہم پر بھی پانچ اشعار کی پابندی ہے؟''

مخمور صاحب نے کہا: ''آپ نہ صرف جتنے شعر چاہیں سنائیں بلکہ جتنی غزلیں چاہیں سنائیں، صدر پر کوئی پابندی نہیں۔''

والی آسی صاحب نے کہا: ''بہتر ہے میں اپنی پہلی غزل پیش کر رہا ہوں۔''
محمود ہاشمی صاحب نے ہاتھ جوڑ کر کہا:
''والی بھائی! جھوٹ تو نہ کہیے ہم جب سے آپ کی تیرہ غزلیں تو سن چکے ہیں۔''
اس پر ایک قہقہہ پڑا۔

ونسٹنٹ چرچل

دوران جنگ برطانیہ کے وزیر اعظم چرچل امریکہ کے صدر روز ویلٹ سے ملنے کے لئے امریکہ گئے۔ ایک صبح چرچل نہا دھو کر اپنا جسم تولیہ سے خشک کر رہے تھے۔ کہ روز ویلٹ ان کے کمرے میں پہنچ گئے اور یہ دیکھ کر چرچل کے بدن پر کپڑے نہیں ہیں۔ وہ واپس جانے لگے۔ چرچل نے انہیں دیکھ کر کہا۔ روز ویلٹ صاحب واپسی جانے کی ضرورت نہیں برطانیہ امریکہ سے کچھ بھی ڈھکا چھپا نہیں رکھنا چاہتا۔

چرچل جب ممبر پارلیمنٹ تھے تو ایک اور ممبر سے ان کی بہت بنتی تھی۔ ایک دن وہ سڑک سے گزر رہے تھے۔ بارش کی وجہ سے پانی فٹ پاتھ پر چڑھ آیا تھا اور صرف چھوٹی سی پگڈنڈی نما جگہ سے صرف ایک آدمی گزر سکتا تھا۔ اتفاق سے سامنے سے ان کا حریف ممبر پارلیمنٹ آ گیا۔ دونوں انتظار میں رُک گئے کہ دوسرا پہلے گزر جائے تاکہ خواہ مخواہ ٹکراؤ نہ ہو۔

تقریباً دو منٹ اسی توقف اور ہچکچاہٹ کے بعد دوسرا ممبر پارلیمنٹ پگڈنڈی سے گزرنے لگا اور بولا: ”میں گدھوں کو راستہ نہیں دیتا۔“

چرچل فوراً ایک سائیڈ پر ہوتے ہوئے بولے:

”اور میں ہمیشہ گدھوں کو راستہ دے دیتا ہوں۔“

متفرقات

ثقیل اُردو

پرانے زمانے کے ایک استاد صاحب بڑی ثقیل قسم کی اُردو بولا کرتے تھے اور ان کی اپنے شاگردوں کو بھی نصیحت تھی کہ جب بھی بات کرنی ہو تو تشبیہات، استعارات، محاورات اور ضرب المثال سے آراستہ پیراستہ اردو زبان استعمال کیا کرو۔

ایک بار دورانِ تدریس یہ استاد صاحب حقہ پی رہے تھے۔ انہوں نے جو زور سے حقہ گڑگڑایا تو اچانک چلم سے ایک چنگاری اڑی اور استاد جی کی پگڑی پر جا پڑی۔

ایک شاگرد اجازت لے کر اٹھ کھڑا ہوا اور بڑے ادب سے گویا ہوا:

''حضورِ والا! یہ بندہ ناچیز حقیر فقیر، پر تقصیر ایک روح فرسا حقیقت حضور کے گوش گزار کرنے کی جسارت کر رہا ہے۔ وہ یہ کہ آپ لگ بھگ نصف گھنٹہ سے حق حقہ نوشی ادا فرما رہے ہیں۔ چند ثانیے قبل ایک شرارتی آتشی پتنگا آپ کی چلم سے بلند ہو کر چند لمحے ہوا میں ساکت رہا اور پھر آپ کی دستارِ فضیلت پر براجمان ہو گیا۔ اگر اس فتنہ کی بر وقت اور فی الفور سرکوبی نہ کی گئی تو حضورِ والا کی جان کو شدید خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔''

سخن شناسی

دلی میں شعروسخن کے چراغ روشن تھے اور نہ صرف اُستادانِ فن اِس ہُنر میں یکتا تھے بلکہ کنیزیں اور خدمتگار بھی روز مرہ کی گفتگو میں حُسنِ محاورہ ملحوظ رکھتے تھے۔ اُس زمانے میں ایک امیر سفر کر کے گھر واپس آئے اور پلنگ پر بیٹھ کے یہ شعر دہرانے لگے:

ہم نے کیا کیا نہ تیرے عشق میں محبوب کیا
صبرِ ایوب کیا، گریۂ یعقوب کیا

ایک بڑھیا ماما نئی ملازم ہوئی تھی اُس نے یہ شعر سن لیا۔ فوراً بوریا بستر باندھ لیا اور کہنے لگی:

''اس گھر میں تو آپ پر پیغمبری وقت پڑ رہا ہے، بے چارے نوکروں پر کیا گزرے گی چلو بابا یہاں سے نکل چلو۔''

پریشانی

نوجوان شاعر پاک ٹی ہاؤس میں خاموش بیٹھا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' ایک سینئر کالم نگار نے پوچھا۔

''بات یہ ہے کہ----'' اس نے کہا ''ادب پر بُرا وقت آ گیا ہے، بڑے بڑے لوگ اُٹھ گئے، جوش، فراق، احسان دانش، حفیظ جالندھری، استاد دامن اور آج کل میری بھی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں رہتی۔''

اقبال اور ٹنڈو آدم

یہ واقعہ تو یہ آپ نے سنا ہی ہوگا کہ جب ''اقبال اور بھوپال'' اور ''اقبال اور حیدر آباد'' جیسی کتابوں کی شہرت ہوئی تو ایک صاحب نے ''اقبال اور ٹنڈو آدم'' کے موضوع پر کتاب لکھنے کا منصوبہ بنایا۔ جب ان صاحب سے کہا گیا کہ علامہ اقبال تو کبھی ٹنڈو آدم گئے ہی نہیں تھے تو پھر آپ اس موضوع پر کتاب کیسے لکھ سکتے ہیں؟

انہوں نے جواب دیا، ''میں اپنی مجوزہ کتاب میں یہی تو ثابت کروں گا کہ علامہ اقبال کبھی ٹنڈو آدم گئے ہی نہیں تھے۔''

مقرر مقررہ

ایک کل پاکستان مشاعرے میں ایک فوجی جرنیل صدر بنا دیئے گئے۔ ان کے رعب اور طنطنے کا کچھ ایسا عالم تھا کہ دس پندرہ منٹ تک سامعین کو کھل کر داد دینے کی ہمت نہ

پڑی۔ اتفاق سے ایک شاعر نے بہت ہی اچھا شعر سنایا۔

سامعین کے درمیان میں سے ایک نوجوان تڑپ کر اٹھا اور بولا: "مکرر---ارشاد فرمایئے۔"

اس کی دیکھا دیکھی کچھ اور لوگوں نے بھی مکرر مکرر کے نعرے بلند کیے۔ صاحب صدر نے اسٹیج سیکرٹری سے پوچھا کہ یہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟

اسٹیج سیکرٹری نے ادب سے کہا۔ جناب!! یہ شاعر سے کہہ رہے ہیں کہ دوبارہ یہی شعر سناؤ۔

اس پر جرنیل صاحب نے اپنے سامنے رکھا مائیک اٹھایا اور یوں گویا ہوئے۔ کوئی مکرر وکرر نہیں ہوگا۔ شاعر صاحب آپ کے والد کے نوکر نہیں ہیں، جس نے سننا ہے تو پہلی بار دھیان سے سنو۔

مشاعرہ

جدہ میں ایک بار پاک ہند مزاحیہ مشاعرہ ہوا۔ دلاور فگار، ضمیر جعفری، انور مسعود، حمایت اللہ، مصطفیٰ علی بیگ، خوامخواہ وغیرہ آئے ہوئے تھے۔ مشاعرہ کے دوسرے روز کسی نے ایک خصوصی نشست رکھی، جس میں مقامی شعرا نے بھی کلام سنایا۔ ایک مقامی بزرگ شاعر کافی دیر سے کاغذی گلاس سے چسکیاں لے کر پانی پی رہے تھے۔ ان کا نام پکارا گیا تو گلاس ہاتھ میں لئے ہوئے ہی مائک پر پہنچ گئے۔

کسی نے پوچھا: "یہ ہاتھ میں کیا لئے بیٹھے ہیں؟"

شاعر نے کچھ جھلائے ہوئے انداز میں کہا:

"پانی ہے بھائی!"

برجستہ جواب آیا: "چلو بھر؟"

شاعر کی بزرگی کے پیش نظر مشاعرہ گاہ میں قہقہہ لوگوں کے حلق میں اٹک گیا اور مہمان شعرا زیر لب مسکرا کر رہ گئے۔

داد

مشاعرہ ہو رہا تھا۔ شاعر نے پہلا مصرع اُٹھایا:

خوگر ہوں میں دلبر ہوں!

سامعین میں سے ایک صاحب ''میں ہوں، میں ہوں'' کا شور کر کے شعر کا مزہ کرکرا کر رہے تھے۔ ایک شاعر اُن سے چڑ گیا۔ اس نے اپنا کلام یوں شروع کیا:

غم نہ کر تُو، بڑے رنج کا خوگر۔۔۔۔ میں ہوں، میں ہوں

وہ صاحب حسب عادت ''میں ہوں، میں ہوں'' کہہ کر داد دینے لگے۔ شاعر نے ان کے شور سے زچ ہو کر یہ مصرع پڑھا۔

لگا جس کے ہاتھ ناریل، وہ بندر۔۔۔۔

اور حسبِ عادت وہی صاحب ''میں ہوں، میں ہوں'' کہہ کر زور سے داد دینے لگے۔

زور آزمائی

ایک دفعہ ایک مشہور شاعر کسی ہوٹل میں کھانا کھانے کے لیے جا رہے تھے۔ راستے میں ایک دوست مل گئے۔ انہیں بھی ساتھ لیا۔ ہوٹل پہنچ کر شاعر صاحب نے پوچھا: ''کیا کھاؤ گے؟'' ان صاحب نے جواب دیا: ''میں تو کھانا کھا کر آیا ہوں۔ اگر آپ اتنا ہی اصرار کر رہے ہیں تو دودھ پی لیتا ہوں۔'' چناں چہ انہوں نے اپنے لیے مرغی اور دوست کے لیے دودھ منگوایا۔ جب شاعر صاحب مرغی کھا چکے تو اس کی ہڈیوں پر زور آزمائی کرنے لگے۔ جب ہڈیوں میں سے کڑاک کڑاک کی آوازیں آنے لگیں تو ان کے دوست نے ان سے طنزیہ پوچھا: ''آپ کے شہر کے کتے کیا کرتے ہیں؟''

شاعر نے اپنے کام کو بڑے اطمینان و سکون سے جاری رکھتے ہوئے کہا: ''بھئی وہ دراصل دودھ پیتے ہیں۔''

نظم

ایک شاعر نے ایک نظم لکھی جس کا عنوان تھا: ''میں کیوں زندہ ہوں''
شاعر نے یہ نظم ایک رسالے کو پوسٹ کر دی۔
چند ہفتوں بعد شاعر کو ایڈیٹر کا جواب ملا، جس میں لکھا تھا: ''کیوں کہ آپ نے یہ نظم ڈاک سے بھیجی ہے، خود لے کر آتے تو زندہ نہ رہتے۔''

گھر والی

مشاعرے میں ایک نوجوان شاعر نے شعر سنایا:

دل گیا جان گئی یار کے پیماں کے ساتھ
گھر سے گھر والے بھی رخصت ہوئے مہمان کے ساتھ

اس شعر پر حسب معمول حاضرین مشاعرہ نے بڑے زور زور سے داد دینی شروع کی لیکن اس سے پہلے کہ شاعر صاحب مزید پڑھتے، تھمے ہوئے شور کے ساتھ کسی نے بڑی بلند آواز میں کہا:

''واہ واہ حضرت!! کیا خوب فرمایا ہے''۔
''گھر سے گھر والی بھی رخصت ہوئی مہمان کے ساتھ''۔

ایک بار پھر زوروں کا شور اٹھا اور بے چارے شاعر کا جو حال ہوا ہوگا۔ اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

دم توڑتا ہوا شرابی

ایک مشہور شاعر مرنے کے قریب تھے۔ اپنی موت کا اندازہ کرتے ہوئے وہ بہت زیادہ مجلسی ہو گئے اور ہر روز کوئی نہ کوئی دعوت قبول کر لیتے۔ ایک بار ان کی ایک پرستار خاتون نے انہیں مدعو کیا۔ شاعر موصوف گھر میں داخل ہوتے ہی تھک سے چور صوفے پر گر

گئے۔ پرستار خاتون فوری طور پر ان کے پاس آئی اور بولی ''چائے چلے گی یا کافی؟''

''بالکل نہیں!'' شاعر نے حواس بحال کرتے ہوئے جواب دیا۔ پرستار خاتون کو اچانک خیال آیا۔ ''شراب چلے گی یا بیئر؟''

شاعر نے خشک سے لہجے میں کہا ''بیئر بھی رہنے دو۔''

پرستار خاتون کو خوشی ہوئی کہ چلو شراب پر تو مانے۔ اس نے شراب کے ساتھ کھانے کے حوالے سے شاعر صاحب سے پوچھا ''اور ساتھ کیا چلے گا؟'' ''ساتھ تم چلو گی۔'' شاعر صاحب نے پُرعزم لہجے میں جواب دیا۔

غور وفکر

نامور مصنفہ عمیرہ حامد کے شوہر حامد گرامی کے سر کے بال جھڑ چکے تھے، ایک دن ان کی بیٹی نے ان سے پوچھا:

''ابو کے سر کے بال کیوں نہیں ہیں۔''

پڑھی لکھی مصنفہ ماں نے بیٹی کو سمجھایا جو لوگ غور وفکر کے کام کرتے ہیں ان کے بال جھڑ جاتے ہیں۔ بیٹی نے ماں کے گھنے بالوں کو ایک نظر دیکھا اور کچھ سمجھتے ہوئے سر جھکا لیا۔

درحقیقت

ایک عمر رسیدہ شاعر جن کی شاعری واجبی سے کچھ درجے کم تھی ایک محفل میں ایک شاعر کو شکوہ کرتے ہوئے بتا رہے تھے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے ہر ممکن طریقے، گھر کے ہر فرد کے ساتھ محبت کی اس کے آرام کا خیال رکھا روپیہ پیسہ کمایا پھر بھی ایسے لگتا ہے کہ گھر والے مجھے پسند نہیں کرتے۔ ان کے قریب بیٹھے اس شاعر نے سنجیدگی سے کہا:

''یہ محض آپ کا خیال ہے کہ گھر والے آپ کو پسند نہیں کرتے جبکہ میرے خیال میں باہر والے بھی آپ کے بارے میں ایسے ہی خیالات رکھتے ہیں۔''

تازہ غزل

ایک شاعر کو کسی جرم میں پولیس نے گرفتار کر لیا۔ عدالت میں مقدمہ چلا تو جج نے پوچھا: ''آپ اپنی صفائی میں کچھ کہنا پسند کریں گے؟''

شاعر: ''جی بس اپنی تازہ غزل سنانا پسند کروں گا۔''

اولاد

لڑکپن کے دو ساتھی طویل عرصے کے بعد ملے تو ایک دوسرے کا احوال پوچھنے لگے۔ صحت اور کاروبار کی باتیں ختم ہوئی تو آخر میں ایک نے پوچھا۔ بھائی تمہارے کتنے لڑکے ہیں۔ دوسرے نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا: ''دو تھے۔''

''کیا مطلب دو تھے۔'' دوسرے نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''ایک شاعر ہو گیا ہے۔''

ذاتی شعر

اگر کوئی شاعر بہت گھٹیا شعر سن کر بھی شرمندہ اور پریشان نہ ہو تو اس کی ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے۔

''یہ شعر اس کا اپنا ہو گا۔''

بتیسی

مشاعرے میں ایک شاعر صاحب اپنا کلام سنا رہے تھے۔ شاعر صاحب کی دانتوں کی بتیسی نقلی لگی ہوئی تھی۔ شاعر صاحب نے کہا: ''ایک شعر سنئے صاحب'' یہ کہتے ہوئے شاعر صاحب کی بتیسی زمین پر گر گئی۔ شاعر صاحب نے بتیسی کو زمین سے اٹھا کر منہ میں فٹ کیا پھر دوبارہ کہا: ''ایک شعر سنئے صاحب!'' یہ کہتے ہوئے شاعر صاحب کی بتیسی دوبارہ گر

گئی۔ شاعر صاحب نے بتیسی کو اٹھا کر دوبارہ منہ میں فٹ کیا اور تیسری مرتبہ دوبارہ کہا: ''ایک شعر سنیئے صاحب!'' اور بتیسی دوبارہ زمین پر گر گئی۔ پریشان ہو کے مجمع میں سے ایک صاحب نے کھڑے ہو کر کہا: ''شاعر صاحب کچھ سناؤ گے بھی یا بار بار کیسٹ ہی بدلتے رہو گے۔''

رَن

ایک شاعر کو اپنا کلام پیش کرنے کے لئے اسٹیج پر بلایا گیا۔

شاعر نے اپنا کلام شروع کیا:

اندھیرا ہو رہا ہے کسی کرن کو جگا دو

یہ سنتے ہی سامعین میں موجود ایک دیہاتی کھڑا ہو کر غصہ سے بولا:

تم کون ہوتے ہو کسی ''کی رَن'' کو جگانے والے

واضح ہو کہ پنجابی زبان میں ''رَن'' بیوی کو کہتے ہیں۔

چلمن

ایک دفعہ ایک شاعر کو محفل میں تازہ کلام سنانے کے لیے کہا گیا، تو شاعر نے پہلا مصرع ارشاد کیا:

اس چلمن سے تم جھانکو اس چلمن سے میں جھانکوں

لوگوں نے واہ واہ کہا جب کافی دیر تک ایک ہی مصرے کی تکرار ہوتی رہی تو ایک نوجوان نے کھڑے ہو کر کہا:

اس چلمن کو آگ لگا دو، نہ تم جھانکو نہ میں جھانکوں

تعارف

ایک بس میں دو آدمی سفر کر رہے تھے۔ ایک نے کہا: ''میں شاعر ہوں۔''

دوسرے آدمی نے منہ دوسری طرف پھیرتے ہوئے کہا: ''میں بہرا ہوں۔''

غزل کا معیار

ایک نیا شاعر رسالے کے ایڈیٹر کے پاس غزل لے کر گیا۔
ایڈیٹر نے پوچھا۔ ''یہ غزل آپ کی ہے؟''
شاعر نے کہا: ''بے شک۔ کیا آپ اسے شائع کر رہے ہیں؟''
ایڈیٹر نے کہا: ''افسوس ہے کہ یہ رسالے کے معیار پر پوری نہیں اتری۔''
''یا اللہ! غالب کی غزلیں بھی غیر معیاری ہو سکتی ہیں۔''
شاعر صاحب زیرِلب بڑبڑائے۔

بدلہ

ایک بار ایک شاعر اپنے ایک مشاعرے کا حال سنا رہے تھے۔ جب میں نے غزل ختم کی تو سامعین میں سے کسی نے ایک نفیس سا جوتا کھینچ مارا۔ مجھے بڑا غصہ آیا۔
پھر آپ نے کیا کِیا؟ دوست نے پوچھا۔
کرنا کیا تھا میں نے فی الفور دوسری غزل سنا دی۔ شاعر نے تپاک سے جواب دیا۔

پابندی

ایک نئے شاعر نے ایڈیٹر سے شکوہ کیا:
آپ لوگوں نے شاعروں اور ادیبوں پر یہ پابندی کیوں لگا رکھی ہے کہ وہ کاغذ کے ایک طرف لکھیں؟؟
یہ تو ہم نے حالات سے سمجھوتا کیا ہوا ہے۔ ایڈیٹر نے گہری سانس لے کر کہا۔
حالات سے سمجھوتہ؟؟ کیا مطلب ہے؟؟ شاعر نے حیرت سے دریافت کیا۔
بعض لوگوں کے بارے میں ہمارا یہ پابندی لگانے کو جی چاہتا ہے کہ وہ کاغذ کے کسی طرف بھی نہ لکھیں۔

جماعت کا نظم و نسق

ہمارے ایک شاعر دوست جو زمانہ طالبعلمی میں ایک جماعت سے وابستہ تھے۔ ایک بار کسی خاتون کے ساتھ سینما ہال میں دیکھے گئے چنانچہ رپورٹ ہونے پر ان کی پیشی ہائی کمان کے سامنے ہوئی۔ ''ہمیں معلوم ہوا ہے کہ گزشتہ روز آپ ایک خاتون کے ساتھ فلم دیکھتے ہوئے پائے گئے۔'' ہمارے اس دوست نے اس کے جواب میں صفائی پیش کی اور کہا: ''جناب، ہماری ایک عزیزہ دوسرے شہر سے آئی ہوئی تھیں۔ وہ فلم دیکھنا چاہتی تھیں، چنانچہ گھر والوں کی ہدایت پر میں انہیں فلم دکھانے چلا گیا۔''

یہ سن کر کہا گیا: ''یہ تو ٹھیک ہے مگر جماعت کا نظم بھی کوئی چیز ہے۔''

اس پر ہمارے دوست نے کہا: ''نظم اپنی جگہ مگر غزل بھی آخر کوئی چیز ہے۔''

کیسا کیسا کلام

ایک شاعر نے ایک محفل میں اپنا کلام سنایا، سامعین میں سے کوئی دل گرفتہ رونے لگا۔ شاعر نے اس سے کہا، ''کیا آپ میری شاعری سے بددل ہو گئے ہیں؟''

اس شخص نے جواب دیا، ''آپ کی شاعری سے نہیں، میں زندگی سے بددل ہو گیا ہوں کہ کیسا کیسا کلام سننا پڑتا ہے۔''

آراء

ایک شاعر نے اپنے مجموعے پر پچاس نقادوں کی رائیں چھاپیں۔ ایک معتقد نے ان سے کہا، ''آپ نے اتنے بہت سے تنقیدی مضامین چھاپے، کچھ تنقید اگلے مجموعے کے لیے بچالی جاتیں تو اچھا تھا۔''

شاعر صاحب نے فرمایا، ''اگلے مجموعے میں میں صرف اپنی تنقید چھاپوں گا۔''

معتقد نے نہایت سادگی سے پوچھا، ''تو کیا اگلے مجموعے میں کلام دوسروں کا ہوگا؟''

پچھلی بار

کراچی میں ایک مشاعرہ ہو رہا تھا۔ شعرا باری باری آتے اور کلام سناتے۔ اناؤنسر نے ایک نوعمر شاعر کا نام پکارا۔

وہ ڈائس پر آئے اور کہنے لگے:

''ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ کیجیے۔''

مجمع سے آواز آئی: ''کس کی غزل کے؟''

نوعمر شاعر اس دادِ بے داد سے خاصے محظوظ ہوئے مگر تحمل سے بولے:

''میری ہی غزل کے!''

آواز آئی۔ ''یہ تو آپ پچھلی بار بھی کہہ رہے تھے۔''

بذلہ سنجی

کوہ نور میرج ہال جہلم میں ڈاکٹر طارق عزیز کے نام ایک شام منائی گئی۔ اس میں ایک مزاح نگار کو بھی خطاب کرنا تھا۔

مائیک پر آ کر اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی اور بولے:

''ہر طرف شاعر، ہر جانب ادیب، ہر جانب دانش اور سخن ور، بخدا میری کیفیت تو یہ ہے جیسے رضیہ غنڈوں میں پھنس گئی ہو۔''

ان کے اس فقرے سے محفل میں قہقہے پھوٹ پڑے۔

راتوں رات امیر

ایک صاحب کتابوں کی دکان پر پہنچے اور ''راتوں رات امیر بننے کے راز'' نامی کتاب طلب کی۔ سیلز مین خاموشی سے شیلف کے پیچھے گیا اور دو کتابیں لے آیا۔ جب وہ کتابیں پیک کر رہا تھا تو خریدار بولا:

”بھائی صاحب! میں نے آپ سے ایک کتاب مانگی تھی، آپ دو کتابیں کیوں لے آئے؟“

سیلز مین نے اطمینان سے جواب دیا:

”جناب دوسری کتاب ”تعزیراتِ پاکستان“ کی ہے اور ہم یہ دونوں کتابیں ایک ساتھ فروخت کرتے ہیں۔“

سرورق

کتاب کی جو چیز متاثر کرتی ہے، وہ سرورق پر ڈاکٹر نارنگ کی تصویر ہے کہ دیکھنے والا دیکھتا ہی رہا جاتا ہے۔ اُردو کے کسی ادیب کے چہرے پر ایسی مردانہ وجاہت اور ایسا عالمانہ وقار بہ یک وقت شاید ہی نظر آئے۔ شاید یہ تصویر دہلی کے اس مصور نے بنائی ہے جس سے ایک مرتبہ کسی نے پوچھا، ”آپ جب کسی مرد کا پورٹریٹ بناتے ہیں تو اس میں بے مثال مردانہ وجاہت پائی جاتی ہے، اس کا راز کیا ہے؟“

مصور نے جواب دیا، ”میں مردوں کے پورٹریٹ شیونگ برش سے بناتا ہوں۔“

آگ

ایک شاعر کو اپنی شاعری پر بہت ناز تھا۔ ایک دن وہ اپنی بیوی سے کہنے لگا:

”دیکھنا میں اپنی شاعری سے دُنیا بھر میں آگ لگا دوں گا۔“

بیوی نے جل کر کہا: ”گھر میں ماچس نہیں ہے، ذرا ایک شعر چولہے میں بھی ڈالنا۔“

کتابیات

= آب حیات، شمس العلماء محمد حسین آزاد دہلوی ۔ اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

= آب حیات کے لطیفے، شمس العلماء محمد حسین آزاد دہلوی
مرتبہ، آغا محمد اشرف ۔ شیخ مبارک علی تاجر کتب، لاہور ۱۹۳۹ء

= آب حیات کے لطیفے، شمس العلماء محمد حسین آزاد دہلوی
مرتبہ، حسین علوی ۔ کتابی دُنیا، لکھنو

= موازنہ انیس و دبیر، علامہ شبلی نعمانی ۔ بک کارنر جہلم

= لطائفِ غالب ۔ مسز ایم، اے، شاہ ۔ مطبوعہ مکتبۂ پنجاب، لاہور ۱۹۳۸ء

= مرزا غالب کی شوخیاں ۔ علامہ عبدالباری آسی، مکتبہ ادب لکھنؤ، اپریل ۱۹۲۵ء

= سرسید احمد خان، راجہ طارق محمود نعمانی ۔ بک کارنر جہلم

= حیاتِ جاوید، مولانا الطاف حسین حالی، بک ٹاک، لاہور

= حالی فہمی (سوانح شخصیت و فن)، ڈاکٹر سیّد تقی عابدی ۔ مطبوعہ: بک کارنر جہلم

= مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ اُن کی کچھ میری زبانی ۔ مرزا فرحت اللہ بیگ
ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ (یوپی) ۱۹۵۵ء

= لطائف اکبر ۔ غلام احمد فرقت کاکوروی، پہاڑی بھوجلہ، دلّی

= یادوں کی برات (قلمی نسخہ اور اس کے گمشدہ اوراق) ۔ مصنف: جوش ملیح آبادی
تحقیق و تدوین: ڈاکٹر ہلال نقوی ۔ مطبوعہ: بک کارنر جہلم، ستمبر ۲۰۱۳ء

= یادوں کی برات ۔مصنف: جوش ملیح آبادی، مکتبہ شعروادب، لاہور ۱۹۷۵ء
= زندہ رُود، جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال ۔اقبال اکادمی، لاہور
= روزگارِ فقیر، فقیر سیّد وحید الدین ۔لائن آرٹ پریس، کراچی ۱۹۶۴ء
= ذِکر اقبال ۔عبدالمجید سالک، بک کارنر جہلم، ۲۰۱۶ء
= میں ساحر ہوں (ساحر لدھیانوی کی خودنوشت سوانح حیات)
چندر ورما/ ڈاکٹر سلمان عابد ۔مطبوعہ: بک کارنر جہلم
= اُڑتے خاکے ۔سیّد ضمیر جعفری، بک کارنر جہلم
= علی سردار جعفری، شخصیت اور فن ۔ترتیب و تدوین: عقیل عباس جعفری
ورثہ پبلی کیشنز، کراچی
= جیل کے دن جیل کی راتیں
ابراہیم جلیس ۔مطبوعہ: مکتبہ جدید، اُردو بازار، دہلی، فروری ۱۹۵۵ء
= مجاز کے لطیفے ۔احمد جمال پاشا، مطبوعہ مکتبہ شاہراہ، دہلی ۱۹۶۶ء
= فراق کے لطیفے ۔شمیم حنفی، مطبوعہ ''شاہکار'' الہ آباد فراق نمبر ۱۹۶۵ء
= فراق صاحب ۔مشتاق نقوی، لکھنؤ ۱۹۸۴ء
= ادیبوں کے لطیفے ۔کے ایل نارنگ ساقی ۔ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی
= سرگزشت، سیّد ذوالفقار علی بخاری ۔نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد
= لاہور کی یادیں ۔اے حمید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
= گمشدہ لوگ، آغا ناصر ۔سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
= افکار پریشان ۔جسٹس ایم آر کیانی، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور
= آبِ گم، مشتاق احمد یوسفی ۔مکتبہ دانیال، کراچی
= منیر نیازی کی باتیں ۔تنویر ظہور، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد
= اُردو کی آخری کتاب ۔ابن انشا، لاہور اکیڈمی، لاہور

= نوائے سروش۔غلام رسول مہر، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور
= یارانِ کہن، عبدالمجید سالک، الفیصل ناشران، لاہور
= روایاتِ علی گڑھ، ازمحمد ذاکر علی خاں
= چراغوں کا دھواں۔انتظار حسین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
= نشانِ جگر سوختہ۔ڈاکٹر سلیم اختر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
= کشور ناہید کی نوٹ بک۔کشور ناہید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
= معاصر ادب۔ڈاکٹر جمیل جالبی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء
= یہ لاہور ہے۔ابوالحسن نغمی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
= میرا داغستان۔رسول حمزہ توف، فکشن ہاؤس، لاہور
= رودِ کوثر۔شیخ محمد اکرام، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور
= عالم میں انتخاب دلی، ازمہیشور دیال۔اُردو اکادمی، دہلی
= نوادرات۔طاہر محمود کوریجہ۔الفیصل ناشران، لاہور
= گل ہائے خنداں، محمد ذکی الدہلوی، ایوان علم و ادب، کراچی، ۱۹۹۳ء
= جان پہچان، نظیر صدیقی، اردو اکیڈمی سند، کراچی، ۱۹۷۹ء
= آپ، محمد طفیل، ادارۂ فروغ اردو، لاہور، اگست ۱۹۷۰ء
= مخدومی، محمد طفیل، ادارۂ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۸۳ء
= یادوں کا جشن، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، جشن کنور مہندر سنگھ بیدی کمیٹی، دہلی، ۱۹۸۶ء
= خامہ بگوش کے قلم سے۔مرتبہ مظفر علی سیّد، پاکستان رائٹرز کواپریٹو سوسائٹی، لاہور
= دربارِ دُربار۔ صِدق جائسی، آتش فشاں، لاہور
= تپلی پیکنگ کی۔مستنصر حسین تارڑ
= روزنِ دیوار۔عطاء الحق قاسمی
= ہنسنا رونا منع ہے۔عطاء الحق قاسمی

= شوقِ آوارگی۔عطاء الحق قاسمی
= دِلّی دُور است۔عطاء الحق قاسمی
= ذکرِ آزاد۔مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی
= سو ہے وہ بھی آدمی۔مجتبیٰ حسین
= کیا قافلہ جاتا ہے۔نصر اللہ خان
= ترکی بہ ترکی۔ڈاکٹر عبدالخالق
= حیرتوں کی سرزمین۔محسن بھوپالی
= یادگارِ چشتی۔نور احمد چشتی
= مجھے یاد آیا، ضیاء الحق قاسمی
= میرے ہم سفر۔احمد ندیم قاسمی

رسائل و جرائد

= ادیبوں کے دلچسپ لطائف۔شیخ محمد اسماعیل پانی پتی
مشمولہ ''نقوش'' لاہور، جنوری فروری ۱۹۵۹ء
= ''نگار'' پاکستان، کراچی، اکتوبر ۱۹۵۲ء
= حفیظ کی یاد میں۔مشمولہ ''نقدِ سخن''، محسن بھوپالی، ایوان ادب، کراچی، مارچ ۱۹۹۰ء
= ماہنامہ ''نیا رخ'' کراچی، جون ۱۹۹۱ء
= شاعروں کی باتیں۔جریدہ عالم گیر، لاہور، جون ۱۹۴۲ء
= جاں نثار اختر نمبر۔سہ ماہی ''اُردو'' امراؤتی، مہاراشٹر (ہندوستان)
مدیر وسیم فرحت کارنجوی علیگ
= فراق گھر کے باہر۔رمیش چندر دویدی، مطبوعہ ''نیا دور'' لکھنؤ۔فراق نمبر
= فراق کی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی

اثر عاصی۔مطبوعہ رسالہ ''نیا دور'' لکھنؤ۔فراق نمبر حصہ اول ۱۹۸۳ء

= فراق، تاثرات اور یادیں

دوارکا داس شعلہ۔مطبوعہ رسالہ ''نیادور'' لکھنؤ فراق نمبر حصہ اوّل

= حفیظ کے لطیفے۔نریش کمار شاد

مشمولہ 'افکار' حفیظ نمبر، مرتبہ صہبا لکھنوی، مکتبہ افکار، کراچی

= ادبیات۔منیر نیازی نمبر

= جگر مرادآبادی۔مشمولہ ''یادرفتگاں'' (جلد دوم)، ماہر القادری، مرتبہ طلحہ ہاشمی

حسنات اکیڈمی لمیٹڈ، ملتان، بار اول، سنہ ندارد

= شاعروں کی باتیں، لطائف الادب۔جناب ماسٹر ممتاز حسین بسمل (منشی فاضل ادیب)

مشمولہ ''عالمگیر'' لاہور، سالانہ نمبر ۴۲

= روزنامہ ''جنگ'' کراچی، مڈ ویک میگزین، یکم تا ۷ فروری ۲۰۰۶ء

= کالم ناصر زیدی، کچھ"لطائف الادب"، ۱۱ جولائی ۲۰۱۲ء، روزنامہ پاکستان

= کالم ناصر زیدی، کچھ"لطائف الادب"، ۱۰ فروری ۲۰۱۳ء، روزنامہ پاکستان

= کالم ناصر زیدی، پھر کچھ"لطائف الادب"، ۲۱ جون ۲۰۱۵ء، روزنامہ پاکستان

= کالم ناصر زیدی، پھر کچھ"لطائف الادب"، ۱۸ جون ۲۰۱۵ء، روزنامہ پاکستان

= کالم ناصر زیدی، "اگر تم عدم ہو تو موجود کیا ہے!"، ۱۰ مارچ ۲۰۱۳ء، روزنامہ پاکستان

= سب رنگ ڈائجسٹ (متفرق شمارے)